قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2022 قیمت 15₹

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

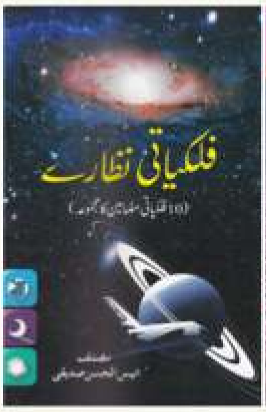

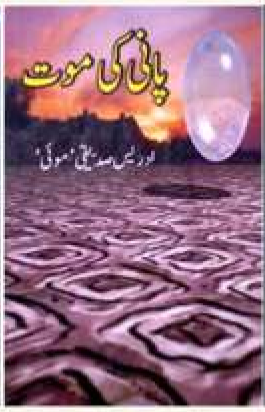

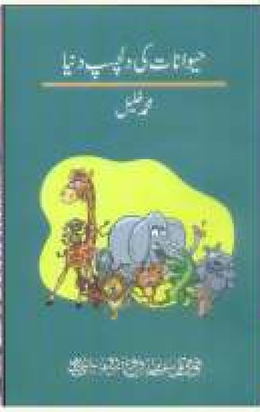

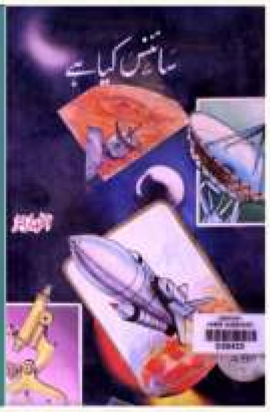

ادب اطفال: سائنس اور شاعری

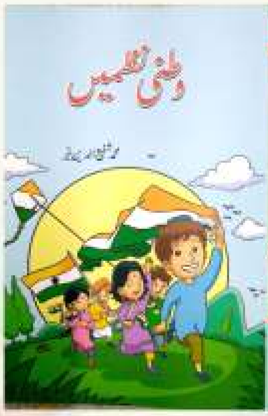

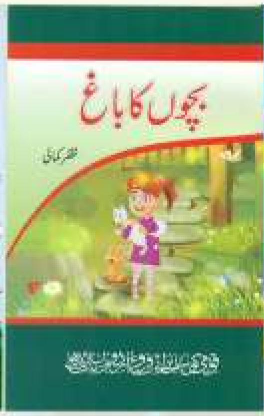

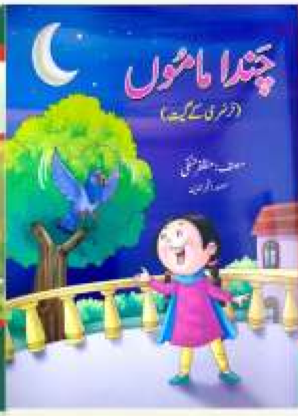

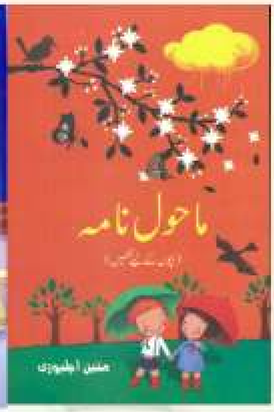

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

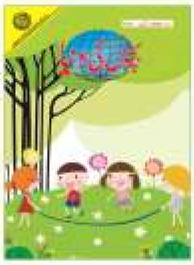

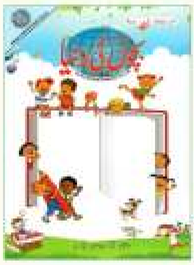

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اُردو دُنیا

ماہنامہ

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:24، شمارہ:06، جون 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھرگٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

زبان اور زمینی صورت حال

زبان کو زندہ رکھنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے — مشتاق احمد گنائی 7

ادب: زاویے اور جہات

1857 کے چند اردو مآخذ — عبدالحق 10

لطف الرحمٰن مشرقی اقدار سے آشنا تنقید نگار — ابرار اجراوی 12

خواتین افسانہ نگار انیسویں صدی کے نصف آخر سے — حنا افشاں 15

کلام آبرو کا لسانیاتی مطالعہ — سرفراز جاوید 17

سید سلیمان ندوی کے سفرناموں پر ایک نظر — طلحہ نعمت ندوی 19

ندا فاضلی کی آپ بیتی 'دیواروں کے بیچ' — سید وجاہت مظہر 23

زبان و تعلیم

اردو زبان کی صوتی وسعت — رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی 26

ہندوستانی آئین میں اردو زبان کا مقام — آفتاب عالم 29

ادب اطفال: سائنس اور شاعری

بہار میں شعری ادب اطفال — رئیس انور 32

ہندوستان میں بچوں کا سائنسی ادب — عبدالودود انصاری 36

بچوں کے ادب کی اہمیت — مہیمنہ خاتون 41

اردو میں ادب اطفال — بلال احمد گنائی 44

اردو میں بچوں کا سائنسی ادب — تجمل حسین راحت 46

خصوصی گفتگو

میں چاہتا ہوں کہ میری زبان زندہ رہے — خواجہ کوثر حیات 48

لعل و گہر

مولانا محمد یعقوب نانوتوی گمنام اوراق کا شعری سرمایہ — ندیم احمد انصاری 50

یوسف ناظم جہان طنز و مزاح کا لاثانی ناظم — قیصر الحق 53

افسانہ نگار ناقد: اختر اورینوی — محمد حسنین رضا 55

تہذیبی لسانی رشتے

مراٹھی زبان پر اردو کے اثرات — ہاجرہ بانو 58

خراج عقیدت

سالک دھامپوری پر تعزیتی نوٹ — عبدالرشید اعظمی 60

نجوم و جواہر

طارق جمیلی: کثیر الجہات فنکار — محمد مرغوب عالم 63

ضیا احمد بدایونی ایک ہمہ جہت شخصیت — محمد فرحان خان 65

نیا آسماں نئے ستارے

انگریزی شاعری کے منظوم اردو تراجم — محمد ریاض 68

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 74

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ہماری بات

ادبی رسائل کی حیثیت ایک روزن کی سی ہوتی ہے۔ نئی معلومات، اکتشافات، ایجادات، تحقیقات، علوم و ادبیات وغیرہ کے سارے سلسلے اسی کھڑکی سے قاری کے ذہن کا حصہ بنتے ہیں اور ان کے شعور و آگہی کو متحرک اور مہمیز کرتے ہیں۔ یہ رسائل دراصل ایک سمت نما کی حیثیت رکھتے ہیں جو قاری کو مختلف ادبی جزیروں اور زاویوں سے روبرو کراتے ہیں، اس لیے ہر دور میں ادبی رسائل کی اہمیت اور معنویت مسلم رہی ہے اور اس کے افادی کردار کے حوالے سے گفتگو بھی ہوتی رہی ہے۔ یہ رسائل نہ ہوتے تو ہماری ذہنی اور فکری کائنات بہت محدود ہوجاتی اور ہمیں تازہ موضوعات و معلومات کے لیے بہت تگ و دو کرنی پڑتی، لیکن رسائل کی وجہ سے ایسے وسائل میسر آگئے ہیں کہ ایک ہی جگہ ہمیں متنوع موضوعات پر اہم معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔ رسائل نے صرف ذہنوں کے زاویے نہیں بدلے ہیں بلکہ اظہار کے نئے اسالیب سے بھی آشنا کیا ہے۔ عالمی، ادبی، ثقافتی تحریکات اور رجحانات سے بھی روشناس کرانے میں رسائل کا اہم کردار رہا ہے۔ نئے علمی نظریاتی، فکریاتی مباحث سے روبرو بھی یہی رسائل کراتے رہے ہیں اور اس سے ہمارا ذہنی افق وسیع سے وسیع تر ہوا ہے۔ اگر یہ رسائل صرف ایک ہی ادب پر مرکوز ہوتے تو شاید ہمارے لیے عالمی ادبیات کے دروازے بند ہی رہتے۔ ان ادبی رسائل کی خاص بات یہ رہی کہ مختلف زبانوں اور ادبیات کے حوالے سے ان میں مباحث اور مکالمے شامل کیے جاتے ہیں، جن سے ہمیں فرانسیسی، روسی، انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور دیگر زبانوں کے ادب سے آگہی ہوئی اور انہی رسائل کے توسط سے ہمیں بہت سی علاقائی زبانوں کے شاہکاروں اور فن پاروں کا بھی پتہ چلا۔ اس کے علاوہ بہت سے گمنام فنکاروں تک رسائی ہمیں انہی رسائل کے ذریعے ہوتی ہے، اس لیے ادبی رسائل کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہوجاتی ہے۔ قدیم ادبی رسائل معلومات کا بیش بہا خزینہ ہیں۔ ان رسائل کے اشاریوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مدیران کتنے باخبر اور باشعور تھے کہ ان مباحث اور موضوعات کو اپنا محور و مرکز بناتے تھے جن سے ادبی معاشرے کو رہنمائی اور روشنی ملے۔

آج کے زمانے میں گو کہ ہمارے موضوعات بدل چکے ہیں، ہماری ترجیحات بھی تبدیل ہوچکی ہیں، اب نئے نئے موضوعات ہمارے فکر و شعور کا حصہ بن رہے ہیں پھر بھی ان موضوعات اور مباحث کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ پرانے زمانے میں وسائل کم تھے لیکن وژن کی وجہ سے ان کا موضوعاتی اور فکری دائرہ بہت وسیع ہوتا تھا اور اس زمانے میں قاری بھی ایسے ہوتے تھے جو قلمکاروں کے مضامین پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرکے مضامین کے حسن و قبح کو واضح کردیتے تھے۔ بعض قارئین کی معلومات کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا تھا کہ ان کے خطوط سے لکھنے والوں کو بھی رہنمائی ملتی تھی اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا مگر اب صورت حال بدلتی جارہی ہے۔ اب ایسے قاری کا بحران ہے جن کا مطالعاتی دائرہ بہت وسیع ہو اور وہ تمام ادبی مباحث پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔ اسی وجہ سے قلمکار حضرات خطوط کے صفحے پر سب سے پہلے نظر ڈالتے تھے اور مکتوبات کا گوشہ کسی بھی رسالے کا اہم ترین حصہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ رسائل کو معنی خیز اور فکر انگیز بنانے میں جہاں قلمکاروں کا کردار بہت اہم ہوا کرتا تھا وہیں اس میں قارئین کی بھی مکمل شرکت ہوا کرتی تھی اور مدیر بھی قارئین کے خطوط بہت اہتمام کے ساتھ شائع کرتے تھے کیونکہ ان کے مکتوبات سے رسائل کو نئی جہت ملتی تھی اور نئے نئے زاویے سامنے آتے تھے۔ خطوط کی شکل میں بحثیں چلتی تھیں، معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں، بہت سے رسائل تو انہی خطوط کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بہت مقبول تھے اور قارئین ایسے رسائل کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ اب نہ وہ معرکہ آرائیاں ہیں نہ وہ قارئین ہیں، اس لیے ادبی رسائل سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مضامین کے ساتھ ساتھ مکتوبات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ کچھ قلمکاروں نے رسائل میں چھپے ہوئے اپنے خطوط کو بھی کتابی صورت میں بھی شائع کیا ہے جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس نوع کے موضوعات و مباحث ان خطوط کا حصہ بنتے تھے۔ یقینی طور پر وہ خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے جن میں مضامین کے حوالے سے مکالمے کیے جاتے تھے اور ان سے ادب کو بہت فائدہ ہوتا تھا۔ اب بیشتر رسائل میں خطوط کے کالم میں صرف ستائشی نوعیت کی سطریں ہوتی ہیں جن سے مضمون کی وقعت اور اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے اب ہمیں اپنا انداز بدلنا چاہیے اور رسائل کے مشمولات پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے کیونکہ رایوں سے رسائل کو وقیع، معنی خیز اور خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔

شیخ عقیل احمد

خطوط

ماهنامه 'اردو دنیا' میں ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' اپریل 2022 کا شمارہ ملا۔ ہماری بات کے تمام سطور بلبل ہند محترمہ لتاجی کے لیے مکمل نہیں لگیں۔ ان کی موت آواز کی دنیا کے ایک عہد کی موت ہے۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

میری آواز ہی میری پہچان ہے: ابرار رحمانی، لتا منگیشکر کا جانا ایک عہد کا خاتمہ ہے: صدر عالم گوہر، فضا میں گونجتی رہتی ہے لتاجی کی آواز: فرحان حنیف وارثی اور دیگر مضامین لتاجی کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اردو دنیا کا یہ خراج عقیدت واقعی قابل صد مبارکباد ہے۔

مصطفی جمیل: مومن پورہ، بالاپور، ضلع اکولہ، مہاراشٹر

'اردو دنیا' اپریل کے شمارے میں 'ہماری بات' کے تحت مدیر اعلی جناب ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے لتا منگیشکر کے گائے مشہور گیت 'اے میرے وطن کے لوگو!....' کو سن کر اسٹیج پر ہی پنڈت جواہر لال نہرو کی آنکھوں میں آنسو کے تاریخی واقعے کا بیان کیا ہے۔ اس شمارے میں لتاجی پر تمام مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور ان کے حسن انتخاب کا شرف مدیر اور ان کے معاون صاحبان کو جاتا ہے۔ بالخصوص جناب ابرار رحمانی اور صدر عالم گوہر کے مضامین بہت اہم ہیں۔

امام اعظم کا مضمون 'اردو کے فروغ میں....' اچھا ہے، صفحہ 43 پر لفظ 'لوازمات' (یہ بھی غلطی سے مروج ہو چکا ہے) کی بابت محمد مصطفی خاں مداح نے اپنے 'اردو ہندی شبد کوش' (ناشر: اتر پردیش ہندی سنستھان، لکھنؤ) میں یہ صحیح درج کیا ہے۔ "دیکھیے لفظ 'لوازم'، یہ لفظ غلط ہے، لیکن اردو میں بولتے ہیں، بلکہ اس کا جمع لفظ 'لوازمات' بھی بنا لیتے ہیں، جو کہ بالکل غلط ہے۔" (ص 593)

جناب غضنفر کا مضمون 'تعمیر وطن میں زبان اردو کا حصہ' اچھا ہے۔ 'سرفروشی کی تمنا...' مطلع والی غزل کے خالق کا نام بسمل عظیم آبادی درج کرنا چاہیے تھا۔ اگلے صفحے 40 پر

ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی کا شمارہ پڑھنے کا موقع ملا۔ پہلے کی طرح حالات حاضرہ سے ہم آہنگ اور مختلف مضامین کا مجموعہ لے کر ذہن کے دریچوں کو کھولنے میں معاون ثابت ہوا۔ غلام نبی کمار اور محمود شیخ کے مضامین پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجروح کے بنا بھارتی سنیما ادھورا ہے۔ پرانی اور نئی روایات کو مجروح نے خوبصورت انداز میں نبھایا۔ ان کا ایک نغمہ 'پاپا کہتے ہیں بڑا نام کرے گا، بیٹا ہمارا ایسا کام کرے گا' اور 'ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح، اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح' جو لتا منگیشکر نے اپنی خوبصورت

آواز میں گایا تھا، آج بھی سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ مجروح کو یاد کرتے کرتے اور بہت سارے فنکاروں کی یادوں نے دل میں کسک سی پیدا کی۔ محمود شیخ نے زندگی کو تغیر سے تعبیر کیا ہے۔ اگر دیکھا جائے، تو زندگی واقعی تبدیلی کا نام ہے۔ زندگی کو میں نے Change is the law of nature کے معنوں میں سمجھا ہے۔ میں اردو دنیا کی ٹیم کا مشکور ہوں، جو اتنے معیاری مضامین شائع کرتے ہیں۔

سید مصطفی احمد: حاجی باغ، ایچ ایم ٹی، سری نگر، کشمیر

تینوں اشعار کے شعرا کے نام بالترتیب محمد اقبال، میر تقی میر اور مرزا غالب درج کرنا تھا۔

اسی شمارے میں 'رسائل و جرائد' عنوان کے تحت ص 80 پر اکبرالہ آبادی کے مشہور شعر 'رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں...' کی بابت جناب خلیق الزماں نصرت نے 'شاعر' کے گزشتہ شمارے میں مضمون 'گمنام برمحل اشعار' کے تحت پہلی بار اس راز کا انکشاف کیا تھا کہ اس شعر کے اول مصرعے کا اصلی متن یہ تھا۔ ''حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں...''

شعیب نظام کے شعری مجموعے 'عکسِ گم گشتہ' کا تبصرہ ہے۔ اس میں محشر لکھنوی، فانی بدایونی و شاد عظیم آبادی جیسے شعرا کے اشعار سے شعیب نظام کے اشعار کا موازنہ قابل ستائش ہے۔ شمارے کے مواد اور مشمولات وقیع ہیں۔

ڈاکٹر کرشن بھاؤک : کوٹھی نمبر 201-A، گورونا نک نگر، گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ سرورق پر ملکہ ترنم لتا منگیشکر کی تصویر شائع ہوئی۔ لتا جی کی یاد میں 10 مضامین جن میں ابرار رحمانی، صدر عالم گوہر، فرحان حنیف، محمد قاسم انصاری، منتظر قائمی، پرارتھنا سنگھ، فیاض احمد وجیہ، محمد شارب، نازیہ شامل ہیں۔ 32 صفحات پر مشتمل اس گوشے میں لتا جی کی حیات و خدمات اور ان کے گائے ہوئے گیتوں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تعلق سے مدیر اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل نے ان کے فکر و فن پر اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''لتا منگیشکر نے اپنی آواز کے ذریعے دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ ان کی سلطنت کا کوئی محدود رقبہ یا علاقہ نہیں تھا بلکہ جہاں جہاں نغموں کے شیدائی تھے وہاں وہاں ان کی آواز کی بادشاہت قائم تھی اور یہ بادشاہت سبھی کو بہت عزیز تھی کہ یہ سیدھے دلوں پر اس کا اثر تھا۔ ان مدھر گیتوں کے درمیان عوام کی صبح و شام گزرتی تھی۔ بہرحال دنیا لتا جی کو ان کے گانوں کے ذریعے ہمیشہ یاد رکھے گی۔'' اس کے علاوہ کالم 'ربط و التفات' بظاہر خطوط کا صفحہ ہے لیکن اس میں مضامین کا کما حقہ تجزیہ ہوتا ہے۔ میگزین میں شامل حنا آفرین کا مضمون 'دوران تدریس بچوں کے نفسیاتی مسائل اور حل' کافی وقیع اور معلوماتی مضمون ہے۔ سرور مہدی کا مضمون 'گلزار نسیم میں ایہام گوئی کی شمیم رواں' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ادبی دنیا میں 'اردو دنیا' ایک معیاری رسالے کے طور پر مانا جاتا ہے۔ یہ اردو داں حضرات کے ہر گھر میں ہونا چاہیے۔ طلبہ اور اسکالر اس سے استفادہ کریں تو مسابقتی امتحانات میں سہولت ہوگی۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد،

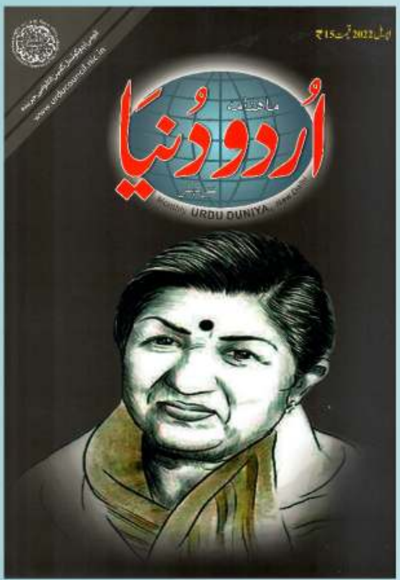

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی سینٹرل لائبریری میں مطالعے کے لیے گیا تھا۔ رسائل کے کمرے میں جاکر بیٹھا میرے چاروں طرف مختلف زبانوں کے رسائل دستیاب تھے، اس میں ایک ماہنامہ میرے نظر کے سامنے آیا وہ اردو دنیا تھا، اردو دنیا کا فروری شمارہ...... جب میں نے یہ دیکھا تو پڑھنے کا شوق آیا اور صفحات دھیرے دھیرے پلٹنے لگا، شمارے کے تمام مضامین پر میں نے ایک سرسری نظر ڈالی اور مجھے یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ یہ ہندوستان کے اہم اردو ماہنامے سے ایک ہے، اس کے علاوہ قارئین، طالب علم اور عوام کو اردو زبان و ادب سیکھنے سکھانے کا ایک اچھا نمونہ ہے، اس کے مضامین معیاری ہیں اور انداز نہایت دلچسپ ہے۔

شمارے کے تمام مضامین اچھے لگے، اس میں پروفیسر اسلم آزاد کی تحریر مخدوم کی شاعری میں تصور عشق کی حقیقت، ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ کا آزادی کے بعد نمائندہ خواتین ناول نگاروں کا تنقیدی جائزہ اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی تنقیدی بصیرت اور خسرو شناسی پر ڈاکٹر ریاض توحیدی کے خیالات قابل ذکر ہیں۔ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں اردو تحقیق کی سمت و رفتار موضوع پر سمیرا بانو کا مقالہ وقیع ہے۔

'اردو طنز و مزاح اور اودھ پنچ' کے بارے میں محمد فاروق صاحب کا مقالہ میرے لیے بہت فائدہ ہوا، ڈاکٹر احمد خان کا مضمون 'اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں صوفیائے دکن کا حصہ' عنوان سے انصاف کرتا ہے اور اردو غزل کے علامتی نظام پر ساجد ممتاز کے خیالات نہایت معیاری ہیں۔

راشد پی کے : پاناتھم، کنو ہاؤس، مداؤ رکو، مداور پوسٹ، کالی کاٹ، کیرالہ

■

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

زبان کو زندہ رکھنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے

مشتاق احمد گنائی

س1: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: میرے خیال میں زبان کسی بھی قوم یا تہذیب کی پہچان ہوتی ہے۔ اگر اس زبان کے باشندے اس امر سے بے خبر ہوں گے کہ زبان ہی ان کی شناخت اور پہچان کا ذریعہ ہے تو زبان کی موت آنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زبان کو جدید تعلیمی اور تکنیکی سہولیات سے ہم آہنگ نہ کرنا۔ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس کو جدید ٹیکنالوجی سے متعارف کرانا بہت ضروری ہے۔ آئے دن لکھنے پڑھنے میں برق رفتار تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جو زبان وقت کے تقاضوں کو پورا کرے گی وہ زبان کبھی نہیں مرے گی اور جو زبان پیچھے رہے گی وہ زوال کا شکار ہوسکتی ہے۔

س2: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: زبان کو زندہ رکھنے کے لیے زبان کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ زبان بولنے کے علاوہ تحریری صورت میں زندہ رکھی جاسکتی ہے۔ اگر ہمیں زبان کو زندہ رکھنا ہے تو ہمیں ملکی اور ریاستی سطح پر ایسے پروگراموں کا انعقاد عمل میں لانا ہے جس سے زبان کی اہمیت اور افادیت واضح ہوجائے۔ ہمیں اس زبان کی درس و تدریس کا بندوبست سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں کرنا چاہیے۔ جہاں اس زبان کے بولنے والے موجود ہوں۔ المیہ یہ ہے کہ جہاں بچے اردو مضمون پڑھنا چاہتے ہیں وہاں اس کی سہولت مہیا نہیں ہے۔ میں نے بہت سے ایسے بچوں کو کہتے سنا ہے کہ وہ اردو پڑھنا چاہتے ہیں مگر اسکول میں اس کی عدم دستیابی کی وجہ سے زبردستی ان کو دوسرا مضمون پڑھنا پڑتا ہے۔

س3: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: زبان میں کسی بھی تہذیب وثقافت کا ورثہ منعکس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں کشمیری تہذیب کے تاریخی پس منظر سے آگاہی کی خاطر اس زبان میں لکھی گئی تاریخی کتب یا دوسری زبانوں میں ترجمہ کی گئی کتابوں سے ہی معلومات مل سکتی ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے زبان اور تہذیب کا رشتہ کتنا مربوط و مضبوط ہے۔ بلکہ زبان اور تہذیب وثقافت لازم وملزوم ہیں۔ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے یہ خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس میں ہندوستانی تہذیب، یہاں کا کلچر، یہاں کی ثقافت، یہاں کے تہوار، یہاں کے رسم ورواج اور یہاں کے کھان پان کا تذکرہ جس آن بان اور شان سے ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لہٰذا ہندوستانی تہذیب وثقافت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے یہاں کی زبانوں سے آشنائی ازحد ضروری ہے جن میں اردو بھی شامل ہے۔

س4: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: جی ہاں! اگر کوئی زبان زوال کا شکار ہوتی ہے ظاہر ہے اس میں موجود ادب جو کہ انسانی تہذیب کا مظہر ہوتا ہے وہ بھی اس کا شکار ہوتا ہے۔

س5: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: جی بالکل! کسی بھی زبان میں شرح خواندگی جتنی زیادہ ہوگی وہ اتنی ترقی کرے گی۔ ٹھیک اسی طرح اس میں ہر قسم کے علوم کا وافر مواد دستیاب ہونا چاہیے خصوصاً سائنسی اور سماجی علوم کا۔ اب اگر کسی زبان میں سائنسی اور سماجی علوم کے مواد کی کمی ہوگی اس کا براہ راست اثر اس زبان کی شرح خواندگی پر پڑے گا۔ کیونکہ جب اس زبان میں مختلف علوم سے متعلق خاطر خواہ مواد دستیاب نہیں ہوگا تو جو طالب علم اس زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے بھی لیکن مواد کی عدم موجودگی کی وجہ سے نہیں کر پائیں گے، جس کا منفی اثر زبان کی ترقی پر پڑے گا۔

س6: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: اردو میں روزگار کی عدم موجودگی اس کی بقا اور ترقی کے راستے میں بہت بڑا خطرہ ہے۔ زبان کا روزگار کے ساتھ جڑا ہونا بہت ضروری ہے لیکن موجودہ حالات میں ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو میں روزگار کے بہت کم وسائل دستیاب ہیں۔ ظاہری بات ہے جس زبان میں روزگار کے زیادہ مواقع موجود ہوں گے آدمی اسی کی جانب متوجہ ہوگا۔ دوسرا اہم خطرہ جو اردو زبان کو موجودہ دور میں درپیش ہے وہ ہے ٹیکنالوجی کے ساتھ ہم آہنگی کی کمی۔ ملک میں گنتی کے ایک یا دو ایسے انجینئرنگ کالجز یا دوسرے ادارے ہوں گے جہاں اردو میڈیم میں جدید ٹیکنالوجی کی تعلیم کا انتظام رکھا گیا ہو۔

س7: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ

رہی ہے؟

ج: اردو کا چہرہ مسخ نہیں ہو رہا ہے ہاں اس میں تبدیلیاں ضرور رونما ہو رہی ہیں۔ اگر ہم گذشتہ دس برس کے ادب کا مقابلہ تیس برس قبل کے لکھے ادب سے کریں گے تو زبانی سطح پر بہت سی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اردو کی شکل بگڑ رہی ہے۔ اردو کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوئے ہیں جن میں متعدد ایسے ہیں جن کا مترادف تلاش کرنے کے بجائے ان کو جوں کا توں بروئے کار لایا جاتا ہے، لیکن سوشل میڈیا پر اردو زبان کا جو استعمال ہوتا ہے وہ واقعی قابل غور امر ہے۔ کیوں کہ متعدد ایسے اشعار و اقوال اور دوسری اردو تحریریں اول تو اردو کے بجائے رومن رسم الخط میں لکھی ہوئی ملتی ہیں، جس سے نہ صرف زبان کی ترقی متاثر ہوتی ہے بلکہ اس کا ادب بھی مجروح ہوتا ہے۔ دوم اگر اردو میں لکھی ہوئی ہوتی بھی ہیں لیکن املا کی غلطیاں بے شمار ہوتی ہیں۔

س8: اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: میں اردو کا طالب علم ہوں اور اردو کا ایک مدرس بھی اردو سے میری وابستگی اور محبت مجھے اس کے مستقبل کے حوالے سے ہمیشہ فکر مند کرتی ہے۔ بعض موقوں پر مجھے لگتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن و تاباں ہے۔ لیکن اکثر اوقات میں ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہوتا ہوں۔ ہمارے یہاں جموں وکشمیر میں یونی ورسٹی سطح تک اردو زبان و ادب کی تدریس کا انتظام ہے۔ لیکن حال ہی میں جموں یونیورسٹی کی طرف سے ایک حکم نامے میں بی اے کے لیے اختیاری زبانوں میں انگریزی اور ہندی کو ہی رکھا گیا ہے۔ اگر چہ ابھی اس پر عمل نہیں ہوا ہے۔ اس سے قبل اردو بھی اس فہرست میں شامل تھی۔ جب ایک نسل اردو زبان کی تعلیم میں دلچسپی رکھنے کے باوجود اس سے محروم رکھی جاتی ہے تو آنے والی نسل اس سے نامانوس ہو کر کیسے اس کی طرف راغب ہوگی۔

س9: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

ج: تبدیلی ایک قدرتی عمل ہے۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم 'عینک' کو 'عیَنق' لکھیں، 'قومی' کو 'کومی' لکھیں، 'اشک' کو 'عشق' لکھیں۔ یہ تو زبان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس طرح کے املا سے زبان کو بچانے کے لیے ماہرین زبان کو آگے آنا چاہیے اور پوسٹر بنانے والوں اور دوسرے سائن بورڈ بنانے والے افراد کو اردو کا کوئی لفظ اگر نہیں لکھنا آتا ہو تو ان سے کہیں کہ جب بھی کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو ہم سے رابطہ کیا کریں۔ بے جا اور غیر ضروری انگریزی الفاظ کا استعمال اردو بولتے وقت نہیں کرنا چاہیے۔ اسکولوں میں بنیادی جماعتوں کے طلبہ کے لیے ماہر اردو اساتذہ کو پڑھانے پر مامور کیا جانا چاہیے۔ ماہرین زبان کو قومی ٹیلی ویژن چینل پر مدعو کیا جانا چاہیے۔ بچوں کو اردو اخبارات اور کتابیں پڑھنے کی عادت ڈال دینی چاہیے۔ اسکولوں اور کالجوں میں املا، تلفظ اور قرأت کے حوالے سے ورکشاپوں اور سیمناروں کا انعقاد کیا جانا چاہیے۔

س10: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: جی بالکل درست کہا آپ نے اگر گزشتہ دس برس میں شائع شدہ کتب کی فہرست کو سامنے رکھا جائے تو اس میں گنتی کی چند کتابیں ہی ایسی ملیں گی جو زبان سے متعلق ہوں گی باقی سب ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ زبان کی بقا اور فروغ و ترقی کے حوالے سے مختلف تنظیمیں اور ادارے بھی برائے نام کام کر رہے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت سے زیادہ ایسے ورکشاپوں اور چھوٹے چھوٹے پروگراموں کا انعقاد کیا جانا چاہیے جن سے زبان کو زندہ رکھنے اور اس کے مستقبل کے حوالے سے اہم تدابیر پر بحث کی جائے۔ ماہرین زبان کے لکچرس کا انعقاد کیا جانا چاہیے۔ مشاعروں اور ادبی سیمناروں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ان سے براہ راست زبان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

س 11: کیا کلاسکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: بالکل نہیں! کیوں کہ یہ سب بعد کی چیزیں ہیں ان پر بحث کرنے سے قبل زبان کی باریکیوں اور ادب کی بنیادی باتوں سے شناسائی ضروری ہے۔ لیکن ان سب باتوں کو موضوع بحث بنا کر اگر ہم زبان کی ترقی کے خواب دیکھیں گے تو ہم اپنی زبان کا اور اس کے مستقبل کا نقصان کر رہے ہیں۔

س12: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: چونکہ میرا تعلق کشمیر سے ہے اس حوالے سے شاید آپ کے علم میں بھی ہوگا کہ الحمد للہ یہاں کوئی ایسا نجی یا سرکاری اسکول نہیں ہے جہاں دسویں جماعت تک اردو کو لازمی مضمون کے بطور نہیں پڑھایا جاتا ہو۔ البتہ اردو میڈیم اسکول میرے علاقے پلوامہ میں کوئی نہیں ہے۔ جہاں تک اردو اساتذہ کا تعلق ہے اس حوالے سے تشویش ہے کہ یہاں ہر کوئی اردو پڑھاتا ہے ماہرین زبان یا اردو میں سند یافتہ امیدواروں کی الگ سے تقرری کا بندوبست نہیں ہے جس سے اردو زبان کا نقصان ہو رہا ہے۔

س13: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں پانچ لائبریریاں ہیں جن میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب سے متعلق بھی خاطر خواہ کتابیں دستیاب ہیں۔ علاوہ ازیں مقامی اخبارات اور رسائل و جرائد انگریزی کے علاوہ اردو زبان میں بھی اچھی تعداد میں دستیاب ہوتے ہیں۔ جہاں تک اردو کے اہم اخبارات اور رسائل کا تعلق ہے اس سلسلے میں کشمیر عظمیٰ، سرینگر ٹائمز، آفتاب، سرینگر جنگ، وادی کی آواز، انقلاب، چٹان، تعمیل ارشاد، ندائے کشمیر، ہند سماچار وغیرہ اور رسائل میں اردو دنیا، خواتین دنیا، بچوں کی دنیا، آجکل، شیرازہ، شاخ زعفران، لفظ لفظ، نگینہ، ایوان اردو وغیرہ آتے ہیں۔

س14: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں چھوٹی بڑی تین انجمنیں یا ادارے ایسے ہیں جو اردو ادب کے حوالے سے کام کر رہے ہیں۔ یہ سبھی ادارے تقریباً ایک ہی نہج پر اردو کے فروغ کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی مشاعروں اور افسانوی محفلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے، کبھی کسی ادیب یا شاعر کی تصنیف کی رسم رونمائی کی تقریب کا انعقاد کرتے ہیں۔ یہاں زبان سے زیادہ ادب کی اشاعت اور فروغ پر کام ہو رہا ہے۔ یہ ادارے زبان کی ترقی و بقا اور اس کے مستقبل کے حوالے سے کوئی حوصلہ افزا یا قابل ستائش کام نہیں کر رہے ہیں۔

س15: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: میرے علاقے میں اردو سے جڑی متعدد ایسی ادبی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی سطح پر تو ہوا ہے۔ چونکہ یہاں چند انجمنیں ہیں جو علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے ادبا و شعرا کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ البتہ قومی سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف دو ایک کو چھوڑ کر نہیں کے برابر ہے۔

س16: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

ج: میں اردو کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اس کے علاوہ گذشتہ چند برسوں سے کشمیر کے مختلف کالجوں میں اردو پڑھاتا ہوں۔ اس دوران میری کوشش یہی رہتی ہے کہ اردو مضمون کا انتخاب زیادہ سے زیادہ طلبہ کریں۔ اس کے

علاوہ دوران تدریس شاگردوں میں چھپی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہوں۔ الحمدللہ بہت سے شاگردوں میں تخلیق ادب کا ذوق پیدا ہوا ہے جن میں چند کے افسانے اور دوسری نگارشات مقامی اخبارات میں شائع بھی ہوئی ہیں۔ انفرادی طور پر مقامی اسکول میں کبھی کبھی نویں اور دسویں کے طلبہ کو اردو زبان وادب کی تاریخ اور ارتقائی سفر سے متعلق آسان زبان میں روشناس کرانے کی سعی کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اردو انجمن کے ذمے داروں میں سے بھی ہوں، جس کے تحت ہم اردو زبان وادب کے حوالے سے وقتاً فوقتاً مشاعروں، محفل افسانہ اور دوسری ادبی نشستوں کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ جن میں مقامی اردو قلم کاروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ان ادبی محفلوں میں بزرگوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی بھی اکثریت رہتی ہے۔

س17: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: اردو ایک ہر دلعزیز زبان ہے۔ اس کی ترقی اور بقا کے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ قومی سطح پر اس کے تحفظ اور ترویج کے لیے کوئی جامع پالیسی بنائی جائے۔ اردو میں روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ قومی سطح پر اردو کے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو اردو زبان میں ماس میڈیا اور دیگر جدید تعلیم کا انتظام کریں اور اس کی شاخیں ہر اس مقام پر رکھی جائیں جہاں اردو بولنے والی آبادی موجود ہوں۔ ملکی سطح کے پرائیویٹ اسکولوں میں ہندی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ اردو کی تدریس کے لیے بھی اقدامات کرنے چاہئیں۔

س18: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

ج: اردو ایک شیریں زبان ہے یہ جتنی شیریں ہے اس سے کہیں زیادہ حسین وجمیل بھی اور اس کا حسن و جمال اس کے دلنشین رسم الخط میں مضمر ہے۔ میرا دل اس وقت رنجیدہ ہوتا ہے جب کسی کی زبانی یہ سنتا ہوں کہ اردو کا رسم الخط بدلنا چاہیے۔ جہاں تک اردو کے رسم الخط کی بقا کی بات ہے اس حوالے سے اردو کے اساتذہ کو اسکولوں میں کیلی گرافی اور خوشخطی کے ماہرین کو مدعو کر کے ابتدائی سطح کے طلبا کو ان کی نگرانی میں تربیتی پروگراموں کا انعقاد کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہر اسکول اور کالج میں اردو رسم الخط کی شاندار روایت کے متعلق وقفے وقفے سے ورکشاپ، توسیعی خطبے، سمینار، تربیتی کورسز کا انعقاد کیا جانا چاہیے۔ کمپیوٹر میں اردو سافٹ ویئر کا استعمال اردو کے ہر طالب علم کے لیے لازمی کر دینا چاہیے۔ اردو سے منسلک اداروں میں ہونے والی ہر کارروائی اردو میں ہی ہونی چاہیے۔ اسی طرح اردو زبان کے طلبہ، اساتذہ اور دیگر اردو داں حضرات کو اپنی روزمرہ زندگی میں اردو رسم الخط کے استعمال کو معمول بنانا چاہیے۔ مثال کے طور پر کسی کو واٹس ایپ، فیس بک یا دوسرے ذرائع پر کوئی پیغام بھیجنا ہو، گھر کے لیے سودا سلف لانے کے لیے فہرست بنانی ہو، دفتر میں یومیہ رخصتی درخواست لکھنی ہو، موبائل فون میں عزیزوں اور رشتے داروں کے نام اور نمبر محفوظ رکھنے ہوں وغیرہ غرض جب ہم ہر جگہ اردو لکھنے کے عادی ہو جائیں گے اس کا براہ راست اثر زبان اور اس کے رسم الخط کی بقا پر پڑے گا۔

س19: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: اردو چونکہ ہندوستان گیر سطح پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی ضرورت ہر علاقائی زبان کو سمجھنے میں محسوس کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میں کشمیری ہوں میری مادری یا علاقائی زبان کشمیری ہے۔ لیکن جب میں کہیں باہر جاتا ہوں یا دوسری ریاست سے کوئی یہاں آتا ہے تو نہ وہ اپنی علاقائی زبان استعمال کرتا ہے اور نہ ہی میں۔ مراد یہ کہ اردو ہندوستان میں تامل ناڈو سے کشمیر تک ہر علاقے میں رابطے کی دوسری اہم زبان ہے۔ جس سے اس کی اہمیت اور استعمال واضح ہے۔

س20: آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: جی ہاں الحمدللہ میں اور میری اہلیہ دونوں اردو مضمون سے پی ایچ ڈی سند یافتہ ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے والد صاحب سبھی بھائی بہن اور بچے بچیاں اردو زبان وادب سے واقف ہیں۔ وہ اردو زبان بولنے، لکھنے اور پڑھنے میں بھی اچھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

س21: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: جی بالکل ان شاءاللہ۔

س22: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ مشاعروں میں موجود غیر اُردو داں حضرات دوران مشاعرہ اردو کی شیرینی اور کشش سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کو اردو سیکھنے کی چاہ دل میں پیدا ہوتی ہے۔ میں نے کئی ایسے پروگراموں میں متعدد افراد کو ان کی خواہش اور درخواست پر اردو میں ان کو ان کے نام لکھ کے دیے۔ جس کو دیکھ ان کے چہروں پر ایک چمک سی پیدا ہوتی ہے۔ مشاعروں کا انعقاد کرنے والے اداروں کو غیر اردو حلقے کے لیے بنیادی اردو کورس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ دوران مشاعرہ ہی اردو کورس کا اعلان کریں۔ جو ایک دو ہفتوں پر مشتمل ہو جس میں اردو کے حروف اور بنیادی چیزیں سکھائی جائیں۔ اس کے علاوہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں غیر اردو حلقے کو اردو سے متعارف کرانے کے لیے بنیادی کورسس کا وقتاً فوقتاً انعقاد کیا جانا چاہیے۔

س23: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ہمارے علاقے پلوامہ میں 6 کالجز ہیں جو کشمیر یونیورسٹی سے منسلک ہیں اور ہر کالج میں اردو زبان وادب کی درس وتدریس کا معقول انتظام ہے۔ جہاں اردو پڑھنے والے طلاب کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ اس کے علاوہ ایک یونیورسٹی بھی ہے لیکن وہاں ابھی شعبہ اردو کا قیام عمل میں نہیں لایا گیا ہے۔

س24: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیمیں اگر چاہیں تو بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ اردو کے ٹی وی چینلز کھول سکتی ہیں۔ جس کی بدولت ملک بھر میں اردو سے محبت کرنے والوں کو اپنی زبان میں خبریں دیکھنے کو ملیں گی۔ ماس میڈیا آج کے دور میں ایک انسان کی زندگی کا لازمی جزو بن چکا ہے۔ سیاست، سماج، ادب، تاریخ، صحت، زراعت، موسم غرض تمام شعبہ ہائے زندگی سے باخبر رکھنے کا معقول ذریعہ ہے۔ ملک میں اردو زبان کے برائے نام ٹی وی چینلز ہیں۔ اگر غیر سرکاری ادارے اردو کی ترویج میں دلچسپی رکھتے ہیں تو یہ ایک اہم خدمت ہوسکتی ہے۔ اردو اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ کے لیے وظیفے دے سکتے ہیں۔ سیمینار اور مشاعرے کرا سکتے ہیں۔ اردو جرنلزم کے کالجز قائم کر سکتے ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں اردو اسکول قائم کر سکتے ہیں۔ پبلک لائبریریوں میں اردو کی کتابوں اور اخبارات وجرائد کا انتظام کرا سکتے ہیں۔

س25: سینٹرل اسکولوں اور نوودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: جی ہاں! بالکل ہے۔ ہمارے ضلع پلوامہ میں تین سینٹرل اسکول اور دو نوودیالیہ ہیں جن میں اردو درس وتدریس کا معقول اور تشفی بخش انتظام ہے۔

■

Dr. Mushtaq Ahmad Ganai
S/o Ab Gaffar Ganai
47, Ganaie Mohallah Samboora,Pampore.
Distt:Pulwama192304 , Kashmir(Kakapora)
Mob: 7006402409
Email: mushtaqalamphd87@gmail.com

1857 کے چند اردو ماخذ

عبدالحق

تاریخ عجائبات سے عبارت ہے اس میں صرف واقعات ہی سرزد نہیں ہوتے بلکہ حوادث کے زیر و بم تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ سانحے ثقافت کو نابود کرتے ہیں اور تہذیبوں کے عروج کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ہماری تاریخ فتح و شکست کی دل دوز کہانیوں کا مرقع ہے۔ اس میں کثرت و قلت یا تخمین و ظن زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ تاریخ کا اس سے بڑا اعجوبہ کیا ہوسکتا ہے کہ بیش و کم کے ساتھ چھ صدی سے زائد حکمراں جماعت سات سمندر پار بیرونی اور قلیل جماعت سے شکست کھا جائے اور لاکھوں باشندوں کے قتل عام کا منظر دیکھنے کے لیے ملک کی آبادی کو مجبور کر دیا جائے۔ بادشاہ کو قید کرکے شہزادوں کو صلیب دار پر لٹکا دیا جائے اور معصوم نونہالوں کے سروں کو تن سے جدا کر کے رقصِ بسمل کا تماشا دیکھا جائے۔ نمک خوارانِ سلطنت اور وفادارانِ مملکت شاہی خاندان کے افراد کو شناخت کرکے سفاک قاتل کے حوالے کر رہے ہوں۔ یہ بھی تاریخ کی بوالعجبی ہے کہ ایوانِ شاہی کے متوسلین ملک و قوم سے پیمانِ وفا توڑ کر دشمنوں کے لیے مخبر اور معاون بن جائیں۔ اقبال نے بڑی جرأت سے ان داغ دار انسانوں کی نشان دہی کی ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن
الاماں از روحِ جعفر الاماں الاماں از جعفرانِ ایں زماں

جعفر و صادق کی خبیث روحیں الٰہی بخش اور احسن اللہ خان، محبوب علی خاں، زینت محل میں نمودار ہوئیں۔ ایسے انسان صرف دربار و امارت سے ہی منسلک نہیں ہوتے اربابِ دانش میں بھی نظر آئیں گے، اور ان سے محراب و منبر بھی خالی نہیں ہیں۔ غدر اقتدار کے ساتھ دو مختلف تہذیبوں کے تصادم کا بھی نام ہے اور مشرق و مغرب کی آویزش کا حرفِ آغاز ہے۔ جس سے ہم آج تک جانبر نہ ہوسکے۔ ابھی تک ہم اتنے سنگین واقعے کو صحیح نام بھی نہ دے سکے۔ عرفِ عام میں اسے غدر کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے بغاوت کہتے ہیں۔ اسے تحریک اور انگریزی عمل داری کے خلاف عوامی بیداری اور شورش بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی Struggle, Movement, Impressing, Revolt, Mutuny جنگ و جہاد کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ کچھ بھی کہیں قتل و خون کا ایسا ہولناک منظر اس سرزمین پر نہیں دیکھا گیا۔ یہ صرف اقتدار کی منتقلی کا منظرنامہ نہ تھا۔ بلکہ روئے زمین مشرق پر مغربیوں کی بالادستی کا اعلانیہ تھا۔ ساحلِ چین سے مراقش کے مغربی ساحل تک محکومی کے منظرنامے کا یہ حرفِ نارواتھا۔

مشرق از سلطانی مغرب خراب

شہیدوں کے خون سے کلکتہ سے کابل اور کشمیر سے راس کماری تک یہ زمین لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ بے شمار جاں بازوں نے شوقِ شہادت میں اپنی جانیں قربان کیں۔ تاریخ کی ستم ظریفی کہیے کہ بہت ہی کم لوگوں کے احوال قلم بند کیے گئے اور واقعات کو بھی محفوظ نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ تقاضا تھا۔ اس شہر کے ایک بزرگ ادیب اور تذکرہ گلزار ابراہیم کے مصنف نے مراٹھوں کی پانی پت کی جنگ کی تفصیلات قلم بند کیں۔ لیکن انگریزوں سے لڑائی کے واقعات تفصیلات سے تشنہ ہی رہیں۔ بلکہ بددیانتی یہ کی گئی کہ انگریزی حکومت کی حمایت یا واقعات کو ان کے نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا۔ یہ بھی عرض کروں کہ غدر کے ہنگامے کے بیشتر تذکرے اردو میں ہی محفوظ ہیں۔ غدر سے متعلق تقریباً بیس ہزار دستاویزات نیشنل آرکائیوز میں اردو اور فارسی زبان میں ہی محفوظ ہیں۔ ایل ایس ڈمپل نے اپنی حالیہ کتاب میں کچھ دستاویزات سے مدد لی ہے۔ اب کچھ مورخین نے توجہ دی ہے۔ شاید اس دور کی تاریخ از سرِ نو مرتب ہو سکے۔

دہلی میں وقوع پذیر ہونے والے غدر کے ہنگامے کا کچھ تفصیلی تذکرہ بعض کتابوں میں ملتا ہے۔ ان میں معین الدین حسن خاں کی غدر، خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس مخطوطے کو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے حاصل کیا اور دہلی یونیورسٹی سے شائع کیا۔ ناچیز نے اس کا ہندی ترجمہ کیا ہے غدر کے واقعات پر چند اور کتابیں بھی موجود ہیں۔ سرسید احمد خاں کی اسباب بغاوت ہند، تاریخ سرکشی ضلع بجنور، ظہیر دہلوی کی داستان غدر، جیون لال، روزنامچہ کنہیا لال اور مولانا فضل حق خیرآبادی، غالب کی بعض تحریریں ایسی ہیں جن میں کچھ اشارے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ غالب جیسا ذکی شعور اور زود حس فن کار بھی خوں چکاں خامہ اور انگلیوں کے فگار ہونے کا ماتم تو کرتا رہا لیکن چشم دید واقعات کی تفصیلات کو قلم بند کرنے سے گریز کیا۔ دستنبو بھی جسے ڈائری کہا جاتا ہے۔ وہ بھی تفصیلات سے خالی ہے۔ اس دور کی سب سے اہم کتاب سید مبارک شاہ خاں کا تذکرہ ہے جو پاکستان سے شائع ہوا ہے۔

ان مصادر کی روشنی میں معین الدین حسن خان کی کتاب بہت غنیمت ہے۔ 'خدنگ غدر' چارلس منکاف کے حکم کی تعمیل کے طور پر لکھی گئی تھی۔ غدر کے وقت معین الدین پہاڑ گنج تھانے پر کوتوال کے طور پر تعینات تھے۔ انھوں نے چارلس منکاف کو باغیوں سے بچایا تھا۔ لیکن مال و اسباب کی ضبطی کے ساتھ ان کی گرفتاری کا حکم صادر ہو چکا تھا۔ یہ جان بچا کر حجازِ مقدس چلے گئے۔ لوٹنے پر چارلس منکاف نے ہی انھیں دار و گیر سے بچایا۔ 1898 میں منکاف نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا اور کتر بیونت کے ساتھ۔ مصنف نے منکاف سے یہ درخواست کی تھی کہ ان کے انتقال کے بعد کتاب شائع کی جائے منکاف نے ایسا ہی کیا۔

کتاب اودھ کی انقلابی بغاوت سے شروع ہوتی ہے۔ میرٹھ کے کارتوس کے واقعے کو بھی قدرے تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ دہلی سے باہر کے واقعات سناتے ہیں اور دہلی کا تو چشم دید بیان ہے۔ مرزا یوسف غالب کے چھوٹے بھائی کی ہلاکت کا بھی ذکر ہے۔ غرض دہلی کی انتہائی دل دوز کہانی کو مصنف نے پر اثر انداز میں محفوظ کیا ہے۔ شہر رئیسان قوم مسلم سے خالی ہوگیا۔ کتاب کے آغاز میں انگریزی سرکار کی مدح سرائی کی گئی ہے اور اپنے کوائف بیان کیے ہیں۔ اپنی دربدری اور منکاف کی طرف سے ہمدردی کا صدقِ دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔ مصنف نے اقرار کیا ہے کہ وہ واقعات جو بڑے بزرگوں اور خوردوں کے ساتھ گزرے ہیں اور جن واقعات کو بچشم خود دیکھا ہے یا سنا ہے وہی محفوظ کیا ہے۔ آغاز میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ نہ عالم ہے اور نہ فاضل بس سپاہی پیشہ ایک گنہگار انسان ہے۔ 1887 میں کتاب مکمل ہوئی۔ سیدھی سادی زبان میں لکھی گئی ہے

دوسری اہم کتاب 'تذکرہ جنگِ دہلی 1857' کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اس کے مصنف سید مبارک شاہ خان بھی دہلی میں شہر کوتوال کے منصب پر فائز تھے۔ اس اہم کتاب کو ترجمہ و تحقیق سے مرتب کرکے سعود الحسن خان روہیلہ نے 2007 میں لاہور سے شائع کیا ہے بیانات کے ساتھ خود مصنف کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ غدر کے بعد دو سال بعد یعنی 1859 میں یہ روزنامچہ مکمل کیا گیا ہے۔

معین الدین حسن خاں فصیل شہر سے متصل پہاڑ گنج تھانے کے کوتوال ہونے کی وجہ سے اس علاقے کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے تھے۔ مگر آشوب قیامت جیسے ہولناک حالات سے نبرد آزما ہونا آسان نہ تھا۔ جان و مال کی حفاظت کی ذمے داری ان کے سر تھی۔ شورش زدہ شہر میں امن و اماں

عنقا تھا۔ انگریزی فوج کی بربریت کو روکنا یا لگام دینا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان کی وجہ سے کئی انگریزوں کی جان بھی بچ گئی جس کا انھیں صلہ بھی ملا۔ پھر بھی انھیں ہندوستانیوں کی حمایت کرنے کی سزا بھی ملی۔ چارلس مٹکاف درمیان میں سفارشی نہ ہوتے تو نہ جانے کیا گزرتی۔ انھیں کی فرمائش پر یہ واقعات قلم بند کیے گئے۔ مصنف دہلی میں مقیم تھا۔ مگر دور دراز کے واقعات کو سن کر اور بلا تحقیق محفوظ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سنی سنائی باتیں بہت زیادہ اعتبار کے قابل نہیں ہوتیں۔ اس زمانے میں افواہیں بھی جھوٹ سچ کے ساتھ گشت کر رہی تھیں اور ذرائع ابلاغ بھی بہت ترقی یافتہ نہ تھا دہلی میں بیٹھ کر گورکھپور، الہ آباد، جونپور، لکھنؤ، کانپور پھر جنوبی ہند کے واقعات کو ضبط تحریر میں لانا آسان نہ تھا۔ لہٰذا خبروں اور بیانات پر اکتفا کرکے ہنگامۂ غدر کو صفحۂ کاغذ پر لایا گیا۔ اس لیے صداقت کا سو فیصد کتاب میں در آنا ممکن نہ تھا۔ ان سب خامیوں کے باوجود اس سانحے کا ایک عصری دستاویز میں محفوظ ہونا بہت غنیمت ہے۔ مصنف کو اندیشہ لاحق تھا خواہش تھی کہ یہ تحریر ان کی وفات کے بعد شائع ہو فساد خلق سے زیادہ انھیں اپنی عافیت عزیز تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے شکر گزار ہیں کہ ان کی بدولت یہ مسودہ برآمد ہوا اور شائع ہوا۔

معین الدین حسن خاں کے ہم پیشہ اور معاصر سید مبارک شاہ ہیں۔ جو معین الدین حسن سے منصب میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے یہ پورے شہر دہلی کے کوتوال تھے اور بادشاہ وقت کی طرف سے مامور کیے گئے تھے۔ ان کی یادداشت بھی کم وبیش خدنگ غدر کی طرح وجود میں آئی یہ آزادی کے علم بردار جاں بازوں سے ہمدردی رکھتے تھے جنرل بخت خاں سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ 14 ستمبر کو شہر دہلی کے محاصرے میں یہ بھی تھے دوسرے ملازمین کی طرح ختم ہوگئے ہوتے اگر اس وقت بخت خاں کے خیمے میں نہ ہوتے۔ وہ انقلابیوں کے ہمراہ بریلی چلے آئے اور روپوش زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ عام معافی کے اعلان کے بعد وہ اپنے سابقہ افسر آر ایم ایڈورڈس کے پاس آکر اپنے کو سپرد کر دیا۔ ان کے وطن بلند شہر میں موجود تمام جائداد ضبط کی جا چکی تھی انھیں معافی حاصل ہوگئی۔ مگر نہ ملازمت ملی نہ جائیداد ہی واگذاشت ہوسکی۔ ایڈورڈس نے انھیں 1857 کے چشم دید واقعات لکھنے کی فرمایش کی۔ جو جنوری 1859 میں مکمل ہوئی۔ ایڈورڈس ایک افسر تھا۔ اس نے بھی کم وبیش واقعات دیکھے تھے۔ بلکہ اس دن وہ خود بھی اس موج خوں سے گزرا تھا۔ سید مبارک شاہ کی تحریر کو اس نے انگریزی میں منتقل کیا اور بڑی دیانت داری سے جہاں اختلاف تھا اس نے اپنے نوٹس بھی دیے ہیں۔ اس نے اپنے ترجمے کا نام بھی دیا ہے 'The Narrative of Syed Mubarak Shah'

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے مسودے کا کوئی نام تجویز نہیں کیا تھا۔ ایڈورڈس نے لکھا ہے کہ یہ مسودہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

معین الدین حسن خاں کی طرح اس کتاب میں بھی کہیں کہیں انگریزوں کی تعریف موجود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اسی طرح انگریز افسر کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ مگر وہ ہندوستان کا وفادار ہے اس لیے انقلابی جوانوں کی بھی تعریف کرتا ہے اس روز نامچے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بہت سے احراری یا انقلابی افراد کے نام بھی درج کیے گئے ہیں۔ مصنف کی رسائی اکابرین تک تھی۔ بہادر شاہ ظفر، بخت خان، مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ کے ساتھ حکیم احسن اللہ خاں سے بھی مراسم رکھتا تھا۔ اس طرح اس شخص کے مشاہدات یا بیانات زیادہ وقیع اور اہم ہیں۔ واقعۂ غدر کی واقفیت کے لیے ان دونوں کتابوں کی یکساں اہمیت ہے۔ بلکہ ایک دوسرے کے لیے معاون ہیں۔ دونوں وفاداریوں کے باوجود معتوب رہے اور ملازمت وجائیداد سے محروم کیے گئے۔ انھیں تحریروں کی وجہ سے جاں بخشی بھی ہوئی۔ جو بھی ہو اردو کے دامن میں اس انقلاب کے مشاہدات کی ایسی دستاویز موجود ہے جو کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ نکتہ بھی پیش نگاہ رہے کہ یہ واقعات اردو والوں سے زیادہ سے زیادہ متعلق رہے۔ اس لیے بھی نظر انداز کیا گیا۔ ابھی ذکر کیا گیا کہ ہمارے ادیبوں اور مورخوں نے بھی وہ توجہ نہیں دی جس کی توقع یا تقاضا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس بھی ہوا۔ اردو کی پہلی ادبی تاریخ آب حیات ہے۔ جس کے مصنف محمد حسین آزاد ہیں انھوں نے بھی کتمانِ حق سے کام لیا۔ مومن کا تذکرہ نہیں کیا۔ بعد میں کچھ لکھا تو ان کی شاعری کو معائب سے معمور ہی بتایا۔ کیونکہ مومن خاں مومن پہلے معتبر ادیب ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف مثنوی جہاد لکھی۔ یہ بڑی جرأت تھی لہٰذا ان کا نام لینا آزاد کے نزدیک کلمۂ کفر سے کم نہ تھا۔ مثنوی جہاد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ یہ غالباً 1813 کی تخلیق ہے۔

پلا مجھ کو ساقی شراب طہور   کہ اعضا شکن ہے خمار فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا   کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
بہت کوشش وجاں نثاری کروں   کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
نہ کیونکر ہوں اس کام میں ناشکیب   ظہور امام زماں ہے قریب

فارسی کے دونوں قصیدے جو سید احمد شہید کی مدح میں ہیں۔ ان کا جوش وخروش طوفان انگیز ہے۔ انگریزی ستم رانیوں کے خلاف اسے اعلانیہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ عرفی کی زمین میں ہے۔ ایک دوسری مثنوی کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا   فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
امامِ زمانہ کی یاری کرو   خدا کے لیے جاں نثاری کرو

ایں عیسویاں بلب رسانند   جانِ من و جانِ آفرینش
تا چند بخواب ناز باشی   فارغ ز فغانِ آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست   اے فتنہ نشانِ آفرینش

اس دور میں ذوق وغالب بھی تھے مگر لاتعلق تھے۔ ایسے ہی محمد حسین آزاد نے دوسرا ستم کیا ہے کہ سعادت یار خاں رنگین (1835) کو ریختی کا شاعر قرار دے کر ان کی جملہ خصوصیات پر پانی پھیر دیا ہے۔ ایسا قادر الکلام اور وسیع الفکر شاعر اردو میں نظر نہیں آتا۔ جو یقیناً نابغۂ روزگار تھا۔ مگر رنگین کا قصور یہ تھا کہ اس جیالے نے آزادی کے سالار سلطان ٹیپو شہید کا قصیدہ لکھا تھا۔ جو ظاہر ہے کہ انگریزوں کے خلاف تھا۔

یہاں بھی ان کی انگریز پرستی ادبی تاریخ کی صفات کو داغ دار کرتی ہے۔ اس کے برعکس واجد علی شاہ کی مدح سرائی کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ جو بیرونی اقتدار کے ہاتھوں بے دام بکنے کے لیے پہلے تیار ہوئے۔

داستان غدر کے مصنف ظہیر دہلوی کو دیکھیے بادشاہ کے دربار میں پلے بڑھے۔ ذوق کے شاگرد تھے مگر واقعہ نگاری کا حق ادا نہیں کیا معتوب بھی ہوئے۔ ظہیر دہلوی کا شعر ہے۔

گھروں سے کھینچ کر کشتوں کے کشتوں ڈالے ہیں
نہ گورے ہیں نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

غالب غدر کے بعد تقریباً بارہ سال زندہ رہے اگر چاہتے تو دنیائے ادب کا لافانی شہر آشوب قلم بند کر سکتے تھے۔ مگر بے زبانی اور خموشی اختیار کی۔ فرماں روی کے عہد زریں کے قصیدوں کی آب وتاب ختم ہوگئی۔ غالب نے اشعار سے زیادہ خطوط میں کشت وخوں کے منظر کا ذکر کیا ہے۔ مفتی صدر الدین آزردہ بھی ضبط نہ کر سکے۔

روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مولوی خرم علی (وفات 1856) نے بھی ایک قصیدۂ جہادیہ لکھا تھا۔ مولوی لیاقت علی نے کاشف البغاوت لکھی یہ 147 صفحات کا مخطوطہ ہے ان کی 1817 پیدائش الہ آباد میں ہوئی۔

تاریخ عالم کے ایک عظیم حادثے کی بہت کچھ روداد اردو میں ہی قلم بند ہے۔ جو ذخیروں کے علاوہ نجی اندوختوں میں روز نامچے اور یادداشتوں کے طور پر محفوظ ہیں۔ عہد مغلیہ کے آخری دور کی کوئی بھی تاریخ اردو کے اکتساب کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ کھوئے ہوئے حوادث وافراد کی جستجو ہی اردو کی سرگذشت ہے۔

■

Prof. Abdul Haque
2315, Hudson line
GTB Nagar Delhi-110009
Mob: 9350461394

پروفیسر لطف الرحمن

مشرقی اقدار سے آشنا تنقید نگار

ابراراحمد اجراوی

نامورشاعرونا قد پروفیسر لطف الرحمٰن (2013-1941) کو دنیائے شعر وادب میں منفرد حیثیت حاصل تھی۔ان کا وطنی اور آبائی تعلق شمالی بہار کے مشہور ضلع دربھنگہ سے تھا، مگر ان کی تصنیفی اور تخلیقی سرگرمیوں کا گہوارہ 'شہر ریشم' بھاگل پور رہا، اس شہر میں وہ عرصے تک مقیم رہے اور اسی قطعۂ ارضی پر وہ جام جمشید کی مدد سے ادب موجوں کا تماشا دیکھتے رہے، اپنی تنقیدی وتخلیقی فتوحات کی کرنوں سے جہان ادب کو منور کرتے اور بحر ادب کی نئی لہروں کو شمار کرتے رہے۔وہ زبان وادب کی مشاطگی کے ساتھ لیلائے سیاست سے بھی بغل گیر رہے، انھوں نے قصر ادب کی جی بھر کے سیاحت کی، سیاست کے قلعۂ احمر کا لطف تو لیا، مگر وہ پہلے ادیب تھے، بعد میں کچھ اور، سیاست میں ان کی انٹری اتفاقی تھی۔ان کی ذہنی وفکری تگ ودو کا محور ومرکز شعر وادب تھا۔ان کی مختلف جہتیں مسلم تھیں۔وہ شاعر، محقق، افسانہ نگار، صحافی اور مترجم بھی تھے اور تنقید کی زلف گرہ گیر کے عاشق صادق بھی۔ادب گلوب میں ان کی پہچان ناقد سے زیادہ ایک شاعر کی تھی، مگر ان کی تنقیدی نگارشات پر مبنی اثاثہ بھی کم نہیں ہے، اگر ایک طرف انھوں نے اپنے منفرد لہجے میں غزل ونظم کی زلفوں کو سنوارا، تو دوسری طرف اپنی بصیرت افروز اور نکتہ سنج تحریروں کے وسیلے سے نقد وتنقید کے پیچ وخم کو بھی سلجھایا۔اپنی بے باک تحریروں سے گلستان نقد کو تا مرگ انھوں نے آباد رکھا۔اگر تقابل وتعارض کیا جائے تو ان کے تنقیدی مجموعہ ہائے مضامین کا شمار شعری مجموعوں سے کم نہیں، زیادہ ہے۔اگر ایک دو کتابوں کو اس صف سے نکال بھی دیا جائے، تو لگ بھگ برابر برابر کا معاملہ ہوگا۔

یہ بات اب راز نہیں رہ گئی ہے کہ پروفیسر لطف الرحمٰن ابتدا میں کافی حد تک ترقی پسند رہے، گرچہ ان کی عملی پرواز کے وقت ترقی پسند تحریک پا بگور تھی، مگر وہ اسی شکستہ آئینے میں اپنی تصویر دیکھتے رہے، وہ ترقی پسندیت سے اتنے متاثر تھے کہ ان کے ہم مشربوں اور ہم نشینوں کا حلقہ بھی ترقی پسند افکار ونظریات کا انتہا پسند مبلغ تھا، عظیم آباد سے لے کر دہلی تک ان کے مراسم وعلائق ایسے ہی ناقدوں سے استوار رہے، مگر شاید وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ 'چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'، اسی لیے بعد میں انھوں نے نئے مکتب تنقید کو اپنا قبلہ وکعبہ بنا لیا تھا، ظاہر ہے کوئی یوں ہی بے وفا نہیں ہوتا، کچھ مجبوریاں اور پابندیاں رہی ہوں گی۔انھوں نے نئی ادبی تحریک جدیدیت کی آواز پر نہ صرف بآواز بلند لبیک کہا اور اس کے ہر فرمان پر آمنا صدقنا کا اظہار کیا، بلکہ اس کی فکری منہجی بنیادوں کو آب وغذا فراہم کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا۔ اس نئی تنقیدی فکر کے موضوع پر مضامین ومقالات لکھے، مغرب سے برآمد فکری بحثوں کو نئے رنگ ڈھنگ کے ساتھ پیش کیا، اردو میں اس کی جگہ متعین کی اور دوسری متوازی ومتصادم تحریک کی فکری بنیادوں پر تنقید کا تیر ونشتر چلایا۔مجموعۂ مضامین 'نقد نگاہ' کی ابتدائی سطروں میں بابائے تنقید حالی وشبلی سے لے کر، مجنوں گورکھ پوری، احتشام حسین، قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی، وہاب اشرفی اور ابوالکلام قاسمی تک جن چنندہ ناقدین کا انھوں نے بصراحت نام لیا ہے، اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ وہ ہوا کے کس رخ پر اپنا سفر نقد جاری رکھے ہوئے تھے اور یہ بھی کہ کون ان کا حلیف ورفیق تھا اور کون ان کے سامنے حریف یا 'رقیب رو سیاہ' کے رول میں تھا۔ 1993 میں مجموعۂ مضامین 'جدیدیت کی جمالیات' کی اشاعت ان کی نئی فکری بازگشت کا اعلان تھا۔چناں چہ انھوں نے جدیدیت کی حمایت میں یہ لکھا تھا:

''جدیدیت کے فکری اور جمالیاتی پہلوؤں پر کئی تنقیدی تصنیفات اور مجموعہ ہائے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔لیکن جدیدیت آج بھی ایک نزاعی مسئلہ ہے۔یہ مجموعۂ مضامین شاید کہ مختلف مسائل ومباحث اور متضاد نظریات وخیالات میں ہم آہنگی کی ایک بنیاد فراہم کرنے میں معاون ہو۔''
(جدیدیت کی جمالیات، ڈاکٹر شاداب رضی (مرتب)، سن فلاور ایسوسیٹس، جمشید پور، 1993، ص 12)

آگے اپنی بات اور تنقیدی موقف کو مزید مستحکم اور مدلل کرنے کے لیے برملا اور دوٹوک انداز میں ایسے جملے لکھے، جس سے ایک خاص مکتب فکر کی حمایت ووکالت کا عنصر ہمارے روبرو ہوتا ہے:

''جدیدیت کوئی منفی تحریک نہیں، بلکہ عصر حاضر کی میکانکی زندگی اور منتشر معاشرے میں مثبت اقدار حیات کی نایابی کی نوحہ خواں اور ان کی ازسرنو بازیافت اور ترویج وتوسیع کی نغمہ گر ہے۔ اس حقیقت کی تفہیم کے بغیر جدیدیت کی تفہیم مشکل ہے۔'' (ایضا، ص 13)

اس اعلان واظہار کے باوجود اگر ہم ان کی تمام تنقیدی تحریروں کا کھلے ذہن ودل سے مطالعہ ومحاسبہ کریں، تو یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ انھوں نے اپنے طائر فکر کو کسی حد تک آزاد بھی رکھا، انھوں نے صرف دوسروں کی تقلید کا شیوہ نہیں اپنایا، اپنا نشان قدم بھی بساط نقد پر ثبت کیا، صرف پرانی لکیریں نہیں پیٹیں، بلکہ نئی لکیریں بھی کھینچیں، یہ حالات وواقعات کا جبر ہی رہا ہوگا کہ ایک ترقی پسند، جو بعد میں جدیدیت کا مبلغ اعظم بھی رہا، وہ کیوں کر دوسری آوازوں یا نئے تنقیدی نعروں کے سحر میں کھونے کی کوشش کرتا رہا۔ہم ذرا توسع سے کام لیں جس میں کوئی حرج بھی نہیں، تو انھیں تین نسلوں یا موٹے طور پر تین مکاتب فکر کی نمائندگی کرنے والا ناقد بھی کہہ سکتے ہیں، نمائندگی اور ترجمانی کا عرصہ کم وبیش ہوسکتا ہے، تبدیلی قزاقوں کے مثل نقارہ بجا کر نہیں آتی، وہ اپنی آمد کا اشتہار نہیں دیتی، یہ تو دبے پاؤں آتی ہے اور اچھے اچھوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتی ہے۔ تبدیلی ہوا کا زوردار جھونکا ہے، جس میں سب کچھ اڑا لے جانے کی شکتی ہوتی ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن بھی تغیر پسند ناقد تھے، وہ رجحانات وتحریکات کے تعدد سے متاثر ہوئے، اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر عازم سفر ہوئے۔پھر وہ ایک دوررس اور ذہین تخلیق کار تھے، ان کو زمانہ سازی کا ہنر بھی

تو خوب آتا تھا، یوں وہ کسی ایک کھونٹے سے بندھ کر نہیں رہے، دوسری چراگاہوں میں بھی چرتے چگتے رہے اور الحکمۃ ضالۃ المؤمن (حکمت و دانائی مسلمانوں کی متاع گم شدہ ہے) کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے دنیائے تنقید میں اپنی جگہ مستحکم کرتے رہے۔ اگر ان کے یہاں یہ توسع نہ ہوتا تو انھوں نے اپنی مشہور کتاب 'جدیدیت کی جمالیات' کا پیش لفظ مابعد جدید ناقد پروفیسر وہاب اشرفی کے قلم سے نہ تحریر کرایا ہوتا۔

یہ صحیح ہے کہ پروفیسر لطف الرحمٰن نے تنقید پر کوئی معرکۃ الآرا کتاب نہیں لکھی، نہ باب تنقید میں کسی تاریخی کارنامے کا تاج ہی ان کے سر پر ہے، مگر تنقید اور شاخہائے تنقید پر ان کی کئی کتابیں ہیں۔ یہ غیر منظم طور پر لکھی گئی تنقیدی تحریروں کا مجموعہ تو ہیں۔ مگر ان تمام کے بطن و متن میں فرصت اور ایمان داری سے جھانکا جائے، تو پتہ چلے گا کہ یہ مضامین بس اپنی نوعیت و ماہیت کے حساب سے مضمون کی شبیہ کے حامل ہیں، ورنہ یہ اپنی علمیت و ہمہ گیری اور بصیرت افروزی و نکتہ رسی کے سبب ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں۔ ان کی کتابیں جدیدیت کی جمالیات، نقد نگاہ، تعبیر و تقدیر، تخلیق و تنقید، نثر کی شعریات اور تنقیدی مکالمے تنقیدی جہان میں وقار و اعتبار کی علامت یقین کی جاتی ہیں اور انھیں حوالے کے طور پر عصر حاضر کے محققین و ناقدین استعمال بھی کرتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک منقسم الوقت ادیب تھے، انھوں نے اپنی حیات مستعار کا حصہ بہت ساری مصروفیات میں تقسیم کر رکھا تھا، اس میں شعر و ادب ہی نہیں، درس و تدریس، سماج و سوسائٹی، سیاست اور متعلقات سیاست کا بھی خاصا حصہ تھا، مگر انھوں نے ایک عرصے بعد ہی سہی، مطالعے و محاسبے کی دنیا سے ایک بار جب رشتہ قائم کر لیا، تو پھر نہ چپ و راست کی فکر کی، نہ جانب پشت مڑ کر دیکھا، بلکہ بے نیازی کے ساتھ مختلف موضوعات و نکات پر تنقیدی افکار سے مملو تحریریں لکھتے رہے۔

پروفیسر لطف الرحمٰن تنقیدی مکاشفے اور تحریری مراقبے کی منزل سے گزرنے کے بعد ہی قلم ہاتھ میں لیتے تھے، وہ 'کاتا اور لے دوڑے' کی معاصر نفسیات سے مجتنب رہتے تھے۔ انھوں نے موضوع کی تہوں میں ڈوب کرنے اور غیر ممسوس موضوعات پر مقالات و مضامین لکھے ہیں۔ گرچہ انھوں نے باضابطہ کوئی تنقیدی کتاب نہیں لکھی، جو یک موضوعی ہو اور کسی ایک فکر کے گرد طواف کرتی ہو، مگر ان کی متفرق تنقیدی تحریروں میں بھی جن ادبی، فنی اور شعری جہات کو مس کیا گیا ہے، وہ اردو تنقید کے منتخبات میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

وہ ایک ذہین، جینیس اور عبقری ادیب تھے، شعر و ادب اور تنقید و تخلیق کے حوالے سے ایک سلجھا ہوا رویہ رکھتے تھے۔ ان کے یہاں نام نہاد جدیدیوں جیسی پیچیدگی، غموض و ابہام، فراریت اور مہملیت نہیں تھی۔ وہ ادب و تنقید میں دیانت داری کو ترجیح دیتے تھے اور قلم و ادب کی حرمت کو صنعت و پیشے کی آلودگیوں سے صاف رکھنا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''ادب کاروبار نہیں، ادب کی تنقید بھی کاروبار نہیں۔ ادب صنعت نہیں ہے۔ تنقید بھی صناعی نہیں ہے۔ ادب تخلیق ہے۔ اس کی تنزیل غیب سے ہوتی ہے— آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں— فن کار خالق ہوتا ہے، صناع یا کاریگر نہیں۔ تنقید بھی کاریگری نہیں۔ تخلیق فنکار کی داخلیت سے جنم لیتی ہے۔''

(پیش آہنگ، تنقیدی مکالمے، نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی 2008، ص9)

پھر تنقید کے ہیولی، اس کی جمالیاتی شق، اس کے حدود اربعہ اور شکل و ڈھانچے کی وضاحت کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس میں نقادان ادب کو ان کے منصبی فرائض سے بھی آگاہ کیا ہے:

''تنقید کسی تخلیق کا ذہنی و فکری مطالعہ ہے۔ نقاد فن کارانہ عظمت کا اہل نہیں۔ لیکن ہر تنقید اپنی حدود میں ایک جمالیاتی تجربہ ہے۔ تخلیق کی داخلیت کا عرفان ہی نقادوں کی کامیابی و ناکامی کی کسوٹی ہے۔ ہر تخلیق حسن کائنات کی تخلیق نو ہوتی ہے۔ نقاد حسب استعداد حسن کے جلوہ ہائے گریزاں کو بے نقاب کرتا ہے۔ تخلیق تنقیدی نظریات و افکار سے بلند ہوتی ہے۔ کوئی تنقیدی نظریہ مکمل نہیں۔ بقول وارث علوی- ''تمام تنقیدی نظریات اضافی ہوتے ہیں۔'' (تنقیدی مکالمے، ص10)

پروفیسر لطف الرحمٰن کی شناخت شاعر کے طور پر تھی، مگر انھیں نقد و انتقاد سے بہت لگاؤ تھا، وہ تنقید کے مکمل آدمی کہے جا سکتے ہیں۔ ان کا خمیر تنقید سے عبارت تھا۔ وہ پورے قد کے ناقد تھے، اس لیے تنقید کی نظریاتی بحثوں کو انھوں نے کئی تحریروں میں مبرہن کیا ہے۔ عمل نقد و تنقید کیا ہے، اس کو منقح کرتے ہوئے ایک کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''خیر اور شر، حسن اور قبح، روشنی اور تیرگی، حق اور باطل، تعمیر اور تخریب.....اور اچھائی اور برائی وغیرہ کے درمیان تفریق و امتیاز کا شعور و احساس تنقید سے عبارت ہے۔ تنقید انسانی جبلت ہے۔ انسان کا کوئی عمل تنقیدی احساس و شعور سے بے نیاز و بے تعلق نہیں ہوتا۔''

(نقد نگاہ، تخلیق کار پبلی کیشنز، دہلی، 2006، ص9)

آج کل تنقید، تنقید نہیں رہی، بازیچۂ اطفال بن گئی ہے، جس میں شب و روز تماشا اور قلابازی ہوتی رہتی ہے، یہ ایک مشغلۂ بے کاراں بن کر رہ گیا ہے، جس میں نااہل ہی نہیں، تنقید کی ابجد سے ناواقف لوگ بھی نورا کشتی اور دھکا مکی میں مصروف ہیں۔ مگر لطف الرحمٰن دوسرے ڈھب کے آدمی تھے، وہ تنقیدی صلاحیت کو شغل بے کاراں نہیں، فضل الٰہی اور نعمت خداوندی شمار کرتے تھے۔ اور ان کا یہ موقف تھا کہ تنقید صرف انسان کا کام نہیں، ہر جان دار یہاں تک کہ خود رو بے وقعت و توقیر معمولی پودا بھی تنقیدی صلاحیت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ تنقیدی کتاب 'نقد نگاہ' کی ابتدا میں ہی لکھتے ہیں:

''تنقید ایک فطری ودیعت ہے۔ ہر جاندار وجود فطرت کی اس نعمت سے حسب ظرف و ضرورت بہرہ ور کیا گیا ہے۔ سائنسی تجربہ و تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ پودے بھی تنقیدی حس سے بیگانہ نہیں۔'' (ایضاً، ص9)

معاشرے میں نقاد اور ادیب دونوں کی حیثیت مسلم ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے ہیں اور دونوں دو مختلف سروں کو پکڑے ہوئے ہیں، ادبی سماج میں ذاتی اور گروہی مفادات عزیز ہوتے ہیں، اس لیے دونوں کو مدمقابل رکھنے کی سعی ہوئی ہے اور دونوں کے اجتماع و اتحاد کی شکلوں کو ناکام بنایا گیا ہے۔ مرحوم لطف الرحمٰن ایک معتدل اور متوازن تنقیدی نظر کے حامل نقاد تھے، چناں چہ وہ دونوں کے میدان کار کی تعیین کے ساتھ دونوں کے درمیان رشتوں کی یکسانیت اور ہم آہنگی پر بھی زور دیتے ہیں۔ ذمے داریوں کی مساویانہ تقسیم سے انکار نہیں، مگر مآل کو نظر میں رکھا جائے تو دونوں کی سمت سفر اور منزل ایک ہے، نقاد اور تخلیق کار کے منصب اور دونوں کے درمیان مشترکہ اقدار کی نسبت لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

''ادب اور تنقید میں چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن فنی تنقید کی سرحدوں کا آغاز تخلیق کی تکمیل کے بعد ہوتا ہے۔ تنقید کا بنیادی مقصد فن کار اور قاری کے درمیان سازگار فکری اور جمالیاتی مفاہمت اور جذبہ و احساس کی ہم رشتگی کا فروغ ہے۔ نقاد قاضی، مفتی یا فقیہ نہیں ہوتا۔ کسی حد تک مدرس ہو سکتا ہے۔ نقادوں پر قارئین کے ذوق ادب و فن اور احساس جمال کی تہذیب و تحسین کی ذمے داری تو یقیناً عائد ہوتی ہے۔'' (ایضاً، ص11)

شعر و ادب کی حقیقت و ماہیت کیا ہے، تخلیق و تحریر کا مدعا و منشا کیا ہے؟ ان امور سے لگ بھگ قدیم و جدید عہد کے سبھی ناقدین نے بحث کی ہے، ہمارے اکابر ناقدوں نے بھی اور اصاغران نقد نے بھی ادب کی فنی جہتوں سے مکالمہ کیا ہے۔ تخلیق کے مقام و مرتبے اور انسانی اعمال میں اس کی انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر لطف الرحمٰن اپنے منفرد اسلوب میں لکھتے ہیں:

''تخلیق ادب انسانی وجود کا سب سے گراں قدر اور اعلیٰ ترین عمل ہے۔ ادب تجربۂ حیات کی آئینہ داری نہیں بلکہ اس کی تخلیق نو ہے۔ ادب روحانی بصیرتوں اور انسانی زندگی کے درمیان ایک رابطے کا نام ہے۔ شاعران

دیکھی دنیاؤں کا پروہت ہوتا ہے۔'' (ایضاً، ص9)

دیگر شعبہائے حیات کی طرح شعبۂ ادب میں بھی تعصب کی لہر چلتی رہی ہے۔ میر و سودا اور ذوق و مرزا کا عہد زریں بھی اس عیب سے منزہ نہیں رہا۔ فن برائے فن، ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کیا ہے، اسی قسم کی بحثوں کا شاخسانہ اور نتیجہ ہے، جس میں تخلیق کے ظہور و وجود کو نہیں، اس کے مقصود و مطلوب یعنی نتائج کو نظر میں رکھ کر شعر و ادب اور تخلیقی سرمایے کی تعیین قدر کی جاتی ہے۔ مذہب اور مسلک و مشرب کی اساس پر بھی ادب اور غیر ادب کے درمیان خلیج قائم کرنے کی نامبارک و مسعود کوششوں سے اردو تاریخ کے صفحات پاک نہیں رہے ہیں۔ نفس تخلیق کو نہیں، بلکہ تخلیق کے مبدأ و منشا کو مرکزی نقطہ بنا کر جہان ادب میں داخل و خارج کرنے کا رویہ بھی جانب دار اور متعصب ذہنوں پر حاوی رہا ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن مرد درویش تھے، مست مولی اور قلندر صفت آدمی، وہ اس قسم کی لایعنی آرا اور مہمل ابحاث کو در خور اعتنا نہیں گرادنتے تھے اور شعر و ادب کو صرف شعر و ادب یقین کرتے تھے اور اسی بنیاد پر اپنی تنقیدی رائے قائم کرتے تھے اور بے باکی کے ساتھ اپنا موقف قارئین کی بارگاہ میں رکھتے تھے۔ وہ مذہب بیزار نہیں تھے، اس لیے مذہب یا مذہبی مباحث کی تخفیف و تحقیر سے بھی گریزاں رہتے تھے، ادبی اثاثے کو مذہبی اور غیر مذہبی بنیادوں پر پرکھنے کے وہ عادی نہ تھے۔ ان کے مضامین بعنوان 'اردو نثر کے اسلوبی ارتقا میں مولانا منت اللہ رحمانی کے امتیازات'، 'سید سلیمان ندوی: محقق، منقد، مبصر' 'نعتیہ شاعری اور اقبال'، 'اقبال ایشیائی بیداری کا نقیب' وغیرہ اور اپنی تنقیدی کتاب پر مولانا محمد ولی رحمانی کا حرف چند، اسی بات کا عملی اظہار ہے کہ وہ ادب کو مذہب کی مصنوعی سرحدوں میں منقسم نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مقدس آسمانی صحائف کو بھی ادب عالیہ کا منصب عطا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''قرآن کریم، انجیل، زبور، توریت اور وید وغیرہ محض عظیم الشان اور غیر فانی مذہبی اور روحانی دستاویز ہی نہیں، بلکہ عظیم ترین ادب العالیہ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ہر وہ کتاب جو اپنی تازگی اور شادابی افکار سے انسانی عقل و دانش کے لیے صدمے کا باعث ہو، انسانی فکر و تخیل کے لیے نشاط و مسرت کا سبب ہو، خیر و صداقت کی محرک ہو، مسرت و بصیرت کے امتزاج سے عبارت ہو، ادب العالیہ کا درجہ رکھتی ہے۔'' (نقد نگاہ، ص10)

لطف الرحمٰن مشرقی اقدار حیات اور نظام افکار پر یقین رکھتے تھے۔ وہ مادیت نہیں روحانیت کے پرستار تھے۔ وہ مشرق کو مغرب سے کمتر نہ کہتے تھے اور نہ کبھی لکھتے تھے۔ وہ مغرب اور مغربی سائنسی ایجادات سے مرعوب و متاثر نہیں تھے۔ وہ اتنے مشرقیت پسند تھے کہ مشرق کو روحانیت کا مرکز کہتے اور اس کو مغرب پر بالادست قرار دیتے تھے:

''مشرق و مغرب میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مغرب کا انداز فکر و نظر سائنسی اور مادی ہے جب کہ مشرق کا داخلی اور روحانی۔ مغرب عقلیت پسند اور معروضی ہے اور مشرق روحانیت پسند اور مذہبی۔ ایسا نہیں ہے کہ مغرب ہمیشہ مذہب اور روحانیت سے بے نیاز رہا ہے۔ کچھ صدیوں قبل تک مغرب میں بھی روحانیت کو مرکزیت حاصل تھی اور مشرق میں سائنسی مزاج اور تحقیق و تفتیش کا رجحان غالب تھا۔ چین، ہندوستان اور عالم اسلام نے سائنس، طب، کیمیا، سرجری اور دوسرے شعبوں میں ساری دنیا کی شان دار رہ نمائی کی ہے۔'' (نقد نگاہ، ص11)

پروفیسر لطف الرحمٰن نے جدیدیت کو وجودیت کی توسیع قرار دیا تھا، جو ایک مغرب سے برآمد کردہ نظریہ تھا، انھوں نے اس کو تمام دوسرے نظریات و افکار اور علوم و فنون کا مجموعہ ثابت کرنے کے لیے 1980 کے آس پاس سے لے کر بعد کے زمانے تک بیسیوں طویل ترین مقالے لکھ ڈالے، جس کی تفصیل 'جدیدیت کی جمالیات' نامی کتاب میں بچشم خود دیکھی جا سکتی ہے، مگر جب اسی کتاب کا انھوں نے پیش آہنگ (مقدمہ) لکھا تو اپنی آزادانہ روش کے سبب یہ بھی لکھا کہ:

''مضامین کا یہ مجموعہ جدیدیت کی وکالت یا کسی تنقیدی ادعائیت پر مبنی نہیں، بلکہ ادب کے ایک قاری کی حیثیت سے جدیدیت اور جدید حسیت پر میرے طرز احساس و ادراک کی تفسیر ہے۔ واضح رہے کہ افکار بڑی حد تک مشہور و مستند علمائے فلسفہ و ادب سے مستعار و متاثر ہیں، لیکن طرز احساس و اظہار میرا ہی ہے۔''

اوپر لکھا گیا ہے کہ لطف الرحمٰن ترقی پسندی کا سفر کرتے ہوئے جدیدیت کے خارزار و ناپیدا کنار صحرا میں داخل ہوئے تھے اور اس فکر کے اساس گزاروں سے ان کے رشتے بہت مستحکم اور ناقابل شکست حد تک استوار تھے، مگر اس کے باوجود انھوں نے نقد و ادب کی دنیا میں کسی کی اجارہ داری قبول نہیں کی۔ وہ ایک بے باک، نڈر، مروت سے آزاد، حوصلہ مند اور جری ناقد تھے۔ وہ ہما شما تو کیا، تنقید کے ستونوں کو بھی آنکھیں موند کر ماننے کے قائل نہیں تھے۔ سبھی کا حساب بے باق کرنا جانتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ وہ ابتدا میں ترقی پسند رہے اور ان کی انتہا بھی ترقی پسندیت سے قربت پر ہوئی، بیچ میں مغرب پرست تحریک جدیدیت کی فضا سازی میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا، مگر یہ سکے کا صرف ایک رخ ہے، اس سکے کا دوسرا رخ کچھ اور ہی بیاں کرتا ہے۔ انھوں نے نظریات و خیالات کی زنجیریں پیروں میں ڈالنا گوارا نہیں کی، بلکہ اپنے طائر فکر و تخیل کو نئے جہانوں میں اڑان کے لیے آزاد رکھا۔ نظریات و افکار کی چمک دمک سے متاثر تو ہوئے کہ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے، مگر وہ مرعوب و مبہوت نہیں ہوئے۔ بنے بنائے فرسودہ نظریات کا سینہ چاک کر کے نئے معیار و اقدار کی عمارت انھوں نے کھڑی کی۔ ان کی تنقید پر جدت و ندرت کی چھاپ گہری تھی۔ ان کی فکر اور سوچ بھی نئی تھی اور الفاظ و اظہار کی دنیا بھی جدت کے وصف کی حامل تھی۔ وہ ادب و تنقید کو ایک کھلا در سمجھتے تھے، جس سے ہمہ وقت باد صبا کا جھونکا آتا رہتا تھا، وہ شعر و ادب کی تخلیق کو تفریح نہیں، عبادت و ریاضت کا درجہ دیتے تھے۔ انھوں نے کئی ایسے اہم تنقیدی مضامین لکھے، جن سے اردو ادب میں نئی بحث کے در وا ہوئے اور اردو قارئین کو فکر و سوچ کے زاویے بدلنے کا موقع میسر آیا۔

ایجاب و انحراف کے کلیے سے کوئی فرد بشر مستثنیٰ نہیں ہوتا۔ ہم ان کی پیش کردہ فکر اور ذہنی وابستگی پر حرف رکھ سکتے ہیں کہ تنقید اور بحث و مباحثہ کا در کبھی مقفل نہیں ہوتا، تنقید و تحقیق میں حرف آخر بہت کم آتا ہے، مگر ہم ان کے بے پناہ تخلیقی اور ادبی شعور کی پذیرائی تو کر سکتے ہیں۔ ان کے مواد پر انگشت نمائی کی راہیں کھلی ہیں، مگر ان کی پختہ زبان اور رواں بیان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں نئی نسل کے لیے ادبی میراث کا مرتبہ رکھتی ہیں۔

لطف الرحمٰن تنقید کی دنیا میں قطب نما تھے، انھوں نے ادب میں خطرات و خدشات مول لے کر کتنوں کے لیے گنجائش پیدا کی، بہتوں کی علمی اور ذہنی پرورش کی، انھیں مہمیز کیا، آگے بڑھایا، ہر تحریک میں بھی ان کا کھلے دل سے استقبال ہوتا رہا، ان کی تحریروں کو جدیدیت کے محرکات و مسببات اور ممکنات و مضمرات کے حوالے سے بھی استعمال کیا گیا اور ترقی پسندوں نے ان کے ذریعے اٹھائے گئے مسائل و مباحث کا مارکسزم سے مصافحہ و معانقہ بھی کرایا، مگر سوال یہ ہے کہ اتنی متنوع خدمات کا انھیں کیا صلہ ملا؟

لطف الرحمٰن جیسے جینیس اور ہمہ جہت فن کار اور مقبول شاعر و ناقد کو بھی ہماری بزم تنقید نے نظر انداز کر دیا۔ بعد از مرگ فراموش کاری ہماری زبان کا ایک ایسا المیہ ہے جس کا فوری محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اردو تنقید کا کوئی اور مرد آہن اس تنگ نظری کا شکار نہ ہو۔

■

Abrar Ahmad
At+Post Ijra, Via Raiyam Factory
Distt.: Madhubani- 847237 (Bihar)
Mob.:9910509702 ,8651708079

حنا افشاں

خواتین افسانہ نگار
انیسویں صدی کے نصف آخر سے

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہر چھوٹی بڑی تحریک کے پس منظر میں صنف نازک کا دست عمل کارفرما نظر آتا ہے بظاہر وہ منظر عام پر نہیں آتی لیکن ہر تحریک میں اس کا اثر جاری وساری ہے زندگی کے ہر شعبے میں عورت کا دخل رہا ہے یورپ ہو یا ایشیا، عرب ہو یا عجم، عالمی سطح پر، ثقافت علم وہنر یا پھر ادب ہر شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

ابتدائی زمانے میں عورت اور مرد کا رشتہ برابری کا تھا تاریخ کا وہ ابتدائی زمانہ یاد کریں جب مادری نظام رائج تھا، لیکن سماج جیسے جیسے ارتقا کی منازل طے کر رہا تھا ویسے ویسے عورت اپنی اصل مساویانہ حیثیت کھوتی چلی جا رہی تھی آہستہ آہستہ مردوں کا عورت پر تسلط بڑھتا چلا جا رہا تھا نتیجے کے طور پر عورت محکوم ہوگئی اور پدرانہ نظام قائم ہوتا چلا گیا۔ مردوں کا تسلط اس حد تک قائم ہوا کہ زبان بندی کو عورت کے لیے وقار سمجھا گیا۔

''خاموشی عورت کو مناسب وقار عطا کرتی ہے۔''

—— سوفکلیز

ادب کی دنیا میں قدم رکھنا تو دور عورت کو اپنے احساس و جذبات کا برملا اظہار بھی معیوب سمجھا گیا۔ مگر وقت نے کروٹ لی اور انیسویں صدی تک آتے آتے تعلیم کے فروغ اور مختلف تحریکوں کی ملی جلی آوازوں نے مرد کی بالا دستی کے باوجود عورت نے بھی اپنی قابلیت اور لیاقت کا لوہا منوا ہی لیا ہندوستانی ادب بھی اس سے اچھوتا نہ رہ سکا۔ عورت فطرتاً قصہ گو ہوتی ہے اپنے بچوں کو اصل یا فرضی قصے کہانیاں سنانا عورت کا بہترین مشغلہ رہا ہے یہ عورت ماں ہو یا دادی، نانی اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت نے عورت کو ام القصص بنایا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ اگر یہی عورت قصہ کہانی لکھتی ہے تو اسے معیوب قرار دیا جاتا ہے:

''نانی اماں کہانی سنائیں اس روایت کو ہر نئے پرانے نے مانا مگر نانی اماں خود اپنی کہانی لکھیں اس پر نئے اور پرانوں نے تیور بدلے، تیوریاں چڑھیں، انگلیاں اٹھیں، فسانے کے فسانے بنیں، عزت کو بٹہ لگا، گھر کی بات دہلیز کے باہر نکلی، آنکھوں دیکھی کانوں نے سنی لفظ کا لباس پہن کر بے نقاب ہوئی۔''

(خواتین افسانہ نگار 1930 سے 1990 مرتب کشور ناہید، ص 6)

عورت کا لکھنا مذہبی اور معاشرتی رسوائی کا سبب تھا، مگر عورت کے اندر اپنی شناخت قائم کرنے کی تڑپ اور خود داری نے اسے اکسایا اب وہ اپنے اندر چھپے ہوئے سوالوں کے جواب چاہتی تھی۔

انیسویں صدی کے آخر سے خواتین کے لکھنے کی ابتدا قصہ کہانیوں سے ہوئی۔ خواتین کہانی کاروں میں اکبری بیگم، محمدی بیگم، صغریٰ ہمایوں، خاتون اکرم، عباسی بیگم، مسز عبدالقادر اور نذر سجاد حیدر قابل ذکر ہیں اور یہی وہ خواتین ہیں جنھوں نے تمام خواتین کو حوصلہ اور اعتماد دیا۔

عورت کی آواز کی گونج رسائل میں سنائی دینے لگی اب خواتین کی خاصی تعداد نکل کر سامنے آئی، عورت کے احساسات، جذبات اور مسائل فن میں ڈھل کر اردو ادب کی مختلف اصناف میں بکھرنے لگے۔

مذکورہ خواتین اس وقت مرد حضرات کی مقلد تھیں مگر ان کے اندر کی بے چینی اور کشمکش کو صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ وہ چہار دیواری کی قید بندیوں کو قبول نہیں کر پا رہی تھیں اور نتیجے کے طور پر 'گودڑ کا لال' جیسے افسانے منظر عام پر آئے۔ ان خواتین کے قلم کے ذریعے گھریلو زندگی کے بہت سے مسائل سامنے آئے۔ مثلاً بچپن کی شادی، مرد کی دوسری شادی، بیوہ عورت کا درد وغیرہ کو موضوع بنایا۔

اس کے بعد کا دور، ان افسانہ نگاروں سے ایک قدم آگے کا دور تھا۔ اب خواتین مرد حضرات کے اصلاحی اور مقصدی مشن سے بغاوت کر کے ان سوالات کے جواب چاہتی تھیں جو ان کے دل و دماغ میں کوندر ہے تھے ان کے ذہن کی اس کشمکش اور تصادم نے انھیں زمانے کے مصلحین سے سوال کرنے پر مجبور کر دیا رومانی تحریک کے زیر اثر بہت سی کہانیاں وجود میں آئیں۔ اس کی ایک بہترین مثال 'بیار غم' ہے۔ اس افسانے میں حجاب امتیاز علی کے باغیانہ تیور صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔

''اللہ کیا مشرقی لڑکی محض اسی لیے پیدا ہوئی کہ وہ دوسروں کی خوشیوں پر بھینٹ چڑھا دی جائے؟ کیا اسے خود اپنی زندگی کے معاملے میں بھی دخل دینے کا اختیار نہیں، کدھر ہیں وہ ریفارمر جو قوم کے آگے لمبی لمبی تقریریں کرتے اور بہبودی قوم کا ترانہ بڑے زور شور سے گاتے ہیں۔ اسٹیجوں پر کھڑے ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ قومی درد جتانے والے ریفارمر کدھر ہیں؟ وہ گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ انھوں نے اپنی ماؤں کے لیے کیا کیا؟ لڑکیوں کے لیے کیا کیا جو کل قوم کی مائیں بننے والی ہیں کیا ان کا، ہمدردی اور قوم کے عشق سے لبریز دل مظلوم لڑکیوں کی آہ سے تھرا نہیں اٹھتا، کیا ان کی تمام ہمدردی تمام درد محض فرق رجال ہی تک محدود ہے؟ تو پھر یہ بزرگ کس منہ سے قوم کے امام بنے پھرتے ہیں پھر وہ کیوں اس نام سے منسوب کیے جاتے ہیں کیا وہ عورت کو قوم سے خارج سمجھتے ہیں کیا قوم صرف مردوں ہی کے احتجاج کا نام ہے اے خدا ان بزرگوں نے ہمارے لیے کیا کیا، کچھ بھی نہیں کیا آہ کچھ بھی نہیں کیا۔ ان سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہم کو زندگی کے اس نازک ترین مسئلے میں رائے دینے کا اختیار دے دیں۔ جس پر ہر مرد اور عورت کی آئندہ خوشیوں کا انحصار ہوتا ہے۔

(خواتین افسانہ نگار 1930 سے 1990 مرتب کشور ناہید، ص 42)

اب یہ چنگاری دھیرے دھیرے شعلہ بن رہی تھی بغاوت کی لہر تیز ہوئی اور اسی زمانے میں انگارے والی رشید جہاں منظر عام پر آگئیں۔ رشید جہاں کے خلاف فتوے بھی جاری ہو گئے مگر ڈاکٹر رشید جہاں جو پیشے سے ڈاکٹر تھیں معاشرے کی سسکتی بسورتی مظلوم عورتوں نے ان سے دیوار کے پیچھے، سودا، چھدا کی ماں جیسے افسانے لکھوا لیے۔ رشید جہاں کی عورت اپنی منفرد شناخت چاہتی تھی۔

انیسویں صدی کے آخر سے عہد حاضر تک اپنے علمی وجود کو ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش ہوتی رہی۔ اب یہ کارواں چل پڑا حجاب امتیاز علی، رشید جہاں، مسز عبدالقادر، شکیلہ اختر، صالحہ عابد حسین، صدیقہ بیگم وغیرہ زمانی طور پر رشید جہاں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان خواتین نے جو براہ راست ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئیں ان میں اہم نام رضیہ سجاد ظہیر کا ہے۔ دھیمے اور نرم لہجے میں اپنی بات کہنے والی یہ افسانہ نگار رشید جہاں جیسی بے باکی تو نہیں رکھتی مگر ان کے

افسانوی مجموعے اللہ کی مرضی، رنگ روتے ہیں سے ان کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے۔ وہ عورت کو خوددار خوداعتماد اور خودکفیل دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ عورت کی معاشی آزادی کی طالب ہیں۔

تحریک نسواں اور حقوق نسواں کی عمارت کا سنگ میل رکھنے والی رشید جہاں کی آواز کی گونج بعد میں آنے والی خواتین افسانہ نگاروں نے صاف سنیں اور عورت کے بے جان جسم میں روح پھونکنے کا کام رشید جہاں نے کیا اور اس روح کو حیات جاودانی دینے والی خاتون عصمت چغتائی ہیں۔

عصمت کے قلم کو تلوار کی سی تیزی عطا کرنے والی رشید جہاں ہیں۔ عصمت لکھتی ہیں:

''جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا ہے۔ ان کی بھرپور سماجی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی عورت، ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا میرے مذہب میں جائز نہیں عشق مقوی دل و دماغ ہے جی کا روگ نہیں۔

(آپ بیتی فن و شخصیت عصمت چغتائی)

عصمت چغتائی کی ست رنگی فکر نے انھیں ایک ایسا رنگین پیراہن عطا کیا جس میں عورت سے ہمدردی، محبت ان کے مسائل کا احساس، قید بندی، جنسی گھٹن اور عورت کی نفسیات شامل ہے۔ مگر ان عنوانات کو بے خوف وخطر لکھنا یہ عصمت کا جگر ہے۔ لحاف، دو ہاتھ، ننھی کی نانی، بچھو پھوپھی اور ہندوستان چھوڑ دو اس کی خصوصی مثال ہیں۔

جنس نگاری میں واجدہ تبسم عصمت کی پیروی کرتی ملیں لیکن واجدہ تبسم کے افسانوں میں وہ نفاست اور پاکیزگی نہیں جو عصمت کے یہاں ہے۔ اترن، جھوٹن، نولکھا ہار اسی طرز کے افسانے ہیں۔

خدیجہ مستور نے روایت کی پیروی کی ان کے افسانے کی عورت تعلیم یافتہ ہے، سیاسی شعور رکھتی ہے جنسی گھٹن اور طبقاتی تقسیم جیسے موضوعات بھی ان کے قلم کی زد میں ہیں۔

ہاجرہ مسرور بھی ہائے اللہ، تل اوٹ پہاڑ، نیلم، میرا بھائی، فیروزاں اور بندر گھاؤ جیسے افسانوں کے ذریعے ادب میں اپنا منفرد مقام بنا چکی ہیں افسانہ بندر گھاؤ کے ذریعے وہ اس دوغلے معاشرے پر کاری ضرب لگاتی ہیں جہاں مرد کا ہر گناہ معاف مگر عورت کو اس کے ناکردہ گناہوں کی بھی ایسی سزا دی جاتی ہے کہ روح کانپ اٹھے۔

کتنے ہی مہینے گزر گئے اس واقعے کو وہ سمجھتی تھیں جس طرح بڑے بھائی کی عیاشیاں 'سیانے ہیں' یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہہ کر بھلا دی جاتی ہے، اسی طرح اس کے عزم گناہ کو بھی فراموش کر دیا جائے گا۔ لیکن پگلی عورت کی حیثیت کو بھول گئی۔ عورت ایک کٹھ پتلی ہے جس کی ڈور سماج کے کوڑھی ہاتھوں میں ہے اور ان کوڑھی ہاتھوں میں جب چل ہونے لگتی ہے تو ڈور کے جھٹکوں سے کٹھ پتلی نچائی جاتی ہے لیکن اگر اس کٹھ پتلی میں جان پڑ جائے تو سماج کا لوتھ پڑا ہوا سڑاندھ جسم کس سے دلچسپی لے؟ وہ سوچتی کہ جس طرح اس کے گھر والے اس کے جوانی کے تقاضوں کی طرف سے کان بہرے کر کے بیٹھ گئے ہیں اسی طرح اس واقعے کو بھول کر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں گے۔ مگر یہ محض اس کا خیال تھا اس کے فرشتہ صفت سرپرستوں کی نظر میں اس کی زندگی پر گناہ کی جو خراش آ گئی تھی بھلا وہ بھی مندمل ہو سکتی تھی۔

(خواتین افسانہ نگار 1930 سے 1990 مرتب کشور ناہید ص 54)

انگریزی اور فرانسیسی ادب و تنقید سے واقفیت رکھنے والی ممتاز شیریں افسانہ نگار بھی ہیں اور ناقد بھی آپ کا پہلا افسانہ 'انگڑائی' ہے۔ یہ افسانہ معاشرے کی نفسیاتی جنسی گھٹن کو پیش کرتا ہے۔ جہاں مرد ایک شجر ممنوعہ ہے افسانوں کا پہلا مجموعہ اپنی نگریا کے عنوان سے شائع ہوا ممتاز شیریں کی تنقیدی صلاحیت نے ان کے افسانوں کو سنجیدگی اور پختگی عطا کی۔ 'میگھ ملہار' تک آتے آتے یہ پختگی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

تقسیم اور ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں جمیلہ ہاشمی کے افسانے 'آتش رفتہ' اور 'بن باس' خصوصیت کے حامل ہیں عورت کی روحانی تنہائیوں کو ان افسانوں میں جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ صرف ایک خاتون افسانہ نگار کے لیے ہی ممکن تھا۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی عورت جذباتی اور ذہنی طور پر طاقتور ہے جو مرد اور مرد کی دنیا دونوں کے ساتھ بلا جھجک قدم بڑھا رہی ہے۔ جیلانی بانو لکھتی ہیں:

قرۃ العین حیدر نے افسانے کو عورت کے ایسے کردار دیے جو دنیا کی تہذیب کو اور ان کی تبدیلیوں کو سمجھتی ہے وہ باشعور، صاحب رائے، اور عالمی ادب اور تاریخ پر نظر رکھتی ہے۔ ایسی عورت جو ایک طرف زندگی کی تیز رفتاری میں شریک ہے اور دوسری طرف اپنی ذات کے دکھ اور خاندان اور معاشرے کے دباؤ کو بھی سہتی ہے ان کے افسانوں خصوصاً ہاؤسنگ سوسائٹی، سیتاہرن، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو، میں ہمیں زندگی اسرار کھوجتی ہوئی ہندوستانی عورت کے مختلف کردار ملتے ہیں۔

بلاشبہ قرۃ العین حیدر نے افسانوں کو عالمی ادب کی سطح پر پہنچا دیا اور قصہ گوئی کے فن کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد بھی افسانہ نگار خواتین میں خاص طور پر ذکیہ مشہدی، بشریٰ رحمن، زاہدہ حنا، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کو بے حد اہمیت حاصل ہے دور حاضر کی افسانہ نگاروں میں نگار عظیم، ترنم ریاض، غزال ضیغم، نعیمہ ضیاء الدین، قمر جمالی، صادقہ نواب سحر، ثروت خان وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے اور ادب کو ان سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔

اس مختصر جائزے سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواتین افسانہ نگار مسلسل جد و جہد کے سبب ابتدائی منزل سے مرد حضرات کے ساتھ ساتھ اصلاحی، رومانی حقیقت پسند افسانہ لکھتی آ رہی ہیں وقت اور حالات تبدیل ہوئے تو عورت کے احساسات اور جذبات میں بھی تبدیلی آئی خاتون افسانہ نگاروں نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور ایک وقت آیا جب ایک تعلیم یافتہ باشعور اور سنجیدہ عورت کہانی کا موضوع بنی۔

آج کی اس تیز رفتار زندگی میں مشینی دور نے افسانوں کو نئے عنوانات اور نئے رنگ و آہنگ عطا کیے ہیں۔ خواتین افسانہ نگار سیاسی، سماجی، دہشت گردی جیسے نازک مسائل پر قلم اٹھا رہی ہیں آج کی افسانہ نگاری کی کہانی روایت سے ہٹ کر عورت کی شناخت اس کی آزادی اور حیثیت کا مسئلہ ہے اس کی کہانی فن اور فن کار کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں کو پیش کر رہی ہے۔ عہد حاضر کی کہانی کار قدیم سماجی روایات، قید بندی، پابندیاں، قدامت پسندی، ظلم و ستم اور عورت کی ناقدری پر ماتم نہیں کر رہی بلکہ بغاوت کا اعلان کر رہی ہے۔

مگر جہد مسلسل کے باوجود خواتین آج بھی فرسودہ سماجی قدروں کا شکار ہیں۔ مرد افسانہ نگاری کی اس بھیڑ میں عورت کو اوسط درجہ دے کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ مولوی نذیر احمد، راشد الخیری، پریم چند وغیرہ نے اصلاح خواتین کے لیے بے شک بہت کوششیں کیں لیکن وہ بھی عورت کے فکری نہاں خانوں تک نہ پہنچ سکے۔ عورت کی نفسیاتی کشمکش جنسی، معاشی، معاشرتی اور گھریلو مسائل کو سمجھنے اور اس کی دکھتی ہوئی نبض پر ہاتھ رکھنے کا کام خواتین افسانہ نگاروں نے ہی کیا ہے۔ اب خواتین افسانہ نگار بہت آگے نکل آئی ہیں دور جدید میں ان کے افسانوں میں نئے رنگ، جذبات، احساسات اور وہ نفسیاتی پہلو نظر آتے ہیں جو اب سے پہلے نہیں تھے یہ طرز افسانہ نگاری کو نئی جہت عطا کرتا ہے۔

■

Dr. Hina Afshan
Dayanand Girls P G College
Kanpur- 208001 (UP)
Mob.:8840555327

کلام آبرو کا لسانیاتی مطالعہ

سرفراز جاوید

نجم الدین شاہ مبارک آبرو شمالی ہند کے اولین اردو شعرا میں منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات و کوائف کے تعلق سے کسی بھی تذکرہ نگار کی تحریر سے خاطر خواہ وضاحت نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ محققین نے بھی تذکرہ نگاروں سے آبرو کے بارے میں کافی اطلاعات نہ ملنے کے باعث پیدائش کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی ہے۔ ہاں ان کی سنہ وفات کے تعلق سے کئی مصدقہ معلومات ملتی ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کے کلیات یا دیوان کے ہنوز سات مخطوطے دریافت ہو چکے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق کے ذاتی علمی مخزونہ میں 'دیوان آبرو' کا مخطوطہ ہے۔

آبرو کے کلام میں لسانی اہمیت کے مدنظر چند معروضات پیش ہیں۔ ان کا عہد ریختہ یعنی اردو کا تشکیلی دور تھا۔ اردو زبان اپنے وجود کے ساتھ فروغ کی راہ پر گامزن تھی۔ فارسی کے اثرات کم ہونے لگے تھے۔ خواص بھی اردو کو منہ لگانے لگے تھے۔ دکن میں ولی نے ریختہ گوئی میں اپنا سکہ جما دیا تھا۔ ان کی دلی آمد سے قبل ہی دہلی کے ادبا اور شعرا نے ان کے کلام کو خوش آمدید کہا۔ اور اس کے تتبع کو غنیمت جان کر فارسی کو چیلنج کر دیا۔ آبرو، حاتم اور ناجی وغیرہ نے ریختہ گوئی میں اپنے مافی الضمیر کا بھرپور اظہار کیا اور خوب کیا۔ ان حضرات کے کلام کے سرسری مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ کسی بھی زبان میں جملوں کی ساخت بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اردو زبان کے جملوں کی ساخت کھڑی بولی کے طرز پر ہے۔ جو دلی کے گرد و نواح کے عین مطابق ہے۔ اسی فضا و ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے آبرو نے فارسی سے انحراف کرتے ہوئے یہ اعلان کیا۔

وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
ان سبھی کہتا ہوں بوجھو سرف میرا زرف (ظرف) ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں افعال اس کے ریختے میں حرف ہے

شاہ مبارک آبرو کا یہ اعلان عوام کے لب و لہجہ کا لسانی اعتراف تھا۔ اس عہد کی عوامی زبان سے شغف رکھنے والے شعرا نے فطری تقاضے کے باعث آبرو کو اپنے ہم خیال پایا۔ انھوں نے آبرو کی حمایت کے ساتھ اردو کو فارسی کے مقابل لانے کی شعوری کوشش بھی کی۔ یہ لسانی رجحان ریختہ یعنی اردو کے وجود اور ارتقا میں بے حد مفید ثابت ہوا۔ اردو زبان عربی، فارسی اور علاقائی لفظیات کو اپنے مزاج کے مطابق تشکیل دے رہی تھی۔ مزید اس کی لطافت اور شیرینی بھی دو چند ہو رہی تھی۔ اس کی کشش نے اشرافیہ طبقے کو بھی اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا، جس کے باعث شعر و سخن میں انقلاب آفریں ماحول بن گیا۔ حتیٰ کہ تمام طبقات کے عوام و خواص میں سخنور پیدا ہونے لگے۔ انھوں نے تخلیقی ادب کو حد درجہ فروغ بخشا۔ اردو زبان میں تھوڑے عرصے میں ہی بڑے فنکار یعنی سخن ور پیدا ہوئے، یہ اردو زبان کے لیے بڑا اعجاز تھا۔ بقول عبدالحق:

''دیکھتے دیکھتے شاعری میں انقلاب پیدا ہو گیا، ہر طبقے اور ہر پیشے سے اہل فن پیدا ہونے لگے۔ پہلے ہی دور میں شعرا کی کہکشاں کا ظہور ہوا۔ انھوں نے اردو کے تخلیقی ادب کو مہمیز کیا اور توانائی بخشی۔ تھوڑے ہی عرصے میں یعنی نصف صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ شاعری کے عہد زریں کا وجود و نمود حیرت فزائی کا سبب بنا، زبان کے آغاز اور عہد زریں میں زمانے کا بہت کم فاصلہ ہے۔ مگر شہ پاروں کی وقعت و کثرت ایک عجوبہ سے کم نہیں ہے۔ کم و بیش صرف نصف صدی میں ایک گرتی پڑتی زبان کا یہ عروج اور استعداد حاصل کرنا شاید دنیا کی ادبی تاریخ میں تنہا مثال ہو۔ اردو، فارسی کے روبرو کھڑی ہو گئی۔''

(دیوان زادہ، مرتبہ عبدالحق، ناشر نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، 2011، ص 53)

ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو دہلی کے عوام اور سخنوروں نے اسے آسمانی صحیفہ سمجھ کر استقبال کیا۔ جس کے باعث دہلی کے ہر طبقے و پیشے سے تعلق رکھنے والے شعرا پیش پیش نظر آنے لگے۔ شاہ مبارک آبرو، حاتم، شرف الدین مضمون، مرزا مظہر جان جاناں، شیخ احسن اللہ بیاں، میر شاکر ناجی اور یک رنگ وغیرہ نے عوامی زبان و بیان میں ریختہ کو فروغ بخشا۔ پروفیسر عبدالحق اس عہد کی عوامی زبان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''عوامی بول چال کو معیار مقرر کیا گیا۔ یہی زبان کا فطری بہاؤ صحیح میلان اور اصولی تقاضا تھا۔ الفاظ کے مرقع بول چال کے صوتی نظام سے مربوط تھے۔ عوام کی زبان خراد یا ٹکسالی تھی۔ اس خراد پر الفاظ بنتے اور ڈھلتے تھے۔ پھر قبول عام میں چلن پا کر درجۂ استناد کو پہنچتے تھے۔ یہی زبان اور تلفظ شاعری میں تخلیقی عمل کا فطری جز قرار پایا۔'' (ایضاً، ص 54)

ہر عہد کے عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی شاعر و فنکار کرتے رہے ہیں۔ وہ اس عہد کی زبان سے فطری طور پر واقف ہوتے ہیں۔ آبرو، حاتم، شرف الدین مضمون وغیرہ کا کلام زبان کی ابتدائی صورت حال کے ساتھ اردو زبان کے لسانیاتی ارتقا کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آبرو صاحب دیوان شاعر ہیں۔ انھیں عوامی زبان اور اس کے متعلقات سے بڑی واقفیت تھی۔ شاہ مبارک آبرو اور حاتم کا دور ایک ہی ہے دونوں سخنور اپنے عہد اور اردو ادبی تاریخ کے بڑے معتبر نام ہیں۔ پروفیسر عبدالحق حاتم کے حوالے سے زبان و بیان کے بارے میں لکھتے ہیں جس کا اطلاق ہم آبرو کے کلام میں مستعمل الفاظ پر بھی کر سکتے ہیں۔ عوام کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے تحریر کیا ہے:

''یہی جمہوریت کی متابعت تھی جس نے ابتدائی کلام کو جمہور کی ترجمانی کے لیے مجبور کیا تھا۔ وہ جمہور جو ابھی صوتیات کی تراش خراش کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی بلکہ وہ تلفظ اور تحریر میں کسی فرق کی روادار نہ تھی۔ حاتم کے یہاں ایسے الفاظ کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ وو، اوس، اوتر، اوپر اوٹھ اوسے اوجالا اوتار اونے اوڑے اوٹھوں جیسے الفاظ زائد وا کے ساتھ مستعمل تھے۔ بعد کی اصلاحات نے اسے حذف کر کے پیش کی آواز برقرار رکھی اور یہ متروک سمجھے گئے۔ سیں سوں کوں چوں، توں، جیوں تیں، تئیں، سیتی، کبھو، کسو، تک، کن، لکن، کتے، آگیں، مجے، مج، منے، کثرت استعمال سے زبان کا جز بن چکے تھے۔ اس دور کی شاعری میں یہ متروکات کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔'' (ایضاً، ص 55)

بالا اقتباس میں مذکورہ باتوں کے متعلق یہ عرض کرنا برمحل ہے کہ الفاظ کی املائی صورت یعنی رسم الخط، اہل سخن

اور پڑھے لکھے حضرات نے تحریر و گفتگو میں متروک کر دیا ہے۔ جس سے اردو زبان کا معیار متعین ہوتا ہے۔ مگر یہ الفاظ ہنوز دہلی اور اس کے گرد ونواح کے عوام کی بول چال میں فطری طور پر رواں دواں ہیں۔ جن کے اثرات سے ان علاقوں کے پڑھے لکھے حضرات بھی بے تکلف گفتگو میں ان الفاظ کی ادائیگی میں بولی کے فطری لہجے کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور زبان داں طبقہ اہل زبان کے فطری لہجہ یعنی اردو زبان کے خاص مجہول لہجے کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ مزید طرفہ تو یہ ہے لسانی جہالت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے ان پر استہزا بھی کرتا ہے۔ مزید بہت سے الفاظ کو انفیا نے یعنی ناک میں صوت کی گردش ہونا نہ صرف اس عہد میں رائج تھا بلکہ دہلی کے قرب وجوار میں آج بھی عوام میں رائج ہے۔ اس انفیانے کے میلان کے بارے میں پروفیسر عبدالحق رقم طراز ہیں:

''لفظوں کی دوسری صورت بھی دیکھنے میں آتی ہے جن میں بعض آوازیں زاید تھیں اور ان کا عام تلفظ بھی صوتیات سے ہم آہنگ تھا۔ تھنبا، چونبا، کونچے، گانو، ماناں، ناں، آناں، نانوں، سنتیں، اپناں، میں بھی انفیانے کا میلان موجود ہے اور بعد میں کچھ صورتوں میں یہ آواز 'م' سے تبدیل ہوگئی یا نون حذف ہوگیا۔'' (ایضاً، ص 55)

دراصل کسی زبان میں لسانیاتی سطح پر عوامی بول چال کے ذریعے تبدیلی اور ارتقا کے ساتھ لفظ اپنی ساخت اور تلفظ کی نوتشکیل سے گزرتے رہتے ہیں۔ جس سے انکار ممکن نہیں اور بہت سے الفاظ صدی درصدی بھی عوام میں اپنی آواز کی اصل کو برقرار رکھتے ہیں پھر بھی وہ لغت کا حصہ نہیں بنتے یا بنائے نہیں جاتے۔ ہمارے اردو کے ابتدائی معتبر شعرا کے یہاں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں بلکہ ان کی شاعری میں اپنے صوتی لب ولہجے میں ہی اچھے لگتے ہیں مگر وہ متروک ہیں۔ مگر عوام کے لسانی لہجے میں تین صدی کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی بدستور رائج ہیں۔ پروفیسر عبدالحق ایسے لب ولہجے کو فن میں فطری سادگی کا مرقع تسلیم کرتے ہیں:

''بول چال کی یہ زبان لب ولہجے میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اس کا تعلق لغت سے کم تھا۔ یہی لب ولہجہ شاعری میں بھی رائج تھا جس کی وجہ سے فن میں فطری سادگی وپرکاری کے مرقعے دکھائی دیتے ہیں۔ صوتیات میں آواز ہی اصل ہے باقی فروعات ہیں اور آواز وہ جو استعمال عام میں ہے۔ اسی آواز سے زبان کی تشکیل ہوتی ہے۔ حاتم نے ایسے الفاظ کے تلفظ کو اصل املا سے مطابقت دی ہے۔ گویا تقریر وتحریر کا فرق بے بنیاد دکھائی دیتا ہے، یہ اس دور کی لسانی خوبی ہے اور ولی، آبرو وغیرہ کے یہاں عام ہے مصطفا، مرتضا، مجتبا، کسائی، چمیلی، تسی وغیرہ۔'' (ایضاً، ص 55)

آبرو اور ان کے عہد کے شعرا میں زبان کے تعلق سے بڑی بیداری تھی۔ انھوں نے دیگر زبان کے الفاظ کے املے اور تلفظ میں تصرف رواں رکھا، جو دہلی اور گرد ونواح کے فطری لہجے کے مطابق تھا۔ مگر بعد میں زبان دانوں کی تحریک کے باعث ایسے الفاظ اصلاح کی خاطر کالعدم قرار دے دیے گئے اور اہل زبان علماً نے بھی اسے لبیک کہا مگر عوام کی صورت حال آج بھی جوں کی توں دکھائی دیتی ہے۔ اس بحث سے قطع نظر آبرو اور حاتم کا عہد ایک ہی ہے اور زبان کے تعلق سے دونوں کا لسانی مزاج یکساں ہے۔ تو ان کے یہاں الفاظ وحروف کا استعمال بھی عین فطری یکسانیت رکھتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنے مطالعے اور علم ودانش کی رو سے حاتم کے کلام میں استعمال کیے گئے الفاظ پر طویل بحث کی ہے جو آبرو کے کلام پر بھی صادق آتی ہے۔

زبانیں قدیم ہوں یا جدید سب بنی نوع انسان کی بول چال سے وجود میں آئی ہیں اور سب زبانوں نے کم و بیش اپنے قریب کی زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک دوسری زبان کے الفاظ میں املائی، تلفظی اور معنی کے اعتبار سے فطری طور پر تصرف کرلیا ہے۔ اردو زبان نے براہِ راست فارسی اور عربی کے ذخیرۂ الفاظ سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ مگر ان الفاظ کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کا بڑا کام ہمارے شعرا وادبا نے کیا ہے۔ اسی طرح دیگر زبانوں میں ترکی، پنجابی، سنسکرت کے الفاظ بھی اپنے خمیر کے مطابق تبدیل کیے ہیں۔ اردو زبان دیگر زبانوں کے باہمی رشتے اور ان کے الفاظ کی آمیزش سے تشکیل پائی۔ آبرو اور ان کے معاصرین نے اردو زبان کی نشوونما میں بڑی توجہ صرف کی۔ آبرو کے کلام میں ہندوستانی یعنی دہلی وگرد و نواح کا ماحول اور عوام کا لب ولہجہ اچھی طرح منتقل ہوگیا جو اردو کا خاص اسلوب بھی ہے۔ آبرو کے کلام میں اردو زبان کا فطری حسن اپنی دلکشی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جس میں خاص طور سے اسلامی اور ہندوستانی تہذیبوں کی آمیزش بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی امتزاج سے اردو کی بنیاد ہموار ہوئی۔ آبرو اور ان کے معاصرین کے کلام میں ہندوستانیت کا رچاؤ بساؤ اپنے لطیف حسن کا غماز ہے۔ وہ الفاظ اہل زبان کو آج بھی نہ گراں گزرتے ہیں اور نہ ہی غیر مانوس محسوس ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ جو زبان داں طبقے کے ذریعے متروک قرار پائے اور اہل زبان اشرافیہ طبقے نے بھی ان متروکات کو قبول کیا۔ یہ الفاظ عوام کے فطری جذبے میں آج بھی رچے بسے ہیں۔ الفاظ کا مطالعہ کیجیے:

آؤنا، آلا، اڑسنا، انمناہٹ، امول، اچرج، اناڑی، انوٹھا، اگن، اتیت، اکھیاں، اوپھنتا، اندھیاری، اجان، اہیر، ایس، بان، برن، بالم، برہ بر، بچن، بیوڑا، بس ملا، برکا، برہن، بڑمارنا، باؤلی، بھاؤنا، بھانت، بھال، بھسم، بجھالے، بھونچال، بیڑے، پھوہا، پھپھولا، پھندیت، پچھڑنا، پریاں، پنتھ، پن، تسی، تماکو، تاڑنا، تجا، ٹھاٹھ، ٹھٹھک، ٹھکرا، ٹھاڑا، ٹھاڑی، بگ، جھمکی، جنگلا، جی کھپانا، چیتا، چنچل، چلبلا، چھتیوی، چاؤں، چھٹکی، درس، دیوڑا، دیہہ، دوالی کا دیا، دوش دینا، دبدبا، دھمال، دھس کر، دنگل، دھڑی، ڈھنڈال، راوت، رسیا، رکھاوٹ، رکت، رجھانا، دسرت، سوہا، سنمکھ، سدھ، سگھڑ، سٹکنا، سبدھی، سادھنا، سریجن، سمرن، سبارش، سوہنے، سناہنا، کنچنی، کنڈل مارنا، کال، کاڈھ، کش، کنٹھا، کاڑھا، کوڑی، کھیوا، کٹار، کدو، کھویا، کاجر، کپٹ، کالک، گیان، گیتا، گھنڈی، گٹکنا، گورائی، گپ چپ، گودنا، گور، گھٹا، مکھ، مگن، مورکھ، نام دھروانا، نگر، نکٹ، نیاری، نراشی، ہاٹ، ہٹ دھرم وغیرہ۔

آبرو کے دور میں اسما کی جمع بنانے میں وں کے علاوہ اں کا استعمال رائج تھا اور افعال کے استعمال میں کافی فرق تھا۔ اس تعلق سے بہت سے اشعار نذر ناظرین ہیں۔

بوسا لباں سیں دینے کہا کہہ کے پھر گیا
پیالا بھرا شراب کا افسوس گر گیا

سب عاشقاں میں ہم کوں مژدا ہے آبرو کا
ہے قصد اگر تمہارے دل بیچ امتحاں کا

رقیباں کی ہوا ناچیز باتاں سن کے یوں بدخو
وگرنہ جگ میں شہرا تھا صنم کی خوش خصالی کا

خوباں میں سب جگت کے تو خوب زور ہے ممولا
سارے جہاں میں تیرا اب شور ہے ممولا

خوش یوں قد خم شیخ کا ہے معتقداں کوں
جیوں کشاں کوں کب جا لگے کوب پیارا

آبرو غم کے بھنور میں دل خدا سیتی لگا
ناخدا کچھ کام نہیں آتا ہے منجھدھاراں کے بیچ

آن ہے درد کے ضعیفاں پر
آہ دل کی الف ہے قد نوں ہے

ناقص تھی عاشقی کی تدبیر میں زلیخا
رکھنے کوں یوسفاں کے ایک دل کی چاہ بس ہے

دشمناں کو طعنے نے زخمی کیا
بات ان سب کی کٹاری ہے

■

Dr. Safaraz Javed
R-155, Gali No.: 6, Sir Syed Road
Jogabai Ext, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

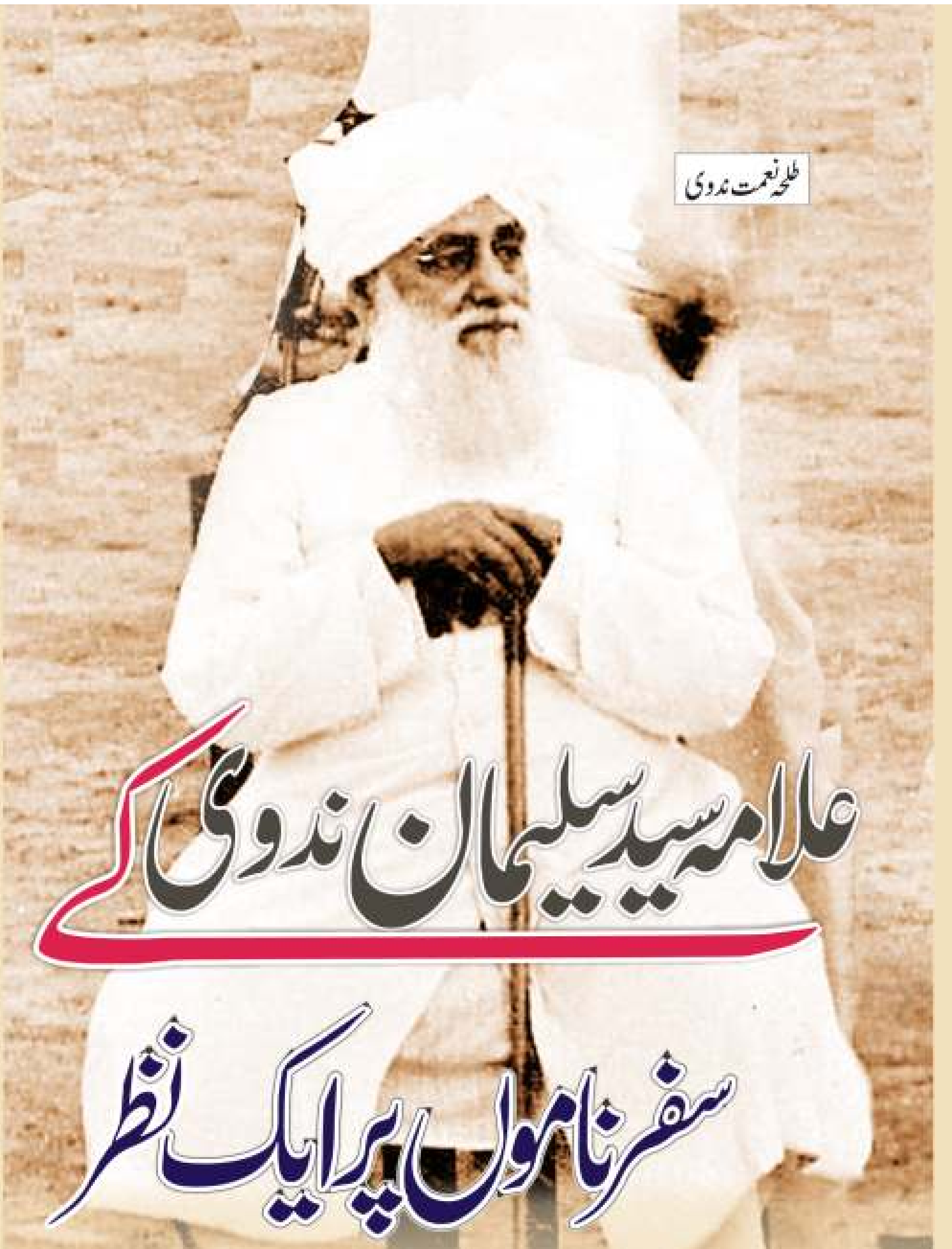

علامہ سید سلیمان ندوی کے سفرناموں پر ایک نظر

طلحہ نعمت ندوی

اردو کے اصناف ادب میں سفر نامہ نگاری کی جو اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات کی وسعتوں سے ادب کی یہ صنف بھی باہر نہیں، انھوں نے اس صنف میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں، اگر چہ اس صنف میں باضابطہ ان کے ایک ہی سفر نامے کا ذکر ملتا ہے اور وہ سفر نامۂ افغانستان ہے۔

باضابطہ سفر نامے کی حیثیت سے گرچہ سید صاحب کی یہی ایک کتاب متعارف ہے جو اپنی اہمیت میں کچھ کم نہیں، اور اس صنف کا بیش قیمت اثاثہ ہے، اگر انھوں نے اس صنف میں کچھ نہ بھی لکھا ہوتا تو بھی ان کی عظمت کے اظہار اور انھیں ایک کامیاب سفر نامہ نگار ثابت کرنے کے لیے ان کی یہی کتاب کافی تھی جو سفر نامہ نگاری کے جدید اصولوں پر پوری اترتی ہے۔ لیکن سید صاحب کے اور بھی سفر نامے ہیں جو ان کی تحریروں میں منتشر ہیں۔ ذیل میں ان پر ایک روشنی ڈالی جاتی ہے۔

سید صاحب نے اپنے ملک میں بے شمار سفر کیے، اور بیرون ملک ان کے تین سفر ہوئے۔ پہلا سفر یورپ کا ہوا جس میں سید صاحب نے تقریباً آٹھ ماہ یورپ کے مختلف ملکوں انگلستان، فرانس، اٹلی اور سوئزرلینڈ میں گزارے۔

ارباب ادب وتنقید نے سفر نامہ کے طریقوں میں ایک طریقہ خطوط کی تکنیک کو بھی قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مجموعۂ خطوط سفر نامہ کے اصولوں پر پورا اترتا ہے اور خطوط اور سفر نامہ دونوں صنفوں کا جامع اور دونوں کی خصوصیات کا حامل ہے، اور دونوں اصناف میں اس کا ادبی مقام مسلم ہے۔

سید صاحب نے مقدمہ میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دیگر کاموں کے ساتھ ان کی ایک ذمے داری یہ بھی تھی کہ ہر مہینے ہفتے بھر کی رفتار کار اور کاموں کی روداد لکھ کر ہندستان بھیجیں، چنانچہ وہ اس ذمے داری کو پوری تندہی سے انجام دیتے رہے۔

سید صاحب ان خطوط پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ خطوط اب محض تاریخی ہیں، افسوس ہے کہ میری قسمت ماضی کی ورق گردانی سے کچھ ایسی وابستہ ہوگئی ہے کہ حال بھی ماضی ہی بن کر سامنے آتا ہے، یہ خطوط اگر آج سے بیس سال پہلے شائع ہوتے تو ایک سیاحت نامہ کا کام دیتے، مگر اب بیس برس کے بعد ان کی اشاعت صرف تاریخی افادیت رکھتی ہے، ان سے آج سے بیس برس پہلے کے ہندوستان اور دنیائے اسلام اور یورپ کی سیاست کی وہ تصویر نظر آتی ہے جو میرے قلم نے کھینچی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کا نقشہ گو بدل چکا ہے، ایسی حالت میں نہیں کہا جا سکتا کہ کیا چیز باقی ہے کیا چیز مٹ گئی، تاہم ایک تاریخی دستاویز ہے۔'' (برید فرنگ، ص 51)

اس سلسلے میں برید فرنگ کے متعلق انور سدید کا یہ تجزیہ اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ:

''سید صاحب نے یورپ کو اپنے معتقدات کی روشنی میں دیکھا، لیکن جہاں یورپ کے محاسن اور ترقی کے آثار نظر آئے وہاں اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنے میں کوتاہی نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ ان کا سفر نامہ برید فرنگ ایک کشادہ نظر اور حقیقت جو ادیب کا تجزیاتی سفر نامہ نظر آتا ہے۔'' (اردو ادب میں سفر نامہ، ص 241)

برید فرنگ کے علاوہ حسابات وفد خلافت کے نام سے ایک کتابچہ بھی سید صاحب کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا تھا اس میں بھی سفر یورپ کی کچھ روداد ہے۔

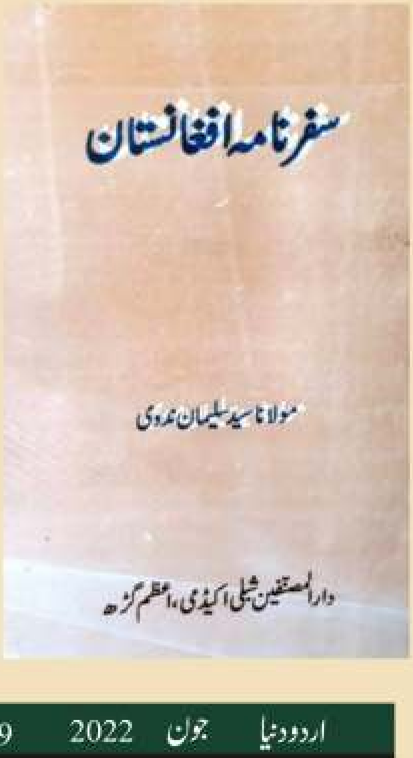

سید صاحب نے سفر یورپ کے بعد 1924 میں حجاز کا سفر کیا، پھر دو سال کے وقفے کے بعد 1926 میں حجاز کا دوسرا سفر ہوا، پہلے سفر حجاز میں مصر بھی جانے کا موقع ملا۔ پھر 1933 میں افغانستان کا سفر ہوا۔

اس کے بعد بیرون کا کوئی سفر نہیں ہو سکا، کئی علمی کانفرنسوں کے دعوت نامے بھی آئے لیکن شرکت کا موقع نہیں مل سکا۔

سید صاحب نے حجاز کے دو سفر وفد خلافت کے ساتھ کیے تھے جس میں پہلے سفر میں مصر کی سیاحت بھی شامل تھی۔ ان کا تیسرا اور آخری سفر خالص حج کے لیے اپنے اہل خانہ کے ساتھ پاکستان منتقل ہونے سے کچھ دن قبل 1949 میں ہوا تھا۔ بیرون ہند کے اسفار میں یورپ کی روداد 'برید فرنگ' مرتب کر کے خود سید صاحب نے اہل علم کے سامنے پیش کر دی تھی، اور سفر افغانستان کی مفصل روداد بھی تحریر کر دی، لیکن حجاز کے ان اسفار میں سے کوئی بھی سفر باضابطہ مرتب شکل میں سید صاحب کے قلم سے منظر عام پر نہیں آسکا۔ سید صاحب ان تینوں اسفار کو بھی آخری عمر میں کراچی کے دوران قیام مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کا ارادہ خود سید صاحب کے قلم سے تو کہیں نہیں ملتا، البتہ سید صاحب کے شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

''سفر نامہ بھی استاد مرحوم کی تصنیفات میں شامل ہے، سیاحت افغانستان کی روداد مفصل معارف میں لکھی تھی.....عرب ملکوں کا سفر نامہ بھی 'میرے عرب کے تین سفر' کے نام سے مرتب کر رہے تھے مگر یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

(چراغ راہ کراچی، مضمون 'سید سلیمان ندوی مرحوم' مارچ 1954)

لیکن سید صاحب کی منتشر تحریروں میں کافی متعلقہ مواد موجود ہے جنھیں جمع کر کے سید صاحب کے حجاز و مصر کے تینوں سفرنامے مرتب کیے جا سکتے ہیں، گرچہ اس میں تشنگی باقی رہے گی اور تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں ہو سکتا لیکن کچھ تلافی تو ضرور ہوگی۔ ایسا لگتا ہے کہ سید صاحب نے اس سفرنامۂ حجاز کے لیے بہت کچھ مواد اپنی ڈائری میں جمع کر لیا تھا، اور یادداشتیں بھی نوٹ کی تھیں، اس کا اشارہ خود سید صاحب کی ایک تحریر میں ملتا ہے، سفر حجاز 1926 سے واپسی کے بعد سید صاحب نے معارف میں سب سے پہلے جو شذرات لکھے اس میں اپنے سفر کا اجمالی ذکر کیا جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''الحمد للہ کہ ساڑھے تین مہینے کی غیر حاضری کے بعد فریضۂ حج و زیارت سے مشرف ہو کر آج معارف کا ایڈیٹر آپ کی خدمت میں پھر حاضر ہے، ان ساڑھے تین مہینوں میں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، کانوں نے جو کچھ سنا اور دل نے جو کچھ مشاہدہ کیا یہ داستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان صفحات کے ذریعے کبھی کبھی آپ تک پہنچے گی۔''

(شذرات، معارف شمارہ 3، ج 8)

انھی شذرات میں اگلے صفحے میں تحریر کرتے ہیں:

''مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک کی بارہ منزلیں نہایت آسانی سے طے ہوئیں، اور ہر منزل میں ایک نئی دلچسپی نظر آتی تھی، میں نے کوشش کی ہے کہ ہر منزل کی قلمی تصویر ناظرین کی چشم خیال تک پہنچا سکوں۔''

پھر مسجد نبوی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''اس مسجد کا تاریخی نقشہ ہاتھ آیا ہے، کبھی وہ آپ کے سامنے بھی آئے گا۔ اسی کے ساتھ مسجد نبوی کی موجودہ صورت و شکل و خصوصیات کی الفاظ و حروف کے رنگ میں میں نے تصویر اتاری ہے وہ بھی آپ دیکھیں گے۔''

ان تمام اقتباسات اور جملوں سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب نے اپنے سفر حجاز 1926 کی یادداشت اور مشاہدات کی کئی اہم یادگاریں نوٹ کر لی تھیں، بلکہ انھیں ایک حد تک قلمبند بھی کر لیا تھا لیکن شاید وہ انھیں جن دیگر مباحث کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتے ہوں گے اس کی ترتیب و تکمیل کا انھیں موقع نہیں مل سکا، البتہ ان شذرات میں جن کتب خانوں کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے ان پر سید صاحب کا مفصل مضمون، (جس میں مخطوطات کا مفصل ذکر ہے) 'حجاز کے کتب خانے' کے عنوان سے معارف میں شائع ہوا تھا، بقیہ نوٹس ان کی ڈائری میں شاید محفوظ ہوں، لیکن اس ڈائری کا اب کوئی سراغ نہیں ملتا، شذرات کے مختصر سفرنامے کے ساتھ اگر اس مضمون کو مرتب کر دیا جائے نیز کچھ مباحث رپورٹ وفد خلافت 1926 سے اخذ کر کے اضافہ کر دیے جائیں تو ایک حد تک اس سفر کے اہم واقعات ناظرین کے سامنے آ جائیں گے۔

1924 میں جو وفد خلافت خود سید صاحب کی قیادت میں حجاز گیا تھا۔ اور جس میں مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری سید صاحب کے رفیق سفر تھے، اس کی رپورٹ اسی وقت مرتب ہوئی تھی جس کا اغلاط سے پر ایک بوسیدہ نسخہ بعض کتب خانوں میں محفوظ رہ گیا ہے، اس میں سفر کی پوری روداد موجود ہے۔ بمبئی سے روانگی سے واپسی تک کا ایک اجمالی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کے ارباب حل و عقد سے جو ملاقاتیں اور باتیں ہوئیں، جو مراسلات ہوئے ان کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ افسوس ہے کہ ان مراسلات اور انٹرویوز کی عربی اصل دستیاب نہیں کہ ترجمے سے ان کا موازنہ کیا جا سکے۔ مراسلات کے یہ ترجمے بظاہر کسی اور کے قلم سے ہیں، اس

سید صاحب نے حجاز کے دو سفر وفد خلافت کے ساتھ کیے تھے جس میں پہلے سفر میں مصر کی سیاحت بھی شامل تھی۔ ان کا تیسرا اور آخری سفر خالص حج کے لیے اپنے اہل خانہ کے ساتھ پاکستان منتقل ہونے سے کچھ دن قبل 1949 میں ہوا تھا۔ بیرون ھند کے اسفار میں یورپ کی روداد 'برید فرنگ' مرتب کرکے خود سید صاحب نے اہل علم کے سامنے پیش کر دی تھی، اور سفر افغانستان کی مفصل روداد بھی تحریرکر دی۔ لیکن حجاز کے ان اسفار میں سے کوئی بھی سفر باضابطہ مرتب شکل میں سید صاحب کے قلم سے منظر عام پر نہیں آسکا۔ سید صاحب ان تینوں اسفار کو بھی آخری عمر میں کراچی کے دوران قیام مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

لیے کہ ان میں ترجمہ پن نظر آتا ہے، اور وہ بڑی تعداد میں ہیں، اس لیے پڑھنے والے کو شاید سید صاحب کے اسلوب پر شبہ ہو تو عجب نہیں، لیکن اگر ان تراجم کے علاوہ بقیہ تحریر دیکھی جائے تو اس میں سید صاحب کے طرز انشا کی پوری جھلک موجود ہے، اس لیے قیاس یہی ہے کہ سید صاحب نے ہی اصل رپورٹ مرتب کی ہوگی اور مراسلات کا ترجمہ کسی اور نے کیا ہوگا۔ یہ مراسلات اکثر سید صاحب ہی نے عربی میں لکھے تھے۔ اصل مطبوعہ رپورٹ پر تینوں ارکان وفد کا نام درج ہے۔ 1925 کے معارف کے شمارے میں سید صاحب نے 'جزیرہ عرب کی تعلیمی حالت' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں اپنے مشاہدات ذکر کیے، یہ بھی اسی وقت یادداشت کے طور پر تحریر کیا گیا ہوگا جو بعد میں مرتب کر کے شائع کیا گیا۔

اس سفر میں سید صاحب کو جدہ سے آگے جانے کی اجازت نہیں ملی اس لیے سید صاحب زیارت حرمین سے مشرف نہ ہو سکے تھے، چند دنوں کے انتظار کے بعد سید صاحب وہاں سے مصر تشریف لے گئے، اور مصر کے علما سے اپنے مدعا پر تبادلۂ خیال کیا، جن میں سب سے نمایاں نام شیخ ازہر مصر اور سید رشید رضا مصری کا ہے، سید صاحب نے وہاں کے سرگرم اور سرگرم عمل جمعیات اور انجمنوں کا اخیر میں تعارف بھی کرایا ہے۔ اگر چہ یہ در حقیقت رپورٹ ہے اس لیے اس میں سفرنامے کی ساری تفصیل تلاش کرنا مشکل ہے لیکن اس کے مشمولات سفرنامے کی شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ سید صاحب نے اپنے دونوں اسفار حجاز میں اپنے اعزہ کو وہاں کی کوئی رپورٹ نہیں بھیجی، اگر وہ خطوط میں برید فرنگ ہی کی طرح اس سفر کی تفصیلات بھی بھیجتے رہتے تو 'برید حجاز' یا 'برید عرب' کا مرتب ہونا بھی مشکل نہیں تھا، اور اس کے بعد سفرنامے کی تشنگی نہیں باقی رہتی۔ چند اشارات ان دستیاب خطوط میں

ملتے ہیں جو اعزہ و اہل وطن کے نام لکھے گئے۔ ممکن ہے کہ سید صاحب نے خطوط لکھے ہوں اور پھر جیسا کہ برید فرنگ کو مرتب کرنے کے لیے وہ خطوط منگوا لیے تھے اسی طرح حجاز کے خطوط بھی منگوائے ہوں اور انھیں بھی اسی طرح مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں جس کا مولانا مسعود عالم ندوی نے ذکر کیا ہے، لیکن یہ کام نہیں ہو سکا اور اب ان خطوط کا سراغ بھی نہیں ملتا، نہ عبدالحکیم رحمانی صاحب کے نام لکھے گئے خطوط کے قلمی مجموعہ میں وہ موجود ہیں۔

سید صاحب کا تیسرا سفر خالص حج کے لیے تھا، اس لیے سید صاحب نے اس میں یادداشت مرتب کرنے کی طرف شاید بہت زیادہ توجہ ہی نہیں دی اور ان کی پوری توجہ عبادت و دعا ہی پر مرکوز رہی۔ سید صاحب نے اپنے خانوادے کے بزرگ سید عبدالحکیم صاحب رحمانی کو حج کی واپسی کے بعد جو خط تحریر فرمایا اس میں لکھا تھا کہ اس دفعہ قلم چھونے کو دل نہیں چاہا۔ اس سفر میں جب سید صاحب جہاز سے بندر گاہ جدہ پر اترے تو سعودی بادشاہ ملک عبدالعزیز (جن کو پہلے سے سید صاحب کی آمد کی اطلاع تھی) کا قاصد سید صاحب سے بندرگاہ پر ملا اور شاہی پیغام سنایا کہ وہ حکومت کے مہمان ہوں گے، لیکن سید صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس سے قبل میں سیاسی حج کر چکا ہوں اور اس مرتبہ خالصۃً لوجہ اللہ حج کے لیے حاضر ہوا ہوں اس لیے اس کی قبولیت سے معذرت ہے، اس کے بعد عبدالعزیز بن سعود نے ان کی خدمت میں پر تکلف شاہی دستر خوان بھیجا، اس کی تفصیل ان کے فرزند مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی مدظلہ کی زبانی سنیے:

جدہ کی بندرگاہ پر اترتے ہوئے سلطان عبدالعزیز آل سعود کا ایک ایلچی والد ماجد سے ملا اور سلطان کا پیغام پہنچایا کہ آپ اور آپ کے ہمراہ افراد سلطان کے شاہی مہمان ہوں گے، سلطان سے چونکہ والد ماجد کی ملاقات 1924 اور 1926 میں ہو چکی تھی اس لیے سلطان نے اخلاقی فرض سمجھا کہ وہ ہم سب کو اپنا مہمان بنائیں، والد صاحب نے جواب دیا کہ سلطان کو میرے انتہائی مخلصانہ جذبات کا پیغام دیں اور شکریے کے ساتھ یہ کہیں کہ میں اس سے قبل دو (سید صاحب کو پہلے سفر حجاز میں جدہ سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ملی تھی، اس لیے اس سے پہلے حج ایک ہی ہوا تھا 1926 میں) سیاسی حج کر چکا ہوں اس بار صرف اللہ کے لیے حج کی نیت ہے..... سلطان مرحوم کے اخلاق کی بھی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ انھوں نے دوپہر کے کھانے کی دعوت کا اہتمام کیا، اور اس کے علاوہ والد ماجد کو اور مجھے خلعت سے نوازا۔'' (قلمی ایک تحریر مملوکہ راقم)

اس کے علاوہ بھی ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کے دوسرے اہل علم سے ملاقات کی تفصیل لکھی ہے۔

نیز پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل صدر فارسی پٹنہ یونیورسٹی بھی سفر حج میں ساتھ تھے، انھوں نے معارف کے سلیمان نمبر میں 'سفر حجاز کے تاثرات' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس سے اس سفر حج پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

سید صاحب کے ملکی اسفار: ان تین غیر ملکی اسفار کے علاوہ سید صاحب نے ملک میں کثرت سے سفر کیے، ان کو مختلف کانفرنسوں، علمی مجلسوں میں اور ملی کاموں کے لیے مدعو کیا جاتا اور سید صاحب کی شرکت سے ان جلسوں کی رونق دوبالا ہو جاتی، جا بہ جا سید صاحب کی تقریریں ہوتیں۔ ان تمام اسفار کی روداد تو محفوظ نہ رہ سکی البتہ بہت سے اسفار کا اجمالی تذکرہ سید صاحب نے واپسی کے بعد اپنے شذرات میں تحریر فرمایا تھا یہی اجمالی ذکر ان کے ملکی اسفار کا مرقع بن گیا۔ اس سلسلے میں جو کچھ سرمایہ ان کی تحریروں میں موجود ہے وہ شذرات ہی کے ذیل میں لکھی گئی تحریریں ہیں جس میں کہیں تو عنوان درج ہے اور کہیں نہیں، کوئی پورے شذرات کو محیط ہے کوئی چند سطروں میں یا ایک دو صفحات میں ہے، ایک دو تحریریں اس سے الگ ہیں۔ سید صاحب کے دستیاب سفرناموں میں ان کا سب سے پہلا سفرنامہ بہ شکل مکتوب ہے۔ 1912 میں سید صاحب نے بنگلور، میسور اور دیگر جنوبی علاقوں کی سیاحت کی، ٹیپو سلطان کے مزار پر حاضر ہوئے اور واپسی کے بعد اپنے ہم وطن بزرگ اور رشتے کے چچا مولوی سید عبدالحکیم رحمانی دسنوی کے نام مفصل مکتوب تحریر فرمایا جس میں پورے سفر کی روداد اور اپنے تاثرات بیان کیے، یہ مکتوب صرف سفر ہی کی روداد پر مشتمل ہے، مکتوب الیہ نے اسے 1940 میں ماہنامہ ندیم (گیا) کے کسی شمارے میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ مکتوب الیہ کے نام سید صاحب کے مکاتیب کے ضمن میں سب سے پہلے معارف میں شائع ہوا اور اب حیات سلیمان میں بھی شامل ہے، ایک مفصل خط بمبئی کی روداد سفر پر مشتمل ہے جو اب تک قلمی ہے اور سید صاحب کے مکاتیب بنام مولانا عبدالحکیم رحمانی میں شامل ہے، اسی طرح ایک مضمون سید صاحب نے 'سفر گجرات کی چند یادگاریں' کے نام سے لکھا تھا، یہ درحقیقت وہاں کے بعض نوادرات اور اردو کی چند قلمی تحریروں کے تعارف پر مشتمل ہے، اسی لیے سید صاحب نے موضوع کی مناسبت سے اسے 'نقوش سلیمانی' میں شائع کر دیا ہے لیکن اس میں سفر کا اجمالی ذکر بھی ہے، اس لیے بقول شخصے اسے سفر گجرات کا رپورتاژ کہنا چاہیے۔

سفر لندن کے دوران سید صاحب نے ایک مضمون 'انڈیا آفس میں اردو کا خزانہ' لکھ کر بھیجا تھا جو اسی وقت معارف میں شائع ہو گیا تھا، یہ بھی درحقیقت ان کے سفرنامے ہی کا حصہ ہے۔

'نالندہ کی سیر' کے عنوان سے سید صاحب نے مئی 1935 میں اپنے علاقۂ بہار شریف کے قریب نالندہ کے آثار قدیمہ کی زیارت کے بعد معارف میں موقعے کی مناسبت سے مختصر روداد سفر بیان کرتے ہوئے ایک تاریخی مضمون لکھا تھا، اس میں سفر کی روداد اجمالی ہے، بقیہ تاریخی مباحث ہیں۔

دارالمصنفین میں سید صاحب کے کاتب و مسودہ نویس اور دارالمصنفین کے مصحح ابوعلی عبدالباری اثری صاحب کا تحریر کردہ ایک قلمی مجموعہ ہے، جس کے سرورق پر 'سفرنامہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی' لکھا ہے، اس میں عبدالباری صاحب نے سید صاحب کے تمام شذرات سے منتخب کر کے ان کے اسفار کو یکجا کر دیا ہے لیکن اس میں بہت سے غیر متعلقہ مباحث بھی آگئے ہیں اور بہت سا متعلقہ مواد شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ الغرض اگر ان شذرات سے سید صاحب کے اسفار کو یکجا کر دیا جائے تو ایک اہم مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ سید صاحب کے ان شذرات میں جن مقامات کی سیاحت کا ذکر زیر قلم آیا ہے ان میں اکثر جنوبی ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ رانچی کے سفر کا ذکر بھی بہت خوبصورت پیرایے میں کیا گیا ہے، اور لاہور، پشاور اور بمبئی کے اسفار کا بھی ذکر ہے، ان اسفار کی ایک اجمالی فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے۔

1. ناگپور کا سفر / معارف، اپریل 1918
2. مئو کا سفر، معارف، فروری 1919
3. بھوپال کا سفر، معارف، ستمبر 1919
4. علی گڑھ و دہلی کا سفر، معارف، فروری 1923
5. مدراس کا سفر، معارف، اکتوبر 1925
6. ترپاتور (مدراس) کا سفر، معارف، دسمبر 1925
7. امبالہ کا سفر
8. رانچی کا سفر، جون 1924
9. عمر آباد (مدراس) کا سفر، اکتوبر 1938
10. مدراس، بمبئی، حیدرآباد، بھوپال اور واردھا کا سفر، اپریل تا دسمبر 1945
11. دکن (بعنوان میرا مختصر سفر دکن) اکتوبر 1937
12. پشاور، لاہور، بھاولپور کا سفر، مئی 1949
13. حیدرآباد، پونہ و بمبئی کا سفر، جنوری 1940

14 ترچناپلی (مدراس) کا سفر 1927

یہ ایک سرسری خاکہ ہے سید صاحب کے ان اسفار کا جن کا ذکر معارف میں آیا ہے، ممکن ہے اس کے علاوہ بھی معارف یا دیگر رسائل میں کچھ میں کچھ لکھا گیا ہو۔

اخیر میں سید صاحب کا بمبئی کا ایک سفرنامہ جو بہ شکل خط ہے اور اب تک قلمی ہے پیش کیا جا رہا ہے، اس سے سید صاحب کی دقت نظر، واقعات پر غور اور اس کو معاصر اسلوب میں پیش کرنے کا سلیقہ معلوم ہوگا، اور سفرنامے کے لوازم اس میں پورے طور پر نظر آئیں گے۔

پائل جی ہوٹل بائی کلہ، بمبئی

جناب مکرم!   السلام علیکم!

والا نامہ ملا، میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور پس دیوار گرجاسے نغموں کے نغمات مناجات دل کھینچ رہے ہیں، لیکن نہیں! میں سنبھلا بیٹھا ہوں۔

بمبئی یورپ کا ایک ٹکڑا ہے، یا ایشیا کا یورپ ہے، سڑکیں نہایت کشادہ اور وسیع۔

لطیفہ: ایک دن مولانا اور بیدل شاہجہاں پوری کے ساتھ اپالو بندر گیا، مولانا نے کہا کس قدر سڑکیں کشادہ ہیں، میں نے ہنس کر کہا جتنی کشادہ سڑکیں ہیں، اتنی کشادگی میں تو ہمارے گاؤں آباد ہیں، سب لوگ بے اختیار ہنسنے لگے، میں نے جو کچھ کہا مبالغہ نہیں واقعہ ہے۔

ہر دو فرلانگ پر تقریباً یہاں چوراہا ہے، چوراہے میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی قسم کی عمارت کا ایک سلسلہ ہے، سلسلے کی ابتدائی اور انتہائی عمارت ہمیشہ مثلث ہوتی ہے، تاکہ چوراہے کی وسعت میں فرق نہ ہو۔

جس طرح دس پندرہ قدم پر آپ نے لکھنؤ میں بالائی کی دوکان دیکھی تھی، ویسے ہی یہاں کھانے کے ہوٹل ہیں، ہمارے خیال میں شہر کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ ہوٹلوں میں کھاتا ہے، ہوٹلوں میں سنگ مرمر کی میزیں جا بجا پڑی ہیں، اردگرد سیاہ گول کرسیاں ہیں، ایک میز کے سامنے کسی کرسی پر جا بیٹھا، نوکر ادھر ادھر کھڑے ہیں، ادھر آنا بھئی! ایک پلیٹ بریانی، ایک پلیٹ قورمہ دینا، سامنے لاکر رکھ دیا، کھانا کھایا، دروازے پر پہنچا، وہاں صاحب ہوٹل بیٹھا ہے، پیچھے سے آواز آئی، چھ آنے۔

یہاں کم از کم ایک آدمی 3/روز کھا سکتا ہے، زائد کی حد نہیں، آج راج محل ہوٹل میں مولانا کے ساتھ گیا، بریانی کی ایک پلیٹ 8/کو ملی، عموماً کافی کی چھوٹی پیالی دو پیسے کو، اور چائے کی چھوٹی پیالی ایک پیسے کی، ہوٹل کے مالک زیادہ ایرانی، پارسی اور اٹالین ہیں، یہاں کی دولت کا کیا پوچھنا، میرے ہوٹل سے سو قدم پر ایک پارسی کا اسٹیچو ہے، جس نے اپنی زندگی میں بارہ لاکھ روپیہ خیرات کیا، دولت و تجارت میں پہلا نمبر مارواڑیوں کا ہے، دوسرا میمن اور خوجہ مسلمانوں کا، تیسرا پارسیوں کا، اور چوتھا انگریزوں کا، عربوں کی تجارت بھی یہاں اچھی ہے، اتوار کے روز ایک تاجر عرب کے یہاں گئے تھے، موتیوں کا تاجر ہے، ہر وقت اس کے یہاں دو کروڑ کے موتی رہتے ہیں، اس کا مکان سمندر کا نہایت عالیشان سنگ مرمر کا ہے، شیشہ اور پتھر کے سوا لکڑی اور اینٹ کا نام نہیں، مکان کو چھوڑ کر صرف زمین کا کرایہ پچیس ہزار سالانہ گورنمنٹ کو ادا کرتا ہے، موتی کے اور بہت سے لکھ پتی عرب تاجر ہیں، وللہ الحمد۔ آل جاثم نے ڈیڑھ لاکھ ہندوستان، مصر اور عرب میں قومی کاموں میں دیا ہے۔

یہاں کے لباسوں کا نہ پوچھیے، دنیا کے ایک ایک گوشے کے آدمی ہیں، اور ان کا گوناگوں لباس، مجھ کو یہاں ہر لباس دیکھ کر حیرت معلوم ہوتی ہے، لیکن اہل بمبئی سے پر حیرت لباس سے بھی حیرت نہیں ہوتی۔

میمن مرد و عورت عربی لباس پہنتے ہیں، پارسنیں قمیص، ساری، کوٹ، پائتابہ سر میں بعض کشادہ بھی پہنتی ہیں، مرہٹنیں ساڑی بصورت لنگی پیچھے کھونس کر، یہودنیں جدید فیشن کی تو یورپین لباس پہنتی ہیں، مگر قدیم وضع کا لمبا کرتا اور ایک سفید لمبی چادر جس سے ان کا تمام جسم ڈھکا رہتا ہے اور نہایت خوبصورت معلوم ہوتی ہیں، مسلمان عورتوں کے لیے قابل تقلید ہے، مسلمان عورتیں عموماً ایک نہایت لمبا کرتا جو نہایت کشادہ اور چوندار ہوتا ہے، پہنتی ہیں، یہ کرتا ٹخنوں تک ہوتا ہے، وسط گریبان سینے پر نہیں، بلکہ دونوں طرف کندھوں پر ہوتا ہے، پائجامہ چھوٹے پائچہ کا تنگ، جس کا صرف چار پانچ انگل حصہ کرتا سے نیچے معلوم ہوتا ہے، سر پر ایک دوپٹہ، مجھے یہ لباس نہایت پسند ہے، بعض خوش وضع مسلمان عورتیں نیچے کرتا کے دامن میں جھالر لگاتی ہیں، اس قسم کا کرتا اگر کمر میں کمر بند باندھ دیا جائے، تو بالکل سایہ یا گون معلوم ہوتا ہے۔

یہاں کی مسجدیں عموماً نہایت شاندار وسیع ہوتی ہیں، رنگ ان کا عموماً سبز ہوتا ہے، اندرون مسجد میں ایک چھوٹی سی نہر ہوتی ہے، [وضو کے لیے] امام مسجد عموماً عرب یا مصری ہوتے ہیں، مسجد میں گنبد نہیں ہوتے، اگر کہیں ہیں بھی تو ایک اور چھوٹا سا، منارے ہوتے ہیں، اندرون مسجد بیش قیمت سامانوں سے اور آلات شیشہ سے آراستہ ہوتا ہے۔

آج جمعہ کی نماز ایک مسجد میں پڑھی، پہلے دو موذنوں نے مناروں پر مل کر اذان دی، تھوڑی ہی کے دیر کے بعد جبہ سے آراستہ موذن سے نکلے، صفوں کو چیرتے ہوئے میز کے پاس پہنچے، عصا منبر سے لگا رکھا تھا، اس کو ہاتھ میں لے کر نہایت قرأت سے قرآن مجید کی خاص آیتیں اور دعائیں پڑھیں، دعاؤں کا خاتمہ تھا کہ امام صاحب بھی جبہ پہنے عمامہ عربی زیب سر کیے برآمد ہوئے، بہ ہزار وقت منبر تک پہنچے، اور قدم تولتے ہوئے عصا ٹیکتے ہوئے، تین چار منٹ میں تین چار زینے طے کیے، خطبہ نہایت قرأت سے شروع کیا، پہلا خطبہ ختم ہوا، تو موذن صاحب نے بلند آواز سے درود شروع کیا، پھر دوسرا خطبہ شروع ہوا۔

ہائے خطیب، جب یہاں پہنچا ہے، حامی الحرمین الشریفین السلطان بن السلطان الغازی محمد رشاد خاں، بدن کانپ گیا، رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

انگریزی اسکول یہاں کثرت سے ہیں، میرے آس پاس چار پانچ اسکول ہیں، دو تین لڑکیوں کے اور باقی لڑکوں کے، مگر ان میں کون پڑھتے ہیں، انگریز، کرسچن، پارسی، اور مرہٹے، مسلمانوں میں بالکل شاذ، عربی مدارس کئی ہیں، مگر سب بیکار، جہاں طلبہ تا اختتام زندگی طالب العلمی کرتے ہیں۔

مذہبی احساس مسلمانوں میں شدید ہے، مگر عجائب پرستی، توہم پرستی اور پیر پرستی کی حد تک۔

کتب خانے کئی ہیں، کریمی لائبریری، صدیقی لائبریری، مفید لائبریری، جامع مسجد لائبریری، ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی، پرنس رفرنچ لائبریری، مگر سب معمولی اور ادنی۔ سیرت نبوی ہو رہی ہے، ابھی گریجویٹ صاحب نہیں آئے ہیں، علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ، مشرقی بنگال کے ایک مسلمان ایم اے گریجویٹ عبدالحکیم صاحب نے جو ابھی کامیاب ہوئے ہیں، عربی سے واقف ہیں، اپنے کو آنریری پیش کیا ہے، مجھ سے ملاقات ہے، نہایت نیک متواضع ہیں، غالباً وہ ایک ہفتے میں آجائیں۔

آج جامع مسجد سے نکلتے ہوئے میں نے دو جشنیں دیکھیں، جشنیں کیا تھیں، کالی دیویاں تھیں، العظمۃ اللہ۔ اخلاقی حیثیت سے بمبئی کیا ہے؟ دکان عصمت فروشی ہے، میرے ایک دوست کے سامنے دو یہودی بچیاں رہتی ہیں، محلے کا ہر نوجوان سمجھتا ہے مجھ کو چاہتی ہیں، ایک نوجوان کرسچن کا اس کے پیچھے برا حال ہے۔

سید سلیمان

23 جون 1912

■

Talha Nemat Nadwi
Asthawan Nalanda
Biharsharif (Bihar)
Mob.:9117394766
Email.: talhanemat3@gmail.com

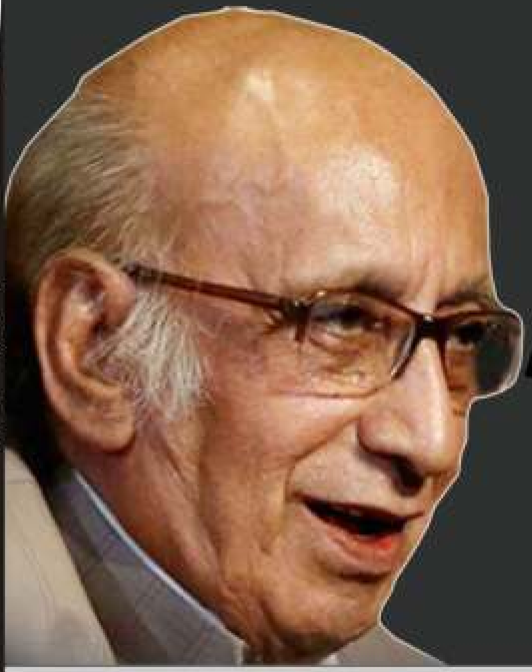

ندا فاضلی کی آپ بیتی
'دیواروں کے بیچ' میں
اسلوبیاتی تنوع اور تخلیقی فعالیت

سید وجاہت مظہر

کیسلس انسائیکلو پیڈیا آف لٹریچر میں خودنوشت نگاری سے متعلق بڑی اہم بات کہی گئی ہے ''آپ بیتی لکھنے والا اگر اپنی کہانی کو فن پارہ سمجھنے کا خواہش مند ہے تو جمالیاتی اسباب کی بنا پر کئی حقائق کو حذف کر دینے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ خودنوشت کے مصنف کے لیے یہ بات لازم ہے کہ اپنی روزمرہ کی روکھی پھیکی باتوں کو ضرور نہ دہرائے اور اپنی توجہ اہمیت رکھنے والے قصوں، کاموں اور خصوصیات پر مرکوز رکھے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کئی کئی جلدوں والے وسیع سلسلے پڑھنے کے لائق نہ رہ جائیں گے۔''

(ترجمہ کیسلس انسائیکلو پیڈیا آف لٹریچر، جلد 1، ص 63)

انگریزی کے معروف نقاد پروفیسر البرٹ ای اسٹون نے بجا طور پر لکھا ہے کہ فنکارانہ تخیل حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی ہوتا ہے۔ آپ بیتی میں پیش کی گئی سچائیوں کو فنی اقدار کی آمیزش کے ساتھ پیش کرنے ہی سے اس میں حسن اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ اگر چہ کہ سچائی اور خودشناسی انتہائی اہم لوازمات ہیں مگر ان کی پیش کش میں جذبات کی رنگ آمیزی اور خیالات کی پیکر تراشی شامل نہ ہو تو خودنوشت میں قاری کو تخلیقی تسکین کیسے ملے گی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خودنوشت سوانح نگار کے لیے اسلوب کی دلکشی بھی بنیادی شرائط میں شامل ہے۔

خودنوشت محض داستانِ حیات نہیں بلکہ ایک ادبی کارنامہ بھی ہے۔ یہ اپنی روداد حیات کو بے باکی اور جرأت رندانہ کے ساتھ پیش کرنے کا عمل ہے۔ داخلی جذبات کا اظہار دراصل فن کی اعلیٰ اقدار میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ زندگی کی کوتاہیوں کا ایسا اعتراف ہے جو مصنف کی روح کی تطہیر کرتا ہے

اُردو کے شعرا و ادبا نے اپنی داستان زیست بیان کرنے کے لیے کہیں قرۃ العین حیدر کی ناول نما سوانح حیات 'کار جہاں دراز ہے' کے طرز پر شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ شعور کی رو کے مطابق تخلیقات میں ترتیب یا ربط کا ہونا ضروری نہیں بلکہ انسانی شعور ایک سیال شے ہے جو منطقی ربط و ضبط کے بغیر زندگی کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔ اردو میں قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ ناول 'آگ کا دریا' میں استعمال کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی خودنوشت 'کار جہاں دراز ہے' میں بھی انھوں نے اس ہیئت کو اپنایا ہے۔ آپ بیتی کے میدان میں ناول نما ہیئت اور فلسفیانہ و اساطیری لب و لہجے میں اپنا فسانۂ زندگی پیش کر کے خودنوشت نگاری میں منفرد پیکر تراشی، ہیئتی تجربہ کاری اور جمالیاتی اسلوب کا مظاہرہ جن دیگر اہل قلم نے کیا ان میں 'آشرم' کے مصنف پروفیسر شکیل الرحمن کا نام بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے اس آپ بیتی میں استعاراتی اور داستانوی طرزِ نگارش اختیار کیا ہے۔ علمِ نفسیات میں انسانی افکار و اعمال کو شعور سے زیادہ لاشعور کی پیداوار تسلیم کیا جاتا ہے جس میں ترتیب و تہذیب اور ربط و ضبط نہیں پایا جاتا۔ علم نفسیات اور جمالیات کے ماہر پروفیسر شکیل الرحمن نے شعوری طور پر اپنی خودنوشت 'آشرم' میں اس تکنیک کا ہیئتی نظریے سے تجربہ کیا ہے۔ موصوف کی آپ بیتی 'آشرم'، قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی 'کار جہاں دراز ہے' اور 'ندا فاضلی کی آپ بیتی 'دیواروں کے بیچ' کا شمار ایسی ہی ادبی خودنوشت سوانحی کتب میں کیا جا سکتا ہے جو عام نہج سے ہٹ کر لکھی گئیں اور جن میں ہیئتی تجربات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

جدید طرز نگارش کے نمائندہ شاعر ندا فاضلی نے جب نثر نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو پہلے معروف شعرا اور ادبا سے اپنی ملاقات اور گفتگو کو کتابی شکل میں پیش کیا۔ یہ انٹرویوز پہلے ہفت روزہ 'بلٹز' میں شائع ہوتے رہے بعد میں انھیں 'ملاقاتیں' عنوان سے کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔ اپنی دلکش نثر کی بدولت مصنف کی یہ نثری کاوش، اہل اردو میں بڑی مقبول ہوئی۔ اس کے بعد ندا فاضلی نے 'دیواروں کے بیچ' عنوان سے ایک ناول نما خودنوشت سوانح حیات لکھی۔

اس میں ندا فاضلی نے اپنے سوانحی کوائف کے علاوہ اپنے عہد کے ادبی و ثقافتی مرقعے بھی پیش کیے ہیں۔ ندا فاضلی 12 اکتوبر 1938 میں گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال 8 فروری 2016 کو ممبئی میں ہوا۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی پیدائش، خاندانی منظر نامہ، ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت سے متعلق حقائق سے بڑی خوش بیانی کے ساتھ آگاہ کیا ہے۔ مصنف نے اپنے وطن گوالیار کا ذکر بڑی گہری وابستگی کے ساتھ کیا ہے۔ مدھیہ پردیش میں واقع یہ شہر اپنے تاریخی قلعے کے سبب سیاحوں کی دلچسپی کا محور رہا ہے۔ انھوں نے اس کی نہایت دلچسپ لفظوں میں تصویر کشی کی ہے۔ ندا فاضلی نے اپنی زندگی کا آغاز گوالیار، بھوپال اور بمبئی میں بڑی جدّ و جہد کے ساتھ کیا۔ انھوں نے فلموں کے لیے کئی گیت لکھے۔ ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامہ سیریل تحریر کیے۔ وہ بڑے زیرک اور فعال قلمکار تھے۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ ہیئتی اور تکنیکی تجربات بھی کیے۔ انھیں دیگر کئی ادبی، علمی اور فلمی اعزازات کے علاوہ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (1998) اور پدم شری (2013) کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

ندا فاضلی نے ہمیشہ اپنے کلام میں انسانیت کے وقار اور سربلندی کا پاس رکھا۔ نثر میں انھوں نے سدا حق گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک نہایت مستحکم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے آپ کو عام آدمی مانتے تھے، نہ کہ

ایک مثالی شخصیت کا حامل قلمکار۔ اپنے احباب و اقارب کا ذکر کرتے ہوئے وہ کسی قسم کی مصلحت پسندی اختیار کرنے یا تلخ باتوں کو یاد کرنے کے بجائے حقیقت پسندی کے ساتھ کام لیتے ہیں۔ خواہ نظم ہو خواہ نثر، وہ بڑی سادگی کے ساتھ گہری باتیں کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اسلوبیاتی تنوع اور تخلیقی فعالیت ان کی بنیادی پہچان بنی۔ اس خود نوشت سوانح حیات میں مقامات واشخاص و واقعات کی مرقع سازی میں فلسفیانہ نکات اور جمالیاتی پہلوؤں کی شمولیت اور اظہار میں بے باکی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

معروف شاعر شاہد ماہلی مرحوم نے اپنے اشاعتی ادارے 'معیار پبلی کیشنز' سے اس کتاب کی اشاعت کی۔ وہ ندا فاضلی کی اس ناول نما آپ بیتی کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

'' ندا فاضلی جدید اردو ادب کے نہایت بے باک اور زرخیز ذہن کا ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے مختلف شعری اصناف نظم، غزل، نثری نظم، گیت اور دوہوں میں ہی اپنے منفرد اسلوب کی شناخت نہیں دی، نثر میں بھی اُن کے اظہار کا انداز سب سے جدا نظر آتا ہے۔ ادبی دنیا میں 'ملاقاتیں' کی طرز نگارش کی پذیرائی کے بعد انھوں نے اپنی دوسری کتاب 'دیواروں کے بیچ' میں نئے سرے سے، نثر کے نئے تخلیقی امکانات کی تلاش کی ہے۔ اپنی شاعری کی طرح وہ نثر میں بھی ایک اہم آواز ہیں۔ اُن کی جدّت پسندی نے بھولی بسری یادوں کو ناول کا روپ دیا ہے۔ یہ سوانحی ناول ایک طویل سماجی و تہذیبی دور کے منظر نامے کا حصہ اول ہیں جس میں خود ندا فاضلی بھی ایک کردار ہیں۔ (شاہد ماہلی)

'دیواروں کے بیچ' میں ندا فاضلی نے اپنے مشاہدات و تجربات حیات کو بڑی فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول نما اس آپ بیتی میں ندا فاضلی نے اپنی زندگی کی کہانی پیش کرتے وقت 'واحد متکلم' کا صیغہ استعمال نہیں کیا ہے۔ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے مضمون بعنوان 'خودنوشت اندر ناول... ایک بے تکلف تجزیہ' میں واضح طور پر لکھا ہے:

'' ندا فاضلی نے اپنی سوانح کے لیے اس ضمیر متکلم کا سہارا نہیں لیا ہے جو بالعموم خودسوانحی ناول نگاروں کا سب سے مرغوب صیغہ کہلاتا ہے۔ اس ترجیح کی پشت پر ان کا یہ منشا بھی ہوسکتا ہے کہ کہیں 'میں' کی پرداخت انا، اظہار، احتساب اور اعتراف کی راہ میں حائل نہ ہو جائے اور وہ معروضیت بھی پیدا نہ ہو سکے جو جراُتوں کو بحال رکھنے کا ایک بڑا سبب بھی ہوتی ہے۔ ندا اپنی شاعری میں مختصر لمحوں کا شاعر ہے۔ یعنی وقت کو وسیع بساط پر پھیلانے سے اسے کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ جب کہ 'دیواروں کے بیچ' اور 'دیواروں کے باہر' کا زمان کم و بیش 60 برسوں پر محیط ہے۔ ندا کے یہ 60 برس کسی ایسے شخص کے 60 برسوں کا عرصہ رواں نہیں ہیں جسے اپنے ماضی پر گھمنڈ ہو، حال پر فخر اور مستقبل پر اعتماد۔ جو اخلاقیات کی نام نہاد فرہنگ کی ہر اُس برائی سے اپنے پاک ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہو جس سے اس کے حال کی عظمت پر کوئی حرف آسکتا ہے۔''

(اعتراف: کتابی سلسلہ نمبر 1 ندا فاضلی، ناشر اعتراف گروپ، ممبئی، اپریل 2005، صفحات 240)

ندا فاضلی بتاتے ہیں کہ تقسیم وطن کے ساتھ انھوں نے یہیں مُلک میں رہنا پسند کیا، جبکہ نا مساعد حالات کے باعث اُن کے اہل خاندان نے ہجرت گوارہ کرنا بہتر سمجھا۔ شرنارتھیوں کی آمد کے ساتھ فسادات کے ماحول میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ان کے گھر کے افراد کو اپنی جان بچانے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر بھوپال کا رخ کرنا پڑا۔ شہر کے باہر ویران علاقے بیرا گڑھ میں ایسے پناہ گزینوں میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ قیام کرتے ہیں۔ ندا فاضلی نے تقسیم وطن کے بعد برپا ہونے والے فسادات کی بڑی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔

کسب معاش کے ضمن میں وہ بمبئی، دلّی اور بھوپال کے سفر کرتے رہے۔ انھوں نے شعر و سخن کے ہمعصر ستونوں سے شعوری طور پر ربط و ضبط بڑھایا۔ عشق و معاشقے کے معاملات میں بھی انھوں نے نہ صرف اپنے ساتھ پیش آنے والے قصوں کو بڑی بے باکی اور دیدہ دلیری کے ساتھ لکھا ہے بلکہ اپنے والد ماجد مرتضی حسن کی بے راہ روی کی بھی قلعی کھولی ہے اور اُن کے ساتھ پیش آنے والے واردات قلب و نظر کو بھی قارئین کے روبہ رو بے دریغ اُجاگر کر دیا ہے۔ والد کی اپنے گھر کے تئیں بے اعتنائی سے اُن کی والدہ ذہنی اور جذباتی صدمات سے دوچار ہو کر تعویذوں، وظیفوں کے ورد، روزہ نماز کی پابندی اور درگاہوں پر حاضری دینے لگی تھیں۔ اس خود نوشت میں والدہ جمیل فاطمہ کا کردار ایک آدرش مشرقی عورت کا کردار بن کر ابھرتا ہے۔ وہ خانگی ذمے داریوں میں گھری ہوئی، پاکیزہ خیالات و افکار کی حامل خاتون ہیں، جن کے مزاج و اعمال میں شرافت، طہارت اور ممتا کے جذبات موجزن ہیں۔

مصنف کے اپنے عشق و معاشقے اور ازدواجی معاملات میں عشرت، وجیہہ اور مالتی جوشی کے کرداروں پر انھوں نے کتاب میں سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اس خودنوشت میں عشرت کے کردار کا ذکر تو کیا ہے مگر اسے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا ہے، جو آپ بیتی کے لوازمات کے نقطہ نظر سے وضاحت طلب امر کہا جاسکتا ہے۔

معروف نقاد شمیم حنفی اپنے مضمون 'آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر' میں ندا فاضلی کی نثر و نظم کا جائزہ اور موازنہ پیش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ندا فاضلی کے یہاں شعری اظہار اور نثری اظہار کی صلاحیت تقریباً ایک جیسی ہے۔ وہ ندا فاضلی کی نثر کو شفاف، حساس اور بے ساختہ نثر قرار دیتے ہیں۔ بقول شمیم حنفی:

'' ندا فاضلی کی نثر ہمیشہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہے، ایک خوش خرام جوئے آب کی طرح۔ اُن کی نثر جھالر یا سجاوٹ کے سامان سے حیرت انگیز حد تک خالی ہے۔ نثر میں ندا اپنے آپ کو ذرا بھی بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ اُن کی نثر فکری یا جذباتی مبالغے سے عاری، بہت کسی ہوئی، رواں دواں نثر ہے۔''

(اعتراف: کتابی سلسلہ نمبر 1 ندا فاضلی، ناشر اعتراف گروپ ممبئی، اپریل 2005، ص 74)

ندا فاضلی اس ناول نما خودنوشت میں اپنے والدین اور آبائی گھر کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنے اردگرد پائے جانے والے مختلف کرداروں کی سرگرمیاں اور ان کے نفسیاتی عوامل کے بیان اور فسادات سے پیدا شدہ دہشت اور سنسنی کے ماحول کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ایک ایسی حقیقی دنیا کا مرقع یہاں پیش کرتے ہیں جہاں شاعر، ادیب، طوائفیں، شریف زادیاں، ہجڑے، پہلوان، پنڈت اور لفنگے سبھی اپنی تمام تر ذات وصفات اور دکھ سکھ کے ساتھ اپنے اپنے حصے کی زندگی جی رہے ہیں۔ بستیاں، محلے، شہر، بچے، لڑکیاں، درخت سبھی اپنا مخصوص کردار ادا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر شمیم حنفی یوں رقمطراز ہیں:

'' جمیل فاطمہ اور مرتضی حسن کے تذکرے سے شروع ہونے والی کہانی کے کرداروں میں املی اور نیم کے پیڑ، محلّہ، بستی، کنواری لڑکیاں، بچے اور پڑوس میں آباد گولیوں کے چھپر والے گھر بھی شامل ہیں... اس آپ بیتی میں ایک جانی بوجھی اور برتی ہوئی دُنیا آباد ہے۔ کوئی کردار کسی دوسرے کردار پر حاوی نہیں ہونے پاتا اور سب کے سب کہانی کو آگے بڑھانے میں ایک خاموش اور خودکار رول ادا کرتے ہیں۔ کہانی کے بیان میں کئی شہر آتے ہیں۔ گوالیار، بمبئی، دلّی، کراچی، شکاگو اور سکھ دُکھ کے تمام دیکھے بھالے موسم آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ اس بہ ظاہر سیدھے سادے اور معمولی بیانیے کی تعمیر کرنے

والوں میں ہر سطح، ہر طبقے، مسلک اور مزاج کے لوگ شامل ہیں۔ شریف زادیاں، طوائفیں، ہجڑے، پہلوان، شاعر، ادیب، لفنگے اور بھاکری، مولوی اور پنڈت۔ غرض کہ خاصی رنگا رنگی اور چہلی ہے۔ سوئی سوئی سی پر امن بستیوں کے بیان سے لے کر فساد زدہ ماحول کی سنسنی، دہشت اور درشتی تک، ندا انسانی جذبوں، خوابوں، اُمنگوں اور احساسات تک ہر طرح کے تجربوں سے گزرے ہیں۔ کہیں اپنے شعور کی ستائش اور اپنی ہستی کا نشہ نہیں، عبارت آرائی اور فلسفہ طرازی نہیں، کسی طرح تمسخر، تحقیر اور ملامت کا اظہار نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی طباعی اور بصیرت کے بیان سے پڑھنے والوں کو متاثر کرنے کی طلب بھی نہیں۔ تجربوں کے کھرے پن اور متعلقہ تفصیلات سے جھلکتی ہوئی دردمندی اور سوز کی ایک دائم و قائم کیفیت نے اس کتاب کو انسانی سوچ، رویے اور طرز ادا کی ایک موثر شکل دے دی ہے۔ آپ بیتیاں مصیبت بن جاتی ہیں جب بیان کرنے والا آپ اپنے وجود کی سطح سے اوپر اٹھنے اور اپنے بندھے ٹکے شعور کے دائرے سے پل بھر کے لیے بھی باہر آنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

(اعتراف: کتابی سلسلہ نمبر 1 ندا فاضلی، ناشر اعتراف گروپ، ممبئی، اپریل 2005، ص 74-75)

ندا فاضلی جب نئے نئے ممبئی پہنچتے ہیں تو ان کے دوستوں اور شناساؤں کے لیے مکتبہ جامعہ، روز مرہ کی ملاقات کا مرکز بن جاتا ہے۔ اردو کتابوں کا یہ مکتبہ، ادبی حلقوں میں اس لیے ہردلعزیز ہے کیونکہ اس کے جنرل منیجر شاہد علی خاں اہل اردو میں سب کے ساتھ یکساں طور پر خندہ پیشانی سے پیش آتے رہے ہیں۔ اسی لیے ممبئی کے بھنڈی بازار میں واقع مکتبہ جامعہ، اردو ادیبوں اور شاعروں کے ملنے ملانے کے نقطۂ نظر سے مرکزی بنیادی اہمیت کا حامل مقام بن چکا ہے۔ ندا فاضلی اردو کتابوں کے اس مرکز میں وقوع پذیر ہونے والے ادبی مباحث، نوک جھونک اور معرکہ آرائیوں کا بڑا دلچسپ خاکہ پیش کرتے ہیں:

''بمبئی کے بھنڈی بازار کے علاقے میں مکتبہ جامعہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں بمبئی کے سارے زمینی فاصلے سمٹ کر ایک کتابوں کی دُکان بن جاتے ہیں۔ یہاں چھوٹے بڑے ہر شاعر، ادیب سے ملاقات ہو جاتی اُس کے جنرل منیجر شاہد علی خاں ہیں۔ ادیبوں کے آپسی اختلافات سے دور صبح سے شام تک ان کی مسکراہٹ سب کے لیے یکساں ہوتی ہے۔ ترقی پسند اسے اپنے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔ جدیدیت پسند اس میں بدلتی ہوئی قدروں کا عکس دیکھتے ہیں۔ یہ مسکراہٹ برسوں سے ایک جیسی ہے۔ گرمی، سردی، برسات ہر موسم میں اس کی لمبائی چوڑائی حسب معمول رہتی ہے۔ یہاں آنے والوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم ان کی ہے جو ہر شام پابندی سے یہاں آتے ہیں۔ ان میں اکثریت نئے ادیبوں اور شاعروں کی ہے۔ ندا بھی انھیں میں شامل ہے۔ ان میں ادب کے تعلق سے جذباتی انتہا پسندیاں زیادہ ہیں۔ ادبی بحث و مباحثہ میں ہر روز ذاتی تعلقات نئے سرے سے ترتیب پاتے ہیں۔ یہ نوک جھوک کئی کئی دن ایک کو دوسرے سے خفا رکھتی ہے۔ یہ خفگی جو ہوش میں سماجی حدوں کو پھلانگنے سے گریز کرتی ہے، مدہوشی میں اکثر ہاتھا پائی کا سرکس بن جاتی ہے۔ ندا کے ہاتھ سے باقر مہدی کا پھٹا ہوا کرتا، باقر مہدی کے اشتعال کا شکار ندا کی عینک، سُریندر پرکاش کے غصے سے میز پر دھماکے کے ساتھ چٹخنا چور ہوتی بوتل، بلراج مینرا کے گال پر مہیندر ناتھ کا طمانچہ اس سرکس کے کچھ سین ہیں۔ ادب و زندگی کا یہ قریبی رشتہ نئے ادیبوں کی مادی محرومیوں کا ردِ عمل ہے۔ ان میں سے بیشتر معاشی جدّ و جہد سے گزر رہے ہیں۔ اُن کے غم و غصے کا نشانہ زیادہ تر وہی کھاتے پیتے ادیب و شاعر ہیں جیسا یہ خود بھی بننا چاہتے ہیں۔ اپنے اپنے طور پر بھی ان کوششوں میں مصروف ہیں۔

میری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی

ان نئے ادیبوں و شاعروں کے ساتھ کچھ ایسے بھی روز کے آنے والے ہیں جو خود لکھتے لکھاتے نہیں لیکن جن کی شام کی فرصتیں روز کی ان نشستوں کی خاموش تماشہ بین ہیں۔ ان میں کچھ تجارت پیشہ ہیں اور کچھ سرکاری و نیم سرکاری کرسیوں سے وابستہ ہیں۔ ادیبوں کی ضرورتوں کو کبھی کبھار قرض کی سہولتیں فراہم کرنا اور ہر شام کی چائے، پان اور سگریٹوں کے اخراجات اُنہی کی اخلاقی ذمے داریاں ہیں۔''

(دیواروں کے بیچ، ندا فاضلی، معیار پبلی کیشنز دہلی، 2001، ص 149-150)

زبان و بیان پر ندا فاضلی کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وہ معمولی سی بات کو بھی غیر معمولی انداز عطا کر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس آپ بیتی میں ندا فاضلی نے خود اپنی ذات کو کٹہرے میں کھڑا کیا ہے اور یہ خود احتسابی اُن کی حق پرستی اور دیانت داری کی علامت بن کر اُبھری ہے۔ وہ زندگی کے حقائق کی مرقع سازی کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ قاری کے تصور کی آنکھ کے سامنے معاشرے کی متحرک تصویریں نمودار ہونے لگتی ہیں، جس میں ہوس ناکی، دہشت، بے چینی اور سفاکی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کے ان تاریک پہلوؤں کا مقابلہ مصنف اپنی طبیعت کی فراخی، بلند نظری اور وسیع القلبی سے کرتا نظر آتا ہے۔ وہ خود اپنی ذات کے خام پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہوئے کسی مصلحت کو ملحوظ رکھے بغیر بڑی جسارت، اعلیٰ ظرفی اور بے باکی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتار دیتے ہیں۔ یہ بات اُن کی مضبوطی جگر و دل کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ انھوں نے ممبئی کے معاشرے میں مے نوشی، عیاری، انا پرستی، جھوٹ اور مکر و فریب جیسے عوامل کا بڑی گہرائی و گیرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔ جمیل فاطمہ، مرتضیٰ حسن اور ندا اس خودنوشت نما ناول کے بنیادی کردار ہیں لیکن معاشرے میں اپنا وجود رکھنے والے بے شمار ذیلی کردار بھی حسب حیثیت اُن کی زندگی کے کینوس میں اپنی مخصوص جگہ بنا لینے میں کامیاب ہیں۔ اُنھوں نے سماج کے بعض نازک پہلوؤں کی پردہ کشائی کی ہے۔

مختصر یہ کہ 'دیواروں کے بیچ' ایک دلچسپ، فکر انگیز اور تخلیقی نثر میں لکھی ہوئی داستانِ حیات ہے۔ اس کا اسلوب دلکش ہے۔ ندا فاضلی کا قلم بے باک اور دھاردار ہے۔ انھوں نے 185 صفحات پر مشتمل اپنی خودنوشت سوانح حیات ''دیواروں کے بیچ'' میں بچپن سے تادمِ تحریر واقعات و احوال کی پیش کش میں جمالیاتی اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے اور اپنے بیانیے میں فلسفیانہ لب و لہجہ اپنایا ہے۔ مصنف نے خودنوشت نگاری کے میدان میں مخصوص ہیئتی تجربہ کاری اور منفرد پیکر تراشی کے توسط سے اپنی تخلیقی قابلیت کا لوہا منوایا ہے اور اس لحاظ سے انھوں نے ناول نما آپ بیتیوں کی صنف میں اپنی ایک منفرد پہچان قائم کی ہے۔

حوالہ جاتی کتب

1 اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ڈاکٹر صبیحہ انور، نامی پریس لکھنؤ، 1982
2 انداز بیاں (یک موضوعی مجلہ)، مدیر: حقانی القاسمی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2016
3 دستاویز (کتابی سلسلہ 4)، دوحہ/دہلی، 2016
4 دیواروں کے بیچ، ندا فاضلی، معیار پبلی کیشنز دہلی 2001
5 اعتراف: کتابی سلسلہ نمبر 1 ندا فاضلی، ناشر اعتراف گروپ، ممبئی، اپریل 2005
6 کیسلس انسائیکلوپیڈیا آف لٹریچر، جلد 1

■

Syed Wajahat Mazhar
T-116/1, 2nd Floor, Main Market
Okhla Village, Jamia Nagar
New Delhi- 110025
Mob.: 7217718943

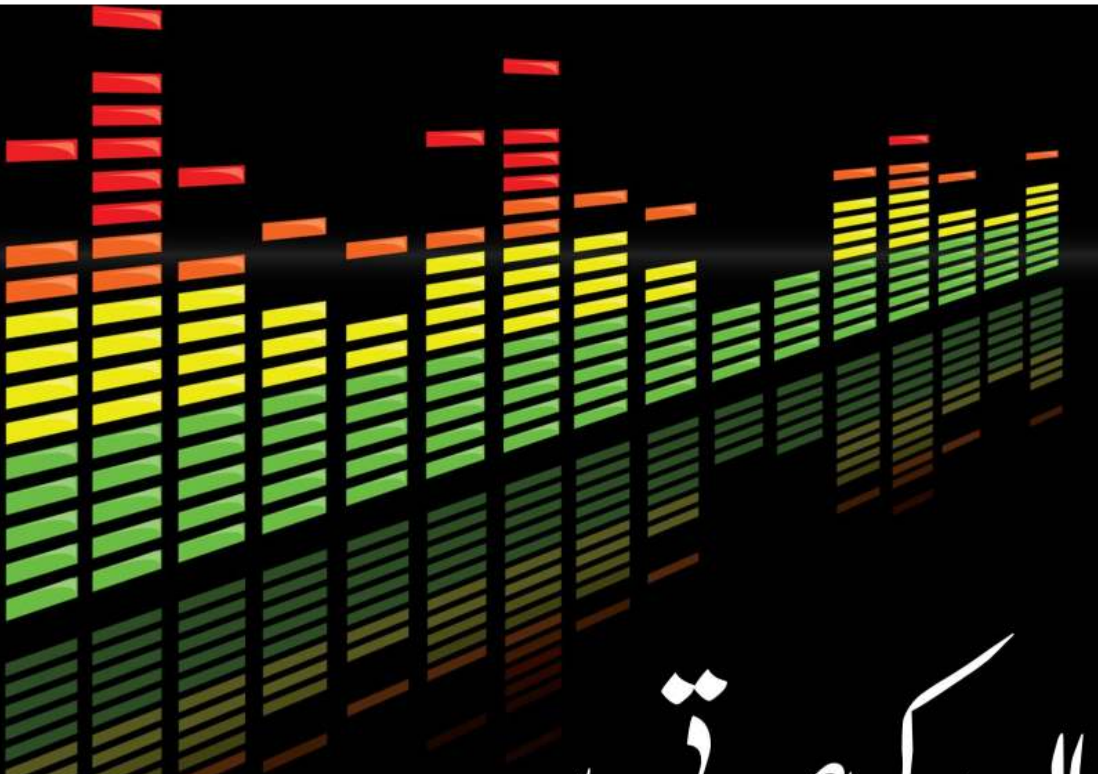

رضاءالرحمن عاکف سنبھلی

اردو زبان کی صوتی وسعت

"اردو زبان یوں تو بہت سی خوبیوں کی مالک اور متعدد اوصاف سے مزین ہے۔ اس کے الفاظ کی شیرینی و لطافت، اس کا زبردست صوتی آہنگ، اس کی بے پناہ خوبصورت شاعری، دل کش و دل نواز اشعار تو دلوں کو موہ لینے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کی قواعد و لسانی خوبیاں بھی دلوں کو متاثر کرتی ہیں۔"

اردو زبان یوں تو بہت سی خوبیوں کی مالک اور متعدد اوصاف سے مزین ہے۔اس کے الفاظ کی شیرینی و لطافت، اس کا زبردست صوتی آہنگ، اس کی بے پناہ خوبصورت شاعری، دل کش و دل نواز اشعار تو دلوں کو موہ لینے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کی قواعد و لسانی خوبیاں بھی دلوں کو متاثر کرتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی اس کا ایک اور جوہر اس کا صوتی نظم ہے۔جس کی جانب محققین کی نظر کم ہی گئی ہے۔ان سطور میں ہم اس پر نظر ڈالنا چاہیں گے۔جس کے تحت ہمیں یہ دکھانا ہے کہ اردو کا نظام صوت اتنی بلندیوں کا حامل اور اس درجہ وسعتوں کا مالک ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بھی زبان نہیں کرسکتی۔ وہیں ہم کو یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ اردو بولنے والا دنیا کی ہر زبان بآسانی بول سکتا ہے یہ صلاحیت قاری کے اندر اردو کی صوتی وسعت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اردو کے اندر حروف اوران کے مخارج کا وہ وسیع ذخیرہ ہے جس کی وجہ سے اردو بولنے والا دنیا کی ہر زبان بول سکتا ہے۔اور اس کے مصوتوں اور مصمتوں کی بحسن و خوبی ادائیگی کرنے کی مکمل صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔

زیرِ نظر سطور میں انہی حقائق پر روشنی ڈالی جارہی ہے اوراپنے موضوع کی رعایت سے اس حقیقت کوواضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اردو زبان کا صوتی نظم کس قدر وسعتوں کا حامل اور رفعتوں کا مالک ہے۔تو آیئے سب سے پہلے ہم اردو کے حروف، مصمتوں اور مصوتوں وغیرہ پر نظر ڈالیں گے۔تاکہ اپنے موضوع پر مزید تحریر کرسکیں اوراپنے قارئین پر اردو زبان کی صوتی وسعت ثابت کرسکیں۔

اہلِ نظر جانتے ہی ہوں گے کہ اردو کوئی باقاعدہ زبان نہیں بلکہ کچھ زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ بنیادی اعتبار سے تو اس میں عربی، فارسی کے ہی حروف و الفاظ ہیں۔مگر ان کے ساتھ ہی اردو کے ماہرین لسانیات نے اس میں سنسکرت، ہندی، ترکی، پشتو، پنجابی اور دیگر زبانوں کے حروف و الفاظ بھی شامل کر لیے ہیں۔اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ اردو میں عربی حروف یہ ہیں؛ ث، ح، ذ،ص،ض، ط، ظ، ع،ق یہ حرف قدیم فارسی اور ہندی یا سنسکرت میں نہیں پائے جاتے۔

اردو میں یہ حروف فارسی سے لیے گئے ہیں؛ ژ۔ ہمارے یہاں عربی، فارسی کے مشترک حروف ہیں؛ ز، ف، خ، غ کی آوازیں عربی اور فارسی کی مشترک آواز ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میں کچھ مخلوط آوازیں بھی ہیں۔ جو ہندی حروف کے نعم البدل کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں جیسے؛ ٹ، ڈ، ڑ اور مخلوط آوازوں میں؛ بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ ہیں۔ یہ حروف کی خالص ہندی آوازیں ہیں جن کو ماہرین اُردو نے ہندی حروف کے تلفظ کے لیے وضع کیا ہے۔

یہاں کچھ لوگوں کو یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ہندی حروف کو اردو میں مخلوط آوازوں کی شکل میں ادا کرنا اردو کی صوتی تہی دامنی کی دلیل ہے کہ اردو اپنے ایک حرف کے ذریعے ہندی مصوتوں کو آواز دینے سے قاصر ہے۔ مگر یہ اعتراض کسی طرح بھی مناسب و درست نہیں ہے

کہ ایسی مثالیں دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بطور مثال ہم انگریزی کو ہی لے سکتے ہیں۔ جس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہم شوکت سبزواری صاحب کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ جس میں وہ رقمطراز ہیں:

''میں کہتا ہوں اردو اندازِ تحریر رومن سے زیادہ صحیح اور معقول ہے کہ رومن میں "KH" کو ''کھ'' بھی پڑھ سکتے ہیں اور ''خ'' بھی جب کہ اردو میں ''کھ''، کھ ہے اور ''خ''، خ۔'' (اردولسانیات:ڈاکٹرشوکت سبزواری،ص39)

اس حقیقت کو کچھ اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے مزید اس تفصیل کو ملاحظہ فرمائیں کہ انگریزی میں ش کی آواز کے لیے "SH,TION" اور کہیں کہیں "CH" مل کر بھی صوتی آہنگ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یعنی ایک مصوتے کی ادائیگی کے لیے چار حروف کا سہارا لیتا تو اگر مذکورہ بالا اعتراض کی روشنی میں ہندی کے ख کے لیے اردو کو ک+ ھ کا سہارا لینے پر صوتی تنگ دامنی کہا جائے گا۔تو بیچاری انگریزی کو کس درجہ میں رکھیں گے؟

آیئے! اب ہم اپنی ایک اور اہم زبان ہندی کو لیتے ہیں کہ اگرچہ ہندی کی حروف تہجی (ورن مالا) ایک وسیع وعریض अक्षर वर्ण माला ہے کہ اس میں حروف کی کثیر تعداد ہے اور بہت سی آوازیں ہیں۔ اور ایک ایک آواز کے لیے متعدد حروف ہیں۔ جیسے र کی بہت سی شکلیں ہیں اور کچھ مشترکہ मिश्रित آوازیں بھی ہیں۔ क اور श کی مشترکہ آواز क्ष اور त اور र کی مشترکہ آواز त्र اور न اور ड,ण وغیرہ۔ صوتی اعتبار سے پوری طرح مالا مال ہونے کے باوجود جب دوسری زبانوں کے مصوتوں کی ادائیگی کی بات آتی ہے تو ہندی ہم کو پوری طرح تہی دامن نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہاں پر کچھ مثالیں پیش کرتے ہوئے اپنے دعوے کی دلیل دینا چاہیں گے۔ دیکھیے اردو زبان میں ایک خاص آواز ہے ج۔ اب دیکھیے اس کی ضمنی وذیلی یا قریب المخرج کتنی آوازیں اور ہیں۔ ز، ذ، ظ، ض، ژ۔ اسی طرح اصل آواز 'س' کی بھی دوسری قریب المخرج آوازیں دیکھی جاسکتی ہیں جو اس طرح ہیں ش، ث، ص۔ اب ہم اس کی مثالیں دیکھتے ہیں۔ ہمیں ایک لفظ جہاز لکھنا ہے تو ہندی زبان اس کی آواز دینے پر قادر ہے۔ مگر اسی حرف کی دوسری آوازیں زاہد، ذلت، ظروف، ضامن لکھنا چاہیں گے تو ہندی یہاں پر پوری طرح سے محروم ومجبور نظر آئے گی۔ اسی طرح 'س' کو بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی ضمنی آوازیں ث، ص، کی ادائیگی بہت سے ہندی والے نہیں کرسکیں گے۔ کیونکہ یہ مصوتے ہندی زبان میں موجود ہی نہیں ہیں۔ مزے دار بات تو یہ ہے کہ بعض حضرات مخرج کی ادائیگی میں اس درجہ کمزور واقع ہوئے ہیں کہ ج کی جگہ ز اور ز کے مقام پر ج بول جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ ف اور پھ میں بھی امتیاز کرنے سے قاصر ہیں۔

یہاں پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زبانوں کے صوتی نظم کو سمجھنے کے لیے اس کی کچھ تفصیل سمجھ لی جائے۔ 'صوتیہ' دراصل انگریزی زبان کے لفظ PHONEME کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر فرتھ کی تحقیق کے مطابق یہ اصطلاح 1879 میں وضع ہوئی اس بحث کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس کو بغور ملاحظہ کیا جائے:

''اس میں شک نہیں کہ 'صوتیہ' کا تعلق انسانی آواز سے ہے۔ صوتیہ کے معنی ہیں صوت کی طرف منسوب اور اس سے متعلق۔ صوتیہ بے شبہ صوتی اکائی ہے۔ جسے مزید اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا لیکن صوتیہ کے تصور کے بنا صوتی اکائی کی ماہیت یا اصلیت پر نہیں اس کے استعمال یا منصب (Function) پر ہے۔ الفاظ آوازوں سے ترکیب پاتے ہیں۔ آوازیں مختلف ہیں۔ الفاظ میں اختلاف یا تعدد مختلف آوازوں کی وجہ سے ہے۔ آوازوں میں کیا اختلاف ہے اور کس نوعیت کا اختلاف ہے؟ اس مسئلے کا تعلق صوت (آواز) سے ہے۔ یا یوں کہیے اس علم وفن سے ہے جس کا موضوع صوت ہے اور جسے علم الاصوات (Phonetics) کہتے ہیں۔'' (اردولسانیات: ڈاکٹرشوکت سبزواری۔ص52)

یہاں پر لفظ 'صوتیہ' کی بحث چل رہی ہے اور اس سے ہی 'مصوتہ' اور 'مصمتہ' الفاظ بنے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو اچھی طرح ذہن نشیں کرنے کے لیے ہم مصوتہ اور مصمتہ کو بھی سمجھتے چلیں تاکہ اس بحث کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ عصمت جاوید صاحب کے مطابق اس کی تفصیل اس طرح ہے:

''دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح اردو میں بھی صوتیوں کی دو قسمیں ہیں۔ مصوتہ اور مصمتہ۔ اگر کوئی کلامی آواز صرف منھ کی اندرونی شکل میں تغیر وتبدل کر کے اور زبان کو مختلف حالتوں میں اٹھا کر نیچا کر کے اس طرح ادا کی جائے کہ آواز منھ میں کسی جگہ رکے بغیر باہر آئے تو اس گلابی آواز کو 'مصوتہ' کہتے ہیں۔ اور جو کلامی آواز ذہنی گزرگاہ میں کسی مقام پر مکمل یا جزوی طور پر رک کر رگڑ کھاتی ہوئی یا رخ بدل کر نکلے اسے 'مصمتہ' کہا جاتا ہے۔''

(نئی اردوقواعد:عصمت جاوید،ص30)

اس بحث کو مزید بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے سطورِ ذیل میں مذکورہ بالا کتاب سے ہی ایک اور اقتباس پیش کرنا چاہیں گے تاکہ ہمارے قارئین کے ذہنوں میں یہ حقیقت اچھی طرح اتر جائے اور وہ نفسِ مضمون کو بآسانی سمجھ سکیں:

''یہ طے کرنے کے لیے کہ کس زبان میں کون کون سی آوازیں استعمال ہوتی ہیں یہ دیکھا جاتا ہے کہ فلاں آواز 'امتیاز' معنی کا کام دیتی ہے یا نہیں اگر اس آواز کی جگہ دوسری آواز استعمال کرنے سے معنی میں فرق پیدا ہو جائے تو یہ آواز اس زبان کے صوتی نظام میں شامل قرار دی جائے گی اور اصطلاح میں اسے اس زبان کا صوتیہ (فونیم) کہتے ہیں۔'' (نئی اردوقواعد:عصمت جاوید،ص30)

اب آیئے اس سلسلے میں کچھ اور مثالیں دیکھیے۔ فارسی زبان میں بھی چونکہ بہت سی آوازیں نہیں ہیں۔ اس لیے وہ بھی دیگر زبانوں کی حروف کی آوازوں میں قاصر نظر آئے گی۔ اس سلسلے میں کچھ حضرات کا یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہر زبان کی اپنی حروف تہجی اور نظام ہجا ہے۔

دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح اردو میں بھی صوتیوں کی دو قسمیں ھیں۔ مصوتہ اور مصمتہ۔ اگر کوئی کلامی آواز صرف منہ کی اندرونی شکل میں تغیر و تبدل کر کے اور زبان کو مختلف حالتوں میں اٹھا کر نیچا کر کے اس طرح ادا کی جائے کہ آواز منہ میں کسی جگہ رکے بغیر باھر آئے تو اس گلابی آواز کو' مصوتہ' کھتے ھیں۔ اور جو کلامی آواز دھنی گزرگاہ میں کسی مقام پر مکمل یا جزوی طور پر رک کر رگڑ کھاتی ھوئی یا رخ بدل کر نکلے اسے 'مصمتہ' کھا جاتا ھے۔

اور اس کے اپنے مخصوص حروف ہیں۔ اس لیے وہ اپنے تمام حروف بولنے پر قادر ہوا کرتے ہیں دوسری زبانوں سے انھیں کیا غرض۔ اس اعتراض کا جواب یہی ہے کہ ہمارے اس مضمون کا اصل موضوع ہی یہ ہے کہ اپنی زبان بولنا ہی کوئی خاص بات نہیں بلکہ دنیا کی بہت سی اہم اور قابلِ ذکر زبانوں کے حروف ادا کرنے کی صلاحیت صرف اور صرف اردو زبان میں ہی ہے۔ دنیا کی دیگر زبانیں اس صلاحیت سے پوری طرح خالی وبے زار ہیں۔ مندرجہ بالا سطور میں ان کی مثالیں پیش کی جاچکی ہیں۔ دراصل یہی اردو زبان کا حسن، خوبصورتی، قادر الکلامی اور اعجاز ہے۔ اور اسی پر اس کی وسعت اور فصاحت وبلاغت کا انحصار ہے۔ جو دیگر زبانوں میں دیکھنے کونہیں ملتا۔

ان تمام دلائل وحقائق کی بنیاد پر بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ معلومہ حقائق کی روشنی میں اردو دنیا کی وہ واحد زبان ہے جو دوسری زبانوں کے مصمتوں اور مصوتوں کو پوری طرح ادا کرنے پر قادر ہے۔ یہاں تک کہ علاقائی زبانیں تو کیا اردو بولنے والے جاپانی، چائنیز، اطالوی اور فرانسیسی زبانیں بھی بخوبی بول سکتے ہیں۔ کہ اردو میں ان زبانوں کی آوازیں بھی موجود ہیں۔ آیئے اب ہم اردو زبان کے حروفِ ہجا پر پھر ایک نظر ڈال لیں تاکہ ہمیں اس کی صوتی وسعت کا بآسانی اندازہ ہو سکے۔

اردو حروف صحیح اس طرح ہیں:

خالص ہندی حروف: ٹ، ڈ، ڑ، پھ، تھ، ٹھ، چھ، کھ، بھ، دھ، ڈھ، جھ، گھ، ڑھ

خالص فارسی حرف:۔ ژ

خالص عربی حروف:۔ ذ،ض،ط،ظ،ث،ص،ع،ح،ء

ہندی، فارسی مشترک حروف: ب، پ، ت، ج، چ، د، ر، س، ش، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی

ہندی، عربی مشترک حروف:۔ ب، ت، ج، د، ر، س، ش، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی

مشترک حروف:۔ ب، پ، ت، ج، چ، د، ر، ز، س، ش، ف، غ، ک، ق، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی

ان میں بھی ز، خ، ف، غ، عربی اور فارسی میں مشترک ہیں۔ پ، چ، گ ہندی اور فارسی میں اور ق عربی اور ترکی میں باقی حروف ان تمام زبانوں سے لیے گئے ہیں، جن سے اردو نے استفادہ کیا ہے۔

اردو زبان کی صوتی وسعت کو سمجھنے کے لیے ابھی کچھ اور معلومات ہم اپنے قارئین کوفراہم کرانا چاہتے ہیں۔ جس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کا ذخیرہ حروف تہجی دنیا کی کتنی زبانوں سے مالامال ہے۔ اس کو اس طرح سمجھئے کہ حرف 'ژ' جو اردو میں بظاہر تو فارسی سے لیا گیا ہے مگر جاننا چاہیے کہ یہ آواز انگریزی اور فرانسیسی بورژوا میں بھی ہے۔ اسی طرح 'ظ' کی آواز عربی کے ساتھ ہی اطالوی میں بھی ہے اور ث، ذ، ع اور ء کی آوازیں یونانی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس طرح ہم اردو حروفِ تہجی کی وسیع دامانی کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ جس کا اعتراف ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی کتاب میں اس طرح کرتے ہیں:

"اس تفصیل سے اردو حروفِ صحیح کی جامعیت ثابت ہوتی ہے۔ اردو کی طرح جو ایک طرح سے کھچڑی زبان ہے۔ اس کے حروف بھی کھچڑی ہیں۔ چنانچہ اردو کی لفظی تعمیر میں حصہ لینے والی ہر زبان کا لفظ اپنی اصلی آواز کے ساتھ اردو تحریر میں متشکل کیا جا سکتا ہے۔ ان حروف کو

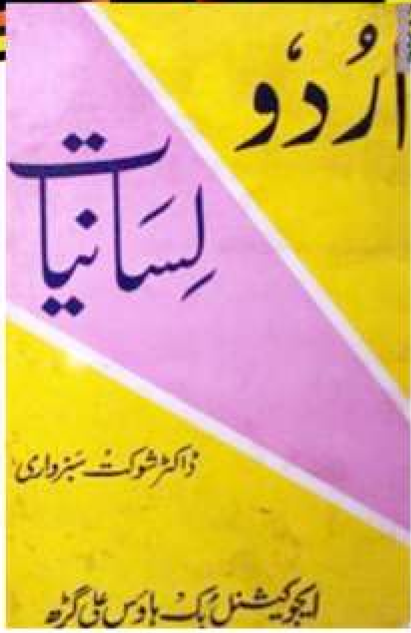

اس لحاظ سے بین الاقوامی زبان کا درجہ حاصل ہے۔"

(اردو لسانیات: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص 44)

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں اگرچہ اردو کے حروف تہجی میں دنیا کی متعدد زبانوں کے حروف شامل ہیں مگر اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں نمایاں مقام عربی اور فارسی زبانوں کو ہی حاصل ہے۔ اور ان دونوں زبانوں کی اردو پر گہری چھاپ دیکھنے کو ملتی ہے جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

"لفظ کی ابتدائی، درمیانی اور آخری حالتوں کا تقسیمی سانچہ بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اردو چونکہ ایک مخلوط زبان ہے۔ اس لیے اس کی بہت سی تکلمی آوازیں اور الفاظ عربی وفارسی سے مستعار ہیں۔"

(مقالاتِ مسعود: پروفیسر مسعود حسین، ص 24)

ان حروف کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں کچھ آوازیں ایسی ہیں جو دوسری زبان والے بولنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ یہاں پر ہم تین معروف زبانوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پر بحث کرنا چاہیں گے۔ ان زبانوں میں عربی، ہندی اور انگریزی زبانوں کو دیکھتے ہیں۔ اور کچھ حروف پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کریں گے کہ کس زبان کے بولنے والے کون سی دوسری زبان یا زبانوں کے حروف کی ادائیگی کرنے پر قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے دنیا کی وسیع ترین زبان عربی (جس کے بولنے والوں کو اپنی قادر الکلامی پر اس درجہ فخر وغرور تھا کہ وہ خود کو عرب یعنی بولنے والا اور دوسرے تمام لوگوں کو عجم یعنی گونگا کہا کرتے تھے) کو ہی لیتے ہیں۔ اپنی معلومات کی حدود اور موضوع کی مناسبت سے بھی اگر ہم انگریزی زبان کو ہی عربی کے مدِ مقابل رکھتے ہیں تو عربی زبان میں اس کے کچھ حروف کو تلفظ دینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بطور مثال یہاں پر انگریزی کے D,G,P,T وغیرہ کو ہی لیجیے۔ تو عربی زبان ان حروف کا تلفظ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یعنی DALDA, POLICE, GUN اور TELEPHONE الفاظ نہیں بول سکتے۔ کیونکہ عربی میں حروف پ، ٹ، ڈ اور گ نہیں ہے۔ مجبوراً ان کو کن یا قن، فولس، دالدا اور تیلی فون بولنا پڑتا ہے۔ اس طرح عربی داں حضرات ہندی کے بھی بہت سے حروف کے تلفظ دینے میں کامیاب نہیں ہیں۔ اب ہم انگریزی زبان کو دیکھنا چاہیں گے کہ انگریزی داں حضرات بھی عربی کے بہت سے حروف کا تلفظ نہیں کر سکتے۔ بطور مثال دولت اور تلاوت کو ہی لیجیے کیونکہ انگریزی میں حروف 'د' اور 'ت' کی آوازیں نہیں ہیں۔ اس لیے وہ ڈولٹ اور ٹلاوٹ بولنے پر مجبور ہوں گے۔ جبکہ اہلِ اردو الفاظ گن، پولس، ڈالڈا، ٹیلی فون، دولت اور تلاوت بآسانی بول سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اگر ہندی کو دیکھا جائے تو اس کی وسیع تر حروفِ تہجی ہونے کے باوجود بھی بہت سے ہندی بولنے والے دوسری زبانوں کے بہت سے مصوتوں اور مصمتوں کا تلفظ کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان صوتی اعتبار سے دنیا کی بہت سی زبانوں کے مقابلے میں برتر اور اعلیٰ ہے۔ کہ وہ بہت سے تلفظ اور صوتی وسعتوں سے پوری طرح مالامال ہے۔ اور اردو خواں حضرات دنیا کی اکثر زبانوں کے حروف اور مصمتوں اور مصوتوں کی باقاعدہ ادائیگی کر سکتے ہیں۔ دراصل یہی اردو کی فصاحت ہے اور اسی کو ہی بلاغت کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہی اردو کا حسن ہے جو اس کو مرنے نہیں دیتا اسی کی بنیاد پر یہ ابدالآباد تک قائم رہے گی۔ اور اسی کی بنیاد پر ہی تو حضرت داغؔ فرما گئے ہیں۔

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ماخذات

1 مقالاتِ مسعود: پروفیسر مسعود حسین، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
2 اردو لسانیات: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
3 قواعد اردو: مولوی عبدالحق، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
4 نئی اردو قواعد: عصمت جاوید، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

Dr. Raza Ur Rahman Akif Sambhali
Miyan Sarai
Sambhal (UP)
Mob.:9837826809
Email.: sambhali@gmail.com

آفتاب عالم

ہندوستانی آئین میں اردو زبان کا مقام

انسانی زندگی میں زبان کی اہمیت

انسان فطری طور پر معاشرے میں ایک ساتھ زندگی گزارنا پسند کرتا ہے اسی وجہ سے بنی نوع انسان نے موجودہ معاشرے کی تشکیل کی ہے۔ زبان انسانی تعلق کا ایک اہم جز ہے۔ اگر چہ تمام انواع کے جاندار کے رابطے کے طریقے الگ الگ ہیں لیکن انسان کے رابطے کا ذریعہ صرف زبان ہے۔ زبان میں معاشرے کو بنانے اور تباہ کرنے دونوں کی طاقت ہے۔ انسان کی زندگی میں زبان کی اہمیت ناقابلِ تردید ہے کیوں کہ جذبات، احساسات اور نظریات کے اظہار اور آپسی تعامل اور تہذیب وتمدن کے تحفظ اور ترسیل کا واحد ذریعہ زبان ہے۔ زبان ہی ہے جو انسان کو تمام جاندار سے ممتاز کرتی ہے اور اہم، بے مثال اور اعلیٰ ترین مخلوق بناتی ہے۔ زبان صرف ذریعہ مواصلات ہی نہیں بلکہ جب ہم بات کرتے ہیں، پڑھتے اور لکھتے ہیں یہاں تک کہ جب ہم سماج بنانے کے عمل میں ہوتے

> **زبان اور ثقافت دونوں ہی انسانی زندگی کے لازمی جز ہیں نیز زبان ثقافت کا تعین کرتی ہے اور اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ثقافت کے بغیر زبان مردہ ہے اور زبان کے بغیر ثقافت کی کوئی شکل نہیں ہوگی۔**

ہیں، گاڑی چلاتے ہیں یا تجارت کرتے ہیں ہر جگہ زبان کو کسی نہ کسی شکل میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ زندگی کے ہر پہلو میں زبان شامل ہے۔ زبان کی اصطلاحی تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ زبان الفاظ، علامتوں، نشانیوں، آوازوں، اشاروں کا ایک نظام ہے، جس کا استعمال ایک طبقہ، قوم اور ایک ثقافت کے لوگوں میں عام ہوتا ہے۔

زبان اور ثقافت

زبان اور ثقافت میں ایک گہرا ربط ہے اور دونوں کے مابین جز اور کل کا رشتہ ہے۔ ہر زبان کسی نہ کسی مخصوص قوم اور لوگوں کی جماعت کی نشاندہی کرتی ہے اور اس کی ثقافت کا اظہار اسی زبان کے ذریعے ہوتا ہے۔ جب ہم کسی دوسری زبان والے کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس ثقافت کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔ دنیا کی کسی بھی ثقافت تک رسائی اور اس کی سمجھ بغیر اس کے متعلق زبان کے نہیں ہوسکتی۔ کرامچ (1991) نے کہا ہے کہ زبان اور ثقافت دونوں لازم اور ملزوم ہیں اور ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ زبان اور ثقافت دونوں ہی انسانی زندگی کے لازمی جز ہیں نیز زبان ثقافت کا تعین کرتی ہے اور اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ثقافت کے بغیر زبان مردہ ہے اور زبان کے بغیر ثقافت کی کوئی شکل نہیں ہوگی۔ زبان انسان کی شخصیت اور اس کی تہذیب وثقافت کا لازمی جز ہے، جس کا کردار نوع انسانی کو وحشت سے نکال کر معاشرتی زندگی میں لانے میں اہم ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک تہذیب وثقافت اور علوم وفنون منتقل کرنے میں زبان کا رول ناقابل فراموش اور ناقابل تردید ہے۔

اردو زبان اور اس کی مقبولیت

اردو زبان خالص ایک ہندوستانی زبان ہے جس میں اتنی شیرینی ہے کہ اس کو محبت کی زبان کہا جاتا ہے اور اس کی ابتدا بھی غزل اور عشق وعاشقی کی شاعری سے ہوئی ہے۔ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی اس زبان کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں آئی بلکہ برصغیر کی نہایت مقبول اور ہندوستان کی آئینی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس

زبان پر عربی اور فارسی کے اثرات ہونے کے باوجود ہندی کی طرح ایک ہند آریائی زبان ہے جس کی پیدائش اور ترقی برصغیر ہند میں ہوئی۔ اردو اور ہندی دونوں جدید ہند آریائی زبانیں ہیں اور دونوں کی اساس یکساں ہے، صوتی اور قواعدی سطح پر دونوں زبانیں اتنی قریب ہیں کہ ایک زبان معلوم ہوتی ہیں لیکن طریقہ استعمال اور رسم الخط کی سطح پر دونوں میں فرق نمایاں ہے۔

اردو جنوبی ایشیا کی اہم اور بڑی عوامی زبانوں میں سے ایک ہے اور روز بہ روز اس کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ حقیقت میں یہ زبان عوامی تہذیب کی سطح پر ترسیل کا ذریعہ ہے اور فلموں، ڈراموں اور تمام طرح کے تفریحی پروگرام میں وسیع پیمانے پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود کہ اردو دنیا کی نئی زبانوں میں سے ایک ہے لیکن اپنے پاس معیاری ادب اور اس کا ایک وسیع ذخیرہ رکھتی ہے اور خصوصاً جنوبی ایشیائی زبانوں میں یہ اپنی شاعری کے حوالے سے مشہور اور معروف ہے۔

ہندوستان میں زبان کی پالیسی

ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ اس ملک میں زبان، تہذیب وتمدن، نسل، مذہب اور ذات وغیرہ کا تنوع نہایت ہی قدیم اور مضبوط ہے۔ تنوع اس ملک کی شناخت ہے اور اس کثیر ثقافتی اور کثیر لسانی معاشرے میں موجود امن وشانتی اور بھائی چارے کی وجہ ہے کہ تنوع میں وحدت کے لیے دنیا میں ہندوستان کی مثال دی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد مجلس دستور ساز نے آئین ہند میں بھی اس تنوع کا پاس ولحاظ رکھا۔ عہد قدیم اور عہد وسطی نیز عہد جدید میں بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف حکمرانوں کی حکومت ہونے کی وجہ سے مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس ملک میں افراد بیک وقت کئی زبانیں استعمال کرتے ہیں مثلاً ایک زبان معاشرے میں دوسری زبان آفس میں اور تیسری زبان مذہبی معلومات اور رسومات میں۔ تاریخی طور پر اکثر ممالک میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمیشہ مذہبی رسومات، عدالت اور اشراف کی زبان، تعلیم اور ادب وثقافت کی زبان اور گھر اور معاشرے کی ایک زبان ہوتی ہے اور اعلی تعلیم اور اشراف کی زبان کا ہی غلبہ رہتا ہے لیکن ہمارا ملک ہندوستان اس معاملے میں منفرد ہے کیوں کہ ہندوستان میں ہر 80-60 کیلومیٹر میں زبانیں بدل جاتی ہیں اور کسی ایک زبان کا غلبہ بھی نہیں ہے۔ ویدک عہد میں رابطے کی زبان سنسکرت تھی، اس کے بعد پالی، عہد وسطی میں فارسی اور پھر اردو اور انگریزوں کے دور میں انگریزی اور آزادی کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہندی کے ساتھ اردو بھی رابطے کی زبان ہے۔

آئین ہند

یہ آئین جمہوریہ ہند کا دستور اعلی اور دنیا کا سب سے ضخیم تحریری دستور ہے جس میں جمہوریت کے بنیادی سیاسی نکات اور حکومتی اداروں کے ڈھانچے، طریقہ کار، اختیارات اور ذمے داریوں نیز شہریوں کے بنیادی حقوق، رہنما اصول اور ان کی ذمے داریاں شامل ہیں۔ اس دستور کا معمار اعظم ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر ہیں جو آئین ہند کی مجلس مسودہ سازی کے صدر تھے۔ آئین ہند کے مطابق دستور کو موجودہ پارلیمان پر فوقیت حاصل ہے لہذا پارلیمان اس دستور کو معطل نہیں کر سکتی ہے۔ آئین ہند کو مجلس دستور ساز نے 26 نومبر 1949 کو تسلیم کیا اور 26 جنوری 1950 کو نافذ کیا۔ نفاذ کے وقت یہ دستور 22 ابواب، 8 درج فہرست اور 395 پر مشتمل تھا اور جنوری 2019 کے ڈاٹا کے اعتبار سے 103 ترمیم کے بعد اس دستور میں 25 ابواب، 12 درج فہرست اور 448 ہیں۔ اس ملک کے عاملہ، مقننہ اور عدلیہ کو اختیار اسی دستور سے ملتا ہے اور سب اسی کے پابند ہیں۔

دستور ہند کی دفعہ 21 اور 21 اے

دفعہ 21 کے تحت اس ملک کے ہر شہری کو اپنی زندگی اور ذاتی آزادی کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ قانون کے ذریعے قائم کردہ طریقہ کار کے علاوہ کسی بھی شخص کو اس کی زندگی اور ذاتی آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دفعہ 21 اے شہریوں کو یہ بنیادی حق دیتا ہے کہ ریاست چھ سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم مہیا کرے اور اس کے لیے ریاست قانون بنا سکتی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں چودہ کی عمر کو بڑھا کر 18 کر دیا ہے۔ اب اس میں اسکول کی مکمل تعلیم آجاتی ہے جو مفت اور لازمی اس ملک کے ہر بچے کو دی جائے گی۔

دونوں دفعات سے یہ استخراج ہوتا ہے کہ اس ملک کا ہر شہری اپنی مرضی سے جینے اور آزادی سے جینے کا بنیادی اور آئینی حق رکھتا ہے اور اس آزادی سے جینے میں اپنے تہذیب وتمدن، ثقافت اور ریتی رواج کے ساتھ جینا شامل ہے۔ 2009 میں Right to Education (آرٹی ای) ایکٹ پاس ہوا جس کا مقصد اس ملک کے ہر بچے کو مفت اور لازمی اسکول کی تعلیم دینا ہے۔ لہذا وہ اپنے آئینی حقوق، ذمے داریاں اور تہذیب وتمدن، ثقافت اور ریتی رواج اور اس کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو جائیں گے اور ان کے تحفظ کے لیے اقدامات بھی اٹھا سکیں گے۔ جس فرد اور شہری کی تہذیب وتمدن، ثقافت کا حصہ اردو زبان ہے وہ صرف اس کے ساتھ جینے پر اکتفا نہ کرکے اس کے تحفظ کے لیے اپنے آئینی حقوق کا استعمال اور اقدامات بھی اٹھائیں گے۔

ہر مذہب اس کی تعلیمات کسی نہ کسی زبان کے سہارے لوگوں تک پہنچتی ہیں۔ اردو کی ابتدائی دور میں ترویج واشاعت اور ترقی میں صوفیائے کرام کا ناقابل فراموش کردار رہا ہے اور شروع سے ہی مدارس اور مکاتب بھی اس ضمن میں نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

> ”
> **تاریخی طور پر اکثر ممالک میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمیشہ مذہبی رسومات، عدالت اور اشراف کی زبان، تعلیم اور ادب و ثقافت کی زبان اور گھر اور معاشرے کی ایک زبان ہوتی ہے اور اعلی تعلیم اور اشراف کی زبان کا ہی غلبہ رہتا ہے لیکن ہمارا ملک ہندوستان اس معاملے میں منفرد ہے کیوں کہ ہندوستان میں ہر 80-60 کیلومیٹر میں زبانیں بدل جاتی ہیں اور کسی ایک زبان کا غلبہ بھی نہیں ہے۔ ویدک عہد میں رابطے کی زبان سنسکرت تھی۔ اس کے بعد پالی، عہد وسطی میں فارسی اور پھر اردو اور انگریزوں کے دور میں انگریزی اور آزادی کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہندی کے ساتھ اردو بھی رابطے کی زبان ہے۔**
> “

ہندوستان بلکہ اس برصغیر میں اسلامی تعلیمات اور مذہبی معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو زبان میں موجود ہے۔ مذکورہ بالا دفعات کے ذریعے حاصل شدہ بنیادی حقوق کے حصول کے ضمن میں اردو زبان کا تحفظ اور ترویج واشاعت کی جا سکتی ہے۔ آئین ہند مذہب کے تعلق سے جو بنیادی حقوق فراہم کرتا ہے اس کے ذریعے مختلف

زبانوں کو تحفظ حاصل ہے اور ان کی وجہ سے زبان کی بھی حفاظت کی جاسکتی ہے۔

دستور ہند کی دفعہ 29 اور 30

دفعہ 29 اور 30 دونوں اقلیتوں کو کچھ مخصوص حقوق کی ضمانت دیتی ہیں۔ دفعہ 29 اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ اس طرح کرتی ہے کہ کوئی بھی الگ زبان، رسم الخط اور ثقافت رکھنے والے شہری اور قوم کو اپنے ان امور کے تحفظ کا مکمل حق حاصل ہے۔ ان دفعات کے تحت کسی کے ساتھ بھی مذہب، نسل، ذات، زبان یا ان میں کسی کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ دفعہ 30 اقلیتوں (مذہب یا زبان کی بنیاد پر ہو) اس بات کا حق دیتا ہے کہ وہ اپنے اعتبار سے تعلیمی ادارے قائم کریں اور انتظام کریں۔ حکومت اقلیتوں کے اداروں میں مداخلت نہیں کرسکتی اور نا ہی ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہوئے ان کی امداد روک سکتی ہے۔ لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے قومی اقلیتی کمیشن کا قیام عمل میں آیا ہے۔

یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ زبان افراد کی ثقافت اور تہذیب و تمدن کا ایک جزو لاینفک ہے اور جن لوگوں کی زبان اردو ہے یہ ان کی بھی ثقافت کا ایک حصہ ہے۔ لہذا اس کے بولنے والوں کو مکمل آئینی حق حاصل ہے کہ اس کا تحفظ کریں اور اس غرض سے اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور حکومت سے امداد بھی حاصل کریں۔ آئین ہند کی یہ دو دفعات اردو زبان والوں کو بنیادی حق دیتی ہیں کہ اس زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے ہمہ جہت کوششیں کریں۔ ان ہی دفعات کے تحت ملک میں لاکھوں لسانی اقلیتی تعلیمی ادارے قائم ہیں اور لسانی خدمات میں مشغول ہیں خصوصی طور پر اردو زبان میں تعلیم دینے والے تعلیمی ادارے لامحدود ہیں جن سے اردو زبان کا براہ راست فروغ ہو رہا ہے۔

دستور ہند کی دفعہ 350، 350اے اور 350 بی

دفعہ 350 ہر شہری کو حق دیتی ہے کہ وہ اپنی شکایت کے ازالے کے لیے یونین اور صوبے کے کسی افسر یا اتھارٹی کے پاس اس ملک میں استعمال ہونے والی کسی بھی زبان میں اپنی نمائندگی پیش کرے۔ 350 اے کے تحت اس ملک کی ہر ریاست اور مقامی اتھارٹی کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ لسانی اقلیتی گروہوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو تعلیم کے بنیادی مرحلے میں مادری زبان میں تعلیم کے لیے مناسب سہولیات مہیا کریں۔ صدر جمہوریہ کسی بھی ریاست کو اس طرح کی ہدایات جاری کرسکتے ہیں اگر وہ اس طرح کی سہولیات کی فراہمی کو محفوظ بنانے کے لیے ضروری یا مناسب سمجھتا ہے۔ 350 بی کے تحت لسانی اقلیتوں کے لیے ایک خصوصی افسر کی تقرری صدر جمہوریہ کے ذریعے کی جائے گی۔ یہ افسر آئین کے تحت لسانی اقلیتوں کو حاصل شدہ حقوق کی حفاظت سے متعلق تمام معاملات کی تحقیقات کرے گا اور صدر جمہوریہ کو رپورٹ کرے گا، یہ رپورٹیں ہر سال ایوان کے سامنے رکھی جائیں گی اور متعلقہ ریاستوں کی حکومتوں کو بھی بھیجی جائیں گی۔ ان دفعات کے مدنظر اردو کے محبین حکومتی معاملات میں اردو زبان کا کثرت سے استعمال کرسکتے ہیں اور حکومتوں کو پابند کراسکتے ہیں کہ ان کے بچوں کو اردو زبان میں ہی بنیادی تعلیم مہیا کرائیں اور ایسا نہ ہونے پر اس کی شکایت اس افسر سے کرسکتے ہیں۔

دستور ہند کی دفعہ 345 اور 347

دفعہ 345 ملک کی ہر ریاست کو حق دیتی ہے کہ وہ اپنی مقننہ کے ذریعے ریاست میں بولی جانے والی زبانوں میں سے کسی ایک یا زیادہ زبان کو سرکاری زبان کے طور پر اپنا سکے۔ دفعہ 347 کے تحت ریاستیں اپنی عوام کے ایک مخصوص طبقے کے ذریعے بولی جانے والی زبان کو پوری ریاست میں یا کسی خاص حصے میں ان عوام کے تقاضے پر حکومتی زبان کے طور پر مان سکتی ہیں اور مخصوص انتظامات کرسکتی ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہندوستانی زبانوں کا فروغ

نئی تعلیمی پالیسی ہندوستان کی اکیسویں صدی کی سب سے اہم تعلیمی پالیسی ہے جو ایک لمبے انتظار کے بعد 2019 میں ایک مسودے کی شکل میں پیش کی گئی۔ ہندوستان کی یونین کابینہ نے اس مسودے کو 29 جولائی 2020 کو اپنی منظوری دی۔ یہ پالیسی ہر زاویے سے انقلابی، دوررس اور جامع ہے اور تعلیم کے تمام پہلوؤں جیسے بنیادی تعلیم، اعلی تعلیم، درس و تدریس، نصاب، تعلیمی نظم و نسق، صنعتی تعلیم، تعلیمی سرمایہ کاری، تعلیم بالغان اور تکنیکی تعلیم وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس پالیسی نے ملک کے تعلیمی ڈھانچے کے سارے زاویے جیسے قوانین، انتظام اور نظم و ضبط وغیرہ میں تصحیح اور سدھار کی پیشکش کی تا کہ ایک ایسا نیا نظام تیار کیا جائے جو اکیسویں صدی کے مقاصد کو پورا کرے اور امیدوں پر کھرا اترے۔

اس پالیسی کے ذریعے تمام ہندوستانی زبانوں جن میں اردو بھی شامل ہے کے تحفظ، نشو و نما اور فروغ کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس پالیسی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہر علاقے کی ثقافت و روایات کی صحیح شمولیت، اس کا تحفظ اور اسکولوں میں تمام طلبا کی صحیح تفہیم اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب قبائلی زبانوں سمیت تمام ہندوستانی زبانوں کو مناسب احترام دیا جائے۔ اس طرح صحیح معنوں میں ہندوستان کی زرخیز زبانوں جیسے اردو زبان اور ادبیات کا تحفظ کرنا بالکل ناگزیر ہے۔ اس پالیسی میں اس کی یقین دہانی کی گئی ہے کہ پورے ہندوستان میں مضبوط قومی اور علاقائی زبان اور ادب کے پروگراموں، اساتذہ کی تقرری، تحقیق اور کلاسیکی زبانوں کے فروغ کے ذریعے زبان، ادب اور سائنسی الفاظ پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔ کلاسیکی زبان و ادب کے فروغ کے لیے موجودہ قومی اداروں کو مضبوط کیا جائے گا اور ایک قومی انسٹی ٹیوٹ برائے پالی، فارسی اور پراکرت بھی قائم کیا جائے گا۔ سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کے کمیشن (Commission for Scientific and Technical Terminology) کا منشور اور فرمان یعنی ملک بھر میں یکساں استعمال کے لیے ذخیرہ الفاظ تیار کیا جائے گا۔

خاتمہ

مذکورہ بالا آئین کی دفعات اور ان میں اس ملک کے شہریوں کو دیے گئے حقوق اردو کی ترقی اور فروغ کا ضامن ہیں بشرطیکہ اس زبان کے بولنے والے اور اس کی محبت کا دعوی کرنے والے ان دفعات اور حقوق سے واقف ہوں۔ محض واقفیت بھی کافی نہیں ہے بلکہ اس زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے دیگر زبانوں کی طرح سعی مسلسل کی ضرورت ہے۔

اس زبان کی ترقی کے لیے خلوص کے ساتھ اس زبان کا کثرت سے استعمال کرنے، تعلیمی ادارے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہو قائم کرنے، اور اردو زبان کے فروغ کے لیے اس ملک میں قائم اداروں کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اس زبان کے تحفظ کے لیے آئین ہند کی جانکاری اور اس کی تعمیل نیز جمہوری اقدار اور طریقہ کار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس زبان میں اتنی حلاوت ہے کہ یہ زبان بذات خود ترقی کی راہ طے کرے گی بشرطیکہ اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اگر ہو تو اس کو دور کیا جائے۔

■

Aftab Alam
College of Teacher Education,
MANUU Darbhanga, Ilyas Ashraf Nagar
Chndanpatti, Laheria Sarai
Darbhanga- 846002 (Bihar)
Mob.:8285835517

رئیس انور

بہار میں شعری ادب اطفال

ادب کا بنیادی مقصد انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی ہے اور یہ ترجمانی ایسے دلکش، چنندہ اور موثر لفظوں کی بہترین ترتیب میں ہوتی ہے کہ پڑھنے والا مسرور اور محظوظ ہوتا ہے۔ اس پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کی آگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذہن و دل میں زندگی کی ناآشنا سچائیوں کے ستارے جھلملا اٹھتے ہیں۔ اس طرح ادب کا کام محض خیال یا احساس کی ترجمانی کرنا اور قاری کو حظ پہنچانا نہیں، عرفان و آگہی کی روشنی بکھیرنا بھی ہے۔

بات اگر ادب اطفال کی ہو تو اس تعریف میں قدرے ترمیم لازمی ہے کیونکہ بالغ اور باشعور قاری کی فہم و فراست اور نفسیات پختہ اور بالیدہ ہوتی ہے۔ وہ لفظوں کی ترتیب و تزئین کے اشاروں اور معنیاتی دائروں سے واقف ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بچوں (جن کی عمر چار سال سے بارہ سال تک کے درمیان ہو) کی سمجھ کی سطح، ان کی دلچسپیاں، ان کی خواہشیں، ان کی خیالی دنیا، ان کے خواب، ان کے الفاظ کا ذخیرہ، ان کا لسانی شعور اور ان کا موسیقیاتی لگاؤ بالکل الگ ہوتا ہے۔

بچے قوم و ملک کے بیش قیمت اثاثہ ہیں۔ جس طرح ان کی جسمانی پرورش و پرداخت کے لیے انھیں صاف ستھری آب و ہوا اور صحت بخش غذا فراہم کی جاتی ہے، اسی طرح ان کی ذہنی نشو و نما کے لیے صالح، روشن خیال، نصیحت آمیز اور اخلاقیات پر مبنی ادب سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے تاکہ ان کی جسمانی اور ذہنی بالیدگی توازن کے ساتھ ہو سکے۔ اس اہم اور بنیادی فریضے کا آغاز ماں کی گود سے ہوتا ہے۔ بہت سی بامعنی اور بے معنی باتیں سنتے سنتے بچہ جب کچھ بولنے کے مرحلے میں آتا ہے تو اپنے آس پاس کی دنیا ہی نہیں، زمین سے آسمان تک نظر آنے والی ساری چیزوں کے متعلق سوال کرتا ہے۔ اپنے ٹیڑھے میڑھے اور اٹ پٹے سوالوں کے ذریعے دراصل وہ اپنے خاندان، سماج اور کائنات سے جڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ چار سال کی عمر کے بعد بچوں کا شعور بیدار ہونے لگتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کا زبانی درس، تحریری صورت میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے۔ لوریوں سے آگے نکل کر بچے پریوں کی کہانیوں، دیومالائی اور اساطیری قصوں، کرشماتی اور جادوئی واقعات، اخلاقی اور مذہبی حکایتوں اور پہیلیوں میں دلچسپی دینے لگتے ہیں۔ یہ سب نہ صرف بڑے چاؤ سے سنتے ہیں بلکہ یاد رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ ہلکی پھلکی نظمیں اور گیت بھی مزے لے لے کر دہرانے لگتے ہیں۔ بچوں کی زندگی کا یہ دور بہت اہم ہوتا ہے۔ ان کی تربیت کے لیے ہر زبان کے قلمکاروں نے ایسے ادب پاروں کی تخلیق کی ہے جن کا مقصد انھیں لفظوں کی نغمہ بار لہروں میں ہچکولے دلانا، ہلکی پھلکی سچائیوں سے آگاہ کرنا اور ان کے اندر ایک پر تجسس، رنگا رنگ اور جگمگاتی دنیا خلق کرنا ہے۔

اردو میں ادب اطفال کی ایک بسیط تاریخ اور توانا روایت موجود ہے۔ غالباً اس کی شروعات تک بندی والی لوریوں اور پہیلیوں وغیرہ سے ہوئی۔ ابتدائی نمونے کے طور پر محققوں نے تیرہویں صدی عیسوی کے مشہور فارسی شاعر امیر خسرو سے منسوب کئی ہندوی / دہلوی دو سخنے، کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں پیش کی ہیں۔ یہاں ان میں سے چند درج کی جاتی ہیں۔

دو سخنے: انار کیوں نہ چکھا — وزیر کیوں نہ رکھا (دانا نہ تھا)
سموسہ کیوں نہ کھایا — جوتا کیوں نہ پہنا (تلا نہ تھا)

کہہ مکرنی: وہ آئے تب شادی ہوئے — اس میں دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگیں اس کے بول — اے سکھی ساجن نہ سکھی ڈھول (ڈھول)

پہیلی: (1) فارسی بولوں آئینہ — ترکی ڈھونڈھی پائی نہ
ہندی بولوں آرسی آئے — خسرو کہے نہ کوئی بتائے (آئینہ)

(2) ایک کہانی میں کہوں سن لے میرے پُوت
بن پنکھوں وہ گیا، باندھ گلے میں سوت (پتنگ)

فی الحال اس سے بحث نہیں کہ یہ تخلیقات امیر خسرو کی ہیں یا نہیں، دیکھنا صرف یہ ہے کہ قدیم صنفوں کے ان نمونوں میں بالکل سامنے کی باتیں آسان لفظوں اور دلچسپ انداز میں کہی گئی ہیں۔ ان میں ہندوستانی Texture ہے اور ہندوستانی بچوں کے مزاج کی ترجمانی ہے۔ بعد کے دور میں جب اردو کا چوکھا رنگ ابھر کر سامنے آیا تو میر، نظیر اکبر آبادی، اسماعیل میرٹھی، آزاد اور حالی سے علامہ شبلی، محبوب راہی، سراج انور اور حافظ کرناٹکی تک شاعروں، فکشن نگاروں اور مضمون نگاروں نے ادب اطفال پر بھی توجہ دی اور ایک قابل قدر ذخیرہ ہو گیا۔

بہار میں بھی نہ ادب اطفال کی کمی ہے اور نہ قلمکاروں کی۔ کئی جانے مانے قلمکاروں نے کبھی کبھی اپنی تخلیقی صلاحیتیں بچوں کے لیے وقف کی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مختلف شہروں سے بچوں کے لیے رسالے بھی نکلتے اور بند ہوتے رہے ہیں۔ خوبصورت تصویری کتابچے بھی بڑے اہتمام سے شائع ہوئے ہیں۔ جہاں تک شعری ادب اطفال کا تعلق ہے، پچھلی صدی میں شاد عظیم آبادی کو اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے نہ صرف مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی اور نو کلاسیکی غزل گو کی حیثیت سے اپنی ایک پہچان بنائی بلکہ بچوں کے لیے بھی عمدہ نظمیں لکھیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں بچوں کے فکر و شعور اور سہل زبان کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ نظم 'نیند سے چونکو' میں وہ بچوں سے کتنے پیار بھرے لہجے میں مخاطب ہوتے ہیں۔

گہری نیند سے سونے والو — وقت کو اپنے کھونے والو
رات کٹی کچھ تم کو خبر ہے — چونکو، چونکو وقت سحر ہے
چاند کی رنگت ہوگئی میلی — دیکھو چمک سورج کی پھیلی

کوئلیں کوکیں، کو کو، کو کو　　یاہو بولے، یاہو، یاہو
نیند سے چونکے پنکھ پکھیرو　　بول رہے ہیں شاخوں پہ ہر سو
کھل گئیں کلیاں باغ کی ساری　　چار طرف ہیں نہریں جاری

اٹھو، اٹھو احمد اٹھو　　منہ کو دھوکر کپڑے پہن لو
سیر کرو، میداں کی نکل کر　　پھول کو دیکھو، باغ میں چل کر

شادعظیم آبادی نے اس نظم میں چھوٹے بچوں کا دل لبھانے کے لیے باغ، پھول، چرند پرند اور صبح کے خوبصورت نظارے کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں سویرے اٹھنے اور وقت کی قدر کرنے کی ہدایت دی ہے۔

شاد نے اور بھی نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ ایک نظم 'گائے' پر بھی ہے مگر اس کے مقابلے میں ان کے معاصر اسماعیل میرٹھی کی مشہور نظم 'ہماری گائے' کی زبان و بیان زیادہ سلیس اور رواں ہے۔

بہرحال ان کے بعد عبدالغفور شہباز ایسے شاعر ہیں جنھوں نے کئی نظمیں بچوں کے لیے لکھیں مثلاً بیر، جلیبی، پڑھنا، کھیل، ہنرمند گڑیا، ولایتی گڑیا، سہیلی کا بیاہ، شکریہ پنیر، باغ کی بہار، چڑیا چڑے کی کہانی وغیرہ۔ شہباز کے یہاں دو طرح کا اسلوب ملتا ہے۔ پہلے نظم 'پڑھنا' کے یہ اشعار دیکھیے۔

ہنر کی راہ میں بڑھو　　خرد کے بام پر چڑھو
پڑھو، پڑھو، پڑھو، پڑھو
لگاؤ علم و فن سے لو　　ہے جس میں مہر و مہ کی ضو
کتابیں یاں ہیں نو بہ نو
پڑھو، پڑھو، پڑھو، پڑھو
جلاؤ علم کا دیا　　کہ کرنے کی ہے بڑیا
پڑھو، پڑھو، پڑھو، پڑھو
ہے زنگ دل میں جو لگا　　ہنر ہے اس کا مصقلا
جو چاہو دل میں ہو جلا
پڑھو، پڑھو، پڑھو، پڑھو

کتاب ہے عجیب شے　　یہی دلاتی ہے روپے
پڑھو، پڑھو، پڑھو، پڑھو
کتاب نوکری دلائے　　یہی خوشی کی مے پلائے
یہی خدا سے بھی ملائے
پڑھو، پڑھو، پڑھو، پڑھو

عبدالغفور شہباز کی ایک اور آسان اور رواں نظم 'کھیل' ہے۔ اس میں بھی تخاطب کا وہی انداز ہے جو 'پڑھنا' میں ہے۔ بچوں کی ذہنیت کے لحاظ سے باتوں کو دو سطری اور تین سطری بندوں میں ترتیب دیا گیا ہے تاکہ انھیں یاد کرنے میں سہولت ہو۔ نمونہ دیکھیے۔

کھیل کا وقت ہے آؤ کھیلو
کھیل سے دل کو لگاؤ کھیلو

کھیلو، کھیلو، کھیلو، کھیلو

آؤ دماغ کو دو کچھ راحت
دوڑ و دکھائے پاؤں کی طاقت
جانو اس فرصت کو غنیمت

کھیلو، کھیلو، کھیلو، کھیلو

بیٹ اک ہاتھ میں لے لو کھیلو
کشتی لڑو اور ڈنڈ پیلو، کھیلو

کھیلو، کھیلو، کھیلو، کھیلو

شطرنج اور بچپیبی کھیلو
فٹ بال اور کبڈی کھیلو
گھر میں آنکھ مچولی کھیلو

کھیلو، کھیلو، کھیلو، کھیلو

لڑکی ہو تو گڑیا کھیلو
نہیں تو گلی ڈنڈا کھیلو

کھیلو، کھیلو، کھیلو، کھیلو

شہباز نے بچوں کے لیے کئی بہت اچھی نظمیں اور رباعیاں لکھی ہیں مگر ان کی بعض نظمیں طویل بھی ہیں اور اسلوب کی سطح پر قدرے مشکل بھی۔ ان کی نظموں کے مجموعی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبع بہت موزوں اور رواں تھی۔ وہ جب کوئی موضوع بچوں کی دلچسپی کے مطابق منتخب کرتے ہیں تو مصرع لگانے کے دوران اکثر بچوں کی خام سمجھ اور ناپختہ ذہن کو فراموش کر دیتے ہیں۔ شعر اور مصرعے ڈھلتے چلے جاتے ہیں، جن کے الفاظ اور تراکیب میں ثقالت آجاتی ہے۔ اس کے ساتھ اظہار و بیان کی طوالت ایسی چیزوں کو بچوں سے دور کر دیتی ہے۔ ولایتی گڑیا، ہنرمند گڑیا، بیر، شکریہ پنیر، بھنگا نامہ وغیرہ اسی طرح کی نظمیں ہیں جو بچوں کے جذبات، احساسات، سوچ سمجھ اور دلچسپی سے بالاتر ہو گئی ہیں۔

پرویز شاہدی نے ساٹھ کی دہائی میں ایک بہت ہی چبھتی ہوئی نظم 'بے چہرگی' لکھ کر عصری سماج کی کھردری سچائیوں کو بے نقاب کیا تھا اور اردو نظم نگاری میں ایک معنویت سے بھرپور اصطلاح کا اضافہ کیا تھا۔ بہت کم قارئین جانتے ہیں کہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی چند نظمیں لکھی ہیں جو عموماً کلکتہ کے اخبارات میں دفن ہو چکی ہیں۔ ایک نظم 'دوڑو لڑکو' کے چند ٹکڑے دیکھیے۔

دوڑو لڑکو، دوڑو لڑکو
کیسا کھلونا لایا ہوں میں
ماں کا سپنا لایا ہوں میں
باپ کی آشا لایا ہوں میں
بار دعا کا لایا ہوں میں

کیسا سندر ہے یہ کھلونا
رات کو جیسے چاند کا مکھڑا
دن کا اجالا لایا ہوں میں

بھر لو من میں گیت کوی کا
سن لو تم سنگیت خوشی کا
سندر باجا لایا ہوں میں

دوڑو لڑکو، دوڑو لڑکو
پیار کوی کا لایا ہوں میں
کیسا کھلونا لایا ہوں میں

پرویز شاہدی کی نظم نگاری کا یہ ایک نیا روپ ہے۔ وہ جس طرح اردو ہندی کے آسان لفظوں اور روزمرہ سے مصرعے ڈھالتے ہیں وہ بچوں کی مزاج شناسی اور عصری تقاضے کا علامیہ ہے۔

جدید لب و لہجے کے معروف شاعر مظہر امام کی نظم 'ہم ایک ہیں' سمجھدار بچوں کے

فکر و شعور کی ترجمان ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رشک جناں ہندوستاں   ہندو ہیں اس کے باغباں
مسلم بہار گل فشاں   مہمل ہے فرق این و آں
ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں

دو ہیں رگیں اور اک لہو   دو پھول اور ایک بو
پیمانے دو اور اک سبو   پیکر ہیں دو اور ایک خو
ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں

مظہر امام نے اس نظم میں محض ایک پیغام ہی نہیں دیا ہے، شاعری بھی کی ہے۔ کئی مصرعوں سے شعریت کی خوشگوار پھوہار ہوتی ہے۔

ناوک حمزہ پوری ایک مستند عروض داں اور استاد شاعر ہیں۔ مختلف شعری صنفوں اور ہیئتوں میں ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ مختلف نظموں کے درج ذیل ٹکڑوں سے ان کا طرز بیان عیاں ہوتا ہے۔

جاڑا

جاڑا آیا، جاڑا آیا   ہم بچوں کو دل سے بھایا
سوئٹر، موزے ہم لائیں گے   نئی رضائی سلوائیں گے
دادی اماں آگ جلاؤ   مت یوں کٹ کٹ دانت بجاؤ
دھوپ میں بیٹھے پڑھتے ہیں ہم   نہیں یہ موسم نعمت سے کم

گنگا کا پیغام۔

سارے جگ میں نام ہے میرا   چلتے رہنے کام ہے میرا
ہر آفت سے میں ٹکرائی   مشکل سے میں کب گھبرائی
اٹھلاتی ہوں، بل کھاتی ہوں   بہتی ہوں، بہتی جاتی ہوں
چل نکلو تو چلتے جاؤ   بڑھ جاؤ تو بڑھتے جاؤ
رکنا اور ٹھہرنا کیسا   کٹھنائی سے ڈرنا کیسا
منزل پالوگے تم اپنی   بچو! ہے یہ بات یقینی

ناوک حمزہ پوری ادب اطفال کی مبادیات اور جزئیات سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ننھے منے بچوں کی نفسیات، ان کی دلچسپیوں اور زبان کا خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے سامنے کے ایسے موضوعات پر نظمیں کہتے ہیں، جن کی طرف بچے فوراً ملتفت ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ نظمیں موضوع اور زبان دونوں سطح پر بچوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ سادہ اور سہل الفاظ میں ایسے رواں شعر ڈھلتے ہیں کہ بچے مزے لے لے کر آسانی سے یاد کر سکتے ہیں۔

طلحہ رضوی برق کی شعری کائنات غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعۂ تاریخ سے جگمگا رہی ہے۔ یوں تو انھوں نے زیادہ تر سنجیدہ اور پختہ شعور قارئین کے لیے سامان بصیرت و بصارت فراہم کیا ہے مگر ان کی نظموں اور رباعیوں میں اخلاقیات اور پند و نصیحت بھی ہے۔ اکثر رباعیوں کا اسلوب قرآن کریم کی آیتوں کے حوالوں، احادیث مبارکہ کے اشاروں اور اسلامیات کے تلازموں سے مزین ہے۔ انھوں نے بعض رباعیاں ہوشمند بچوں کی ذہنی اصلاح کے لیے بھی کہی ہیں۔ یہ مثالیں دیکھیے۔

ہر نیک اور بد کا ہے رزاق خدا   ہلتا نہیں بے حکم یہاں اک پتا
سب کچھ اسی دنیا کو سمجھنے والو   تعلیم سے غفلت کا نتیجہ ہے برا

آواز اگر دیں تو توقف نہ کرو   نقصان بھی کچھ ہو تو تاسف نہ کرو
جھڑکو نہ انھیں، بچھا دو بازو جھک کر   ماں باپ کی خدمت میں کبھی اف نہ کرو

مناظر عاشق ہرگانوی نے ادب اطفال پر خاصی توجہ دی ہے۔ مضامین، کہانیاں اور نظمیں تواتر سے لکھی ہیں۔ ان کی اس ادبی ریاضت کا باضابطہ اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے مجموعے 'جیسے کو تیسا' پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں بچوں کے معصوم مزاج اور ناپختہ ذہن کی تربیت پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ صنعت توشیح میں ان کی ایک نظم ہے جس میں حروف تہجی کے لحاظ سے ہر حرف پر ایک مصرع کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیکھیے نظم کے آخری سات مصرعے۔

ک: کار خیر عبادت ہے   ل: لیتے کام جو ہیں اس سے
م: مقصد اپنا وہ پاتے   ن: نیکی کرنا ہے اچھا
و: وقت کا رہ پابند سدا   ہ: ہوتے ہیں وہ لوگ بھلے
ی: یاد خدا کو جو کرتے

ادب اطفال میں ذکی احمد چندن پٹوی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے مختلف عمر کے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں نظمیں لکھی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر استاد ہیں، اس لیے ان کی نظموں میں درس اخلاق اور ذہنی تربیت کی جہد مسلسل ملتی ہے۔ دیکھیے مختلف نظموں کے چند ٹکڑے۔

میری بات مانو، میرے دل کے پیارو   کبھی بھول کر تتلیوں کو نہ مارو
کہ تم بھی تگ و دو میں جیون گزارو   ان ہی کی طرح تم بھی ہمت نہ ہارو

(تتلیوں کو نہ مارو)

نظم 'منشی جی کے دانت' کا یہ حصہ بھی بڑا عمدہ اور غنائی ہے۔

منشی جی دانت نرالے   اجلے پیلے، بھورے، کالے
کرتے تھے اپنی من مانی   دانتوں کی کچھ قدر نہ جانی
ان کے دانت ہوئے دو نسلی   آدھے نقلی، آدھے اصلی

منشی جی کے دانت کا بیان ان کا اصل مقصد نہیں ہے۔ اس حوالے سے وہ بچوں کو درس دینا چاہتے ہیں۔ دیکھئے ان تین شعروں میں وہ کس خوبصورتی سے ننھے بچوں کو سمجھاتے ہیں۔

تم نہ صفائی سے منہ موڑو   ایسی گندی عادت چھوڑو
تھوڑی کسرت اور پڑھائی   دانتوں کی دو وقت صفائی
تم نہ کبھی پچھتاؤ ایسے   منشی جی پچھتائے جیسے

عبدالمنان طرزی اپنی زبردست موزونی طبع اور قادر الکلامی کے سبب منظوم تذکرہ، سوانح و سیرت، تنقید اور تبصرے لکھنے میں طاق ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نگاہ میں بچوں کی نفسیات اور ان کا لسانی شعور ہے۔ اس لیے مختلف عمر کے بچوں کے ذہن اور فہم کا لحاظ کرتے ہوئے نظمیں لکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر دیکھیے، یہ حصے۔

چڑیا رانی گھر آئی ہے   چونچ میں اپنی کچھ لائی ہے
ممی میں اک بات بتاؤں   میرے من کو وہ بھائی ہے
چڑیا رانی گھر آئی ہے   چونچ میں اپنی کچھ لائی ہے

(چڑیا)

کتنے سلیس، رواں اور سامنے کے الفاظ ہیں کہ تین چار سال کے بچے آسانی سے یاد کر لیں۔ چڑیا ہر چھوٹے بچے کی دلچسپی کا مرکز رہی ہے۔ اس کی چہچہاہٹ سے گھر گلزار بنا رہتا ہے۔ ذکی چندن پٹوی نے بھی چڑیا پر بڑی تعداد میں نظمیں لکھی ہیں۔ مذکورہ بالا نظم میں جناب طرزی نے بچے کی ننھی منی زبان میں قافیہ پیمائی کی ہے اور تین شعروں کی نظم میں پہلے شعر کو آخر میں دہرا کر Stress دیا ہے اور بچے کی دلچسپی بڑھائی ہے۔ اسی طرح کی آسان نظم 'کاغذ کے پھول' ہے جو کچھ بڑے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔

ہم نے گھر پر پھول بنایا   اپنے ٹیچر کو دکھلایا

'وری گڈ' ریمارکس ملا ہے　　پاپا نے انعام دیا ہے
پھول جو میرے ہیں کاغذ کے　　خالی لیکن ہیں خوشبو سے
ان پھولوں کو عطا لگا کے　　اسکول اپنے لے جائیں گے

آندھی، مفلس، کوئل، پبلک اسکول، سرکس، جامن وغیرہ پر بھی انھوں نے خیال آرائی کی ہے۔ وہ ممی، پاپا، ٹیچر، وری گڈ وغیرہ جیسے انگریزی کے الفاظ بھی بے محابا استعمال کرتے ہیں جو ہمارے روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ظفر کمالی نے بھی بچوں کے ذہن وفکر اور ان کی پسند یا شوق کی مناسبت سے قابل قدر نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی مشہور نظم 'پانی' کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

زندگی کا مدار ہے پانی　　اس چمن کی بہار ہے پانی
اس سے ہے آن بان مٹی کی　　ہے یہ پانی ہی جان مٹی کی
بے مزا ہے حیات اس کے بغیر　　کچھ نہیں کائنات اس کے بغیر
راحتوں میں یہ بڑی راحت ہے　　یہ خدا کی عظیم نعمت ہے

کتنے خوبصورت اور آسان لفظوں میں ایک حقیقت بیان کردی ہے۔ شعریت سے پُر مصرعے بھی تراش دیے ہیں۔ یہی کمال شاعری ہے۔

ان ہی کی طرح شبنم کمالی بھی آسان اور عام فہم لفظوں سے بچوں کے لیے ایک شگفتہ اور رواں نظمیہ اسلوب تراشتے ہیں۔ ان کی نظم 'بھائی ہمارا' کے یہ شعر کتنے برجستہ ہیں۔

بھولا بھالا پیارا پیارا　　ننھا منا بھائی ہمارا
گود میں امی کے بیٹھا ہے　　سب کو ٹکٹک دیکھ رہا ہے
میٹھی میٹھی بولی اس کی　　کتنی پیاری کتنی اچھی

یہ بچے کا مشاہدہ ہے اور اس کا بیان بھی بچے کی زبان سے ہے۔ 'ادب اطفال' کی ایسی تخلیق یقیناً بہت مقبولیت حاصل کرتی ہے۔

عطا عابدی اردو کے اچھے اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ نثر میں بھی ان کی تنقیدی تحریریں موجود ہیں۔ انھوں نے کئی نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ ان کا انداز عموماً ناصحانہ ہے۔ نظم 'علم' کا یہ حصہ بڑا رواں اور شعریت سے بھرپور ہے۔

علم ایک ایسی دولت ہے　　کوئی بانٹ نہ اس کو پائے
کوئی چھانٹ نہ اس کو پائے　　ہر سو اس کی دھاک ہے ایسی
کوئی ڈانٹ نہ اس کو پائے　　علم ایک ایسی دولت ہے

اب آخر کے یہ پانچ مصرعے دیکھیے۔ ان میں شاعر کے اندر کا استاد، باپ یا ناصح کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

اس دولت کو پاؤ بچو　　آپس میں پھیلاؤ بچو
اونچا نام کماؤ بچو　　سب کو یہ بتلاؤ بچو
علم بڑی اک دولت ہے

تازہ دم شاعر امان ذخیروی نے بچوں کے لیے نظمیں لکھنے پر خاصی توجہ دی ہے۔ ادھر ان کی کئی عمدہ نظمیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کی ایک بالکل نئی نظم 'خالو جان' کے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

ایک دن بلی نے چوہے سے کہا　　تجھ کو خالہ جان سے ہے کیا گلہ
تو کبھی بھی میرے گھر آتا نہیں　　اپنی پیاری شکل دکھلاتا نہیں
تجھ کو کچھ اپنی صحت کا ہے خیال　　دیکھ تو کیا ہوگیا ہے تیرا حال
میری چاہت کا اگر کر احترام　　کر مرے گھر میں ہی تو آکر قیام
بات بلی کی سنی چوہے نے جب　　کھول کر گویا ہوا وہ اپنے لب
سوچتا ہوں میں بھی تیرے گھر رہوں　　میں ترا لخت جگر بن کر رہوں
آج تک میں گھر سے تیرے دور ہوں　　پر اسی اک وہم سے مجبور ہوں
مجھ کو ڈر لگتا ہے خالو جان سے　　بات یہ کہتا ہوں میں ایمان سے

آسان الفاظ میں لکھی گئی یہ نظم بھی قدرے طویل ہے۔ مختصر ہوتی تو بچوں کے لیے زیادہ کارگر اور مفید ہوتی۔ انھیں کی طرح ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن جعفری بھی اچھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ نظم 'کانٹے بھی ہیں' کے یہ چار شعر دیکھیے۔

رنگ برنگے پھول ہیں ایسے　　ہیں دنیا میں بچے جیسے
بات بات پر یہ کھل جائیں　　غیر بھی ہو تو یہ مل جائیں
بچے پڑھ کر بنیں گے افسر　　پھول بچھیں گے ان پر آکر
پھول میں لیکن کانٹے بھی ہیں　　پر نٹ کھٹ تو بچے بھی ہیں

ڈاکٹر جعفری کی نظموں میں بیان کی سادگی اور روانی ہے تاہم زبان مزید توجہ چاہتی ہے۔

نوجوان شاعر منصور خوشتر نے بھی بچوں کے لیے بڑی تعداد میں نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ روزمرہ کی زندگی میں نظر آنے والی چیزوں پر قلم اٹھاتے ہیں۔ سبزیوں کے ٹھیلے شہر کی ہر گلی سے گذرتے ہیں اور عموماً عورتیں تازہ سبزیاں خریدتی ہیں۔ ایک بچے کے بھولے بھالے جذبات کس طرح ابھرتے ہیں منصور نے اس نظم میں اس کی ترجمانی کی کوشش کی ہے۔

سبزی والے سبزی والے/ کیا کیا ٹھیلے پر ہیں تیرے/ آلو، بیگن، سیم اور گوبھی/ ساگ ٹماٹر کدو چھیمی/ اس ٹھیلے پر بھی ہوگا/ سیب، انگور، امرود اور کیلا/ لے گی تجھ سے میری ممی/ تازہ تازہ لیکن لانا/ میرے گھر میں سب ہیں کھاتے

نئی نسل کے اور بھی کئی شاعر ہیں جو بچوں کے لیے اچھی نظمیں لکھنے میں مشغول ہیں اور ادب اطفال کے ذخیرے میں اضافہ کررہے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پچھلے سوسوا سو سال کے دوران بہار کے شاعروں نے جس طرح بچوں کے لیے نظمیہ شاعری کی ہے، ان کی دلچسپیوں، ان کی سمجھ بوجھ، ان کے مشاہدوں اور تصورات کو ان ہی کی آسان، رواں اور بھولی بھالی زبان میں پیش کیا ہے، وہ شعری سطح پر ادب اطفال کی روایت میں استحکام اور اس کے سرمایے میں اضافے کا باعث ہے۔ اب رہا سوال ان نگارشات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کا تو اس ضمن میں ماننا پڑے گا کہ اردو کے نقادوں کی اکثریت اپنے پختہ اور بالیدہ فکر وشعور کے مطابق شعر وادب کے مطالعے میں محو رہتی ہے اور اسی کی تفہیم اور تجزیے سے ان کی پہچان بنتی ہے۔ بچوں کے لیے لکھی جانے والی ہلکی پھلکی نظمیں انھیں سطحی، خام اور محض تک بندی معلوم ہوتی ہیں۔ حالاں کہ ادب اطفال کے پس پردہ کارفرما محرکات پر نظر رکھی جائے اور اس کا تناظرات کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ایک دھنک رنگ منظرنامہ ملے گا۔ جس میں لسانی، جمالیاتی اور فنی نیرنگی اور بوقلمونی ملے گی۔ اخلاقیات اور پند ونصیحت کے ذریعے مثبت انداز سے ذہن سازی کی دلکش کوشش نظر آئے گی۔ سیدھی سادی اور بھولی بھالی مسرت آمیز باتوں کے ستارے ٹمٹماتے نظر آئیں گے۔ ہر زبان میں ایسی تحریریں نوخیز بچوں کی ذہنی روئیدگی، فہم وفراست کی نمو پذیری، قوت بیان میں جولانی، ذخیرۂ الفاظ میں افزونی اور ادبی جمالیات کی آگہی کا سبب بنتی ہیں۔ بچے سن شعور کو پہنچتے پہنچتے مربوط، متین اور سنجیدہ ادب کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ بہار کے تازہ دم قلمکاروں کی بڑی تعداد اس کی زندہ مثال ہے۔ ان کی لسانی اور فکری تربیت نیز مطالعے اور خامہ فرسائی کی عادت میں دوسرے اسباب کے ساتھ ساتھ ادب اطفال بالخصوص منظومات کا اہم حصہ ہے۔

■

Prof. Rais Anwar
Raj Toli Lane, Vigo
Darbhanga - 846004 (Bihar)

ہندوستان میں بچوں کا سائنسی ادب

عبدالودود انصاری

ہندوستان میں بچوں کے ادب کی بات کی جاتی ہے تو قدرے اطمینان سا ہوتا ہے کہ لکھنے والے لکھ رہے ہیں چاہے وہ نثر ہو یا نظم اور تواتر سے لکھ رہے ہیں جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں لیکن جب بچوں کے سائنسی ادب کی جانب رخ کیا جاتا ہے تو مایوسی کا شکار ہونا پڑتا ہے کہ جس رفتار سے لکھا جانا چاہیے وہ رفتار ہرگز نہیں ہے۔ متذکرہ حقیقت کا انکشاف نہ صرف ہندوستان میں ہوتا ہے بلکہ عالم اردو کی نمائندگی کرتا ہے۔ دراصل 'سائنسی ادب' خاص کر 'بچوں کا سائنسی ادب' کے ساتھ ناانصافی یہ ہے کہ اس ادب کو نہ تو ادب والے خوش آمدید کہتے ہیں اور نہ ہی عوام کی جانب سے اس کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں جس وجہ سے ان کے مصنفین کی پذیرائی نہیں ہوتی ہے۔ مولوی ذکاء اللہ سے شروع کریں اور مولوی اسماعیل میرٹھی سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ کر حال تک آئیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ہر دور میں ادب اطفال کو ہلکے طور پر لیا گیا ہے۔ یہ تو بچوں کے ادب کی بات ہوئی اور بچوں کے سائنسی ادب کے ساتھ یہ مسئلہ اور عروج پر ہے کہ ادبی دنیا میں بچوں کے سائنسی ادب کو جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہ ماضی میں ملا اور نہ ہی حال میں مل رہا ہے۔ آپ کہیں گے کہ بچوں کے سائنسی ادب پر کم لکھا گیا ہے لیکن یہ آپ نے نہیں سوچا کہ کم کیوں لکھا گیا ہے؟

دراصل لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ اردو والے سائنس کی تعلیم ہی بہت کم حاصل کرتے ہیں تو لکھنے والے کہاں سے آئیں گے اس کے باوجود لکھنے والوں نے بچوں کے لیے سائنسی مضامین اور سائنسی کتابیں لکھی ہیں لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی تصانیف کی قدر نہیں کی گئی۔ اب ذرا ادب، اردو ادب اور سائنسی ادب پر سیر حاصل بحث کی جائے۔

ادب ایک اکائی ہے جس کی تقسیم ممکن نہیں ہے۔ ادب ایک سمندر ہے جس کی وسعت کی پیمائش بھی ممکن نہیں ہے۔ ادب سے ہی آدمی اچھا انسان بنتا ہے، اچھا شہری بنتا ہے اور قومیں ترقی کرتی ہیں۔ ادب ایک زینہ ہے جس سے انسان و ملک دونوں ترقی کی شاہراہوں پر پہنچتے ہیں۔ ادب کی پیدائش انسان کی پیدائش کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان سے اس کی ملاقات قدرے تاخیر سے ہوئی ہے۔ بات پھر وہیں سے شروع کی جائے کہ ادب ایک اکائی ہے جس کی تقسیم ممکن نہیں ہے۔ ادب جب ہماری مادری زبان سے رشتہ جوڑتا ہے تو یہ لسانی ادب یا اردو ادب کہلاتا ہے اور جب بچوں سے مخاطب ہوتا ہے تو یہ بچوں کا ادب کہلاتا ہے لیکن جب بچوں کے اندر سائنسی دلچسپی پیدا کرتا ہے اور سائنسی معلومات فراہم کرتا ہے تو یہ بچوں کا سائنسی ادب کہلانا پسند کرتا ہے۔ میری نظر میں بچوں کے سائنسی ادب کی تعریف اس طرح ہے۔

"وہ ادب جس میں سائنسی معلومات کو مختلف اصناف کے ذریعے آسان اور دلچسپ انداز میں بچوں کی نفسیات کے پیش نظر پیش کیا جائے تو وہ بچوں کا سائنسی ادب کہلاتا ہے۔"

یہ تعریف اس بات کی تشریح کرتی ہے کہ بچوں کا

سائنسی ادب قدرت کے سربستہ راز کو افشا کرتا ہے یا قدرتی واقعات کے رونما ہونے کا سبب بیان کرتا ہے یا قدرتی اشیا کے اوصاف ظاہر کرتا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ جب سائنس استعمال میں آتی ہے تو ٹیکنالوجی کہلاتی ہے اور سائنسی ادب کے ذریعے جو سائنس معرض وجود میں آتی ہے اس کے ذریعے انسان ٹیکنالوجی کا استعمال بھی سیکھتا ہے۔قبل اس کے کہ بچوں کے سائنسی ادب کی صفات

آج کا بچہ دنیا کو اپنی مٹھی میں دبائے ہم سے آگے کی دنیا دیکھ رہا ہے جسے سمجھنا اب اتنا آسان نہیں رہا جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔بدلتے زمانے کے ساتھ بچوں کی نفسیات بھی گڑبڑائی ہے اور ادیب کی دشواریاں بڑھی ہیں۔بچوں کا ادب تخلیق کرنا جو پہلے بھی آسان کام نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن جتنا دشوار ہوتا جارہا ہے اتنا دشوار بھی نہ تھا۔اس لیے آج کے ان حالات میں بچوں کا ادب تخلیق کرتے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

کیسی ہوں اس کی جانکاری کے لیے بچوں کے ادب کی صفات کی جانکاری ضروری ہے جو ذیل کے اقتباس سے واضح ہوجاتی ہے:

''بچوں کے ادب میں پھولوں کی سی معصومیت، تتلیوں کی سی رنگینی اور پرندوں کی سی چہکار ہونی چاہیے۔ زبان اس قدر سلیس کہ ہر عمر کا بچہ آسانی سے پڑھ سکے۔ روانی ایسی جیسے کوئی ڈھلان پر سائیکل چلا رہا ہو۔شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہے۔ساتھ اس کے علم میں، الفاظ کے ذخیرے میں اور آس پاس کے ماحول اور کرداروں کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔''

(سلام بن رزاق: اردو دنیا،نئی دہلی: جولائی 2012،ص8)

ہم دیکھ رہے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ قدریں بدل رہی ہیں،ماحول بدل رہا ہے اور حالات بدل رہے ہیں۔لہٰذا بچوں کے ادب کی تعریف میں ترمیم کی بھی ضرورت ہے جس کی جانب کسی کی دورس نگاہیں اس طرح گئی ہیں:

''آج کا بچہ دنیا کو اپنی مٹھی میں دبائے ہم سے آگے کی دنیا دیکھ رہا ہے جسے سمجھنا اب اتنا آسان نہیں رہا جتنا ہم سمجھ رہے ہیں،بدلتے زمانے کے ساتھ بچوں کی نفسیات بھی گڑبڑائی ہے اور ادیب کی دشواریاں بڑھی ہیں۔بچوں کا ادب تخلیق کرنا جو پہلے بھی آسان کام نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن جتنا دشوار ہوتا جارہا ہے اتنا دشوار بھی نہ تھا،اس لیے آج کے ان حالات میں بچوں کا ادب تخلیق کرتے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''

(حقانی القاسمی: ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ یافتہ،اردو دنیا،نئی دہلی: مارچ 2017،ص81)

سائنس کے سرایک الزام ناعاقبت اندیشوں نے یہ لگا رکھا ہے کہ سائنس ایک خشک مضمون ہے۔بچوں کے سائنسی ادب کے سلسلے سے دو مثالیں سن لیں کہ آپ بچے کو جلیبی صرف تیل میں چھان کر کھلائیں گے تو کھانا پسند نہیں کرے گا یا آپ چھینے کی گولی کو ابال کر پیش کریں گے تو وہ ٹھکرا دے گا لیکن جب ان دونوں کو چینی کے شیرے میں ڈبو کر پیش کریں گے تو وہ جلیبی اور گولی کی دوسری شکل رس گلے کو بڑے شوق سے کھائے گا بلکہ مزید مانگے گا۔بس یہی حال بچوں کے سائنسی ادب کا ہے۔ آپ کو سائنسی مضامین کو دلچسپ انداز اور ادب کی چاشنی میں ڈبو کر پیش کرنے ہوں گے۔مثال کے طور پر آپ بچوں کو پھولوں کی زیرگی (Pollination) کی معلومات دینا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو باغ کا حسین منظر پیش کرنا ہوگا،پھر پھولوں کی دلکشی پیش کرنی ہوگی ہوسکتا ہے کہ تتلی کی رنگینی سے لطف اندوز کرانا ہو اس کے بعد آپ انھیں زیرگی کی معلومات دیں گے تو خوشی خوشی قبول کرلے گا۔

اب ایک سوال بڑی تیزی سے ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کس طرح کے ادب کی پہلے ضرورت ہے بچوں کے ادب کی یا بچوں کے سائنسی ادب کی۔دیکھیے ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ دونوں ادب کی یکساں اور بیک وقت ضرورت ہے یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔میں یہ نہیں کہتا کہ غیر سائنسی بچے بے ادب ہوتے ہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ سائنسی ادب کے حصول کے لیے بچے کا باادب ہونا ضروری ہے۔ اب آیئے بچوں کے سائنسی ادب کی ضرورت پر مزید روشنی ڈالی جائے کہ وہ کیوں ضروری ہے؟

آج اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ جس قوم وملک کے پاس سائنس کا خزانہ جتنا زیادہ ہوگا وہ اتنا ہی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوگا اور دنیا میں اس کی بالا دستی ہوگی۔اس حقیقت کی پیشین گوئی برسوں پہلے ہمارے سابق وزیراعظم جواہر لال نہرو کر کے چلے گئے کہ:

''زندگی کی جملہ سمتوں میں سائنس نے دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔مستقبل اب سائنس کے ہاتھوں میں ہے اور ان کے جو سائنس کے دوست ہیں۔''

متذکرہ حقائق اور قول کے پیش نظر بچوں کے سائنسی ادب کی ضرورت باآسانی سمجھی جاسکتی ہے۔سچ تو یہ بھی ہے کہ سائنسی ادب کو ادب نہ سمجھنے والی قوم سائنس میں پیچھے رہ جاتی ہے۔ ویسے بھی آج کے دور میں بچوں کو پریوں کی کہانی اور بھوت پریت کے قصوں سے کوئی دلچسپی نہیں،نہ انھیں راجا اور رانی کی داستانوں سے انسیت ہے۔آج کا بچہ چاند کو ماما کہنے پر بھی تیار نہیں۔اگر کوئی اسے کہے گا کہ چاند پر ایک بڑھیا رہتی ہے جو سوت کات رہی ہے تو ہنس کر کہنے والے کو خاموش کردے گا کہ چاند پر 21 جولائی 1969 کو قدم رکھنے والے نیل آرم سڑانگ سے تو بڑھیا سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔آج کا بچہ انگریزی کی مشہور نظم:

Twinkle twinkle little star
How I wonder what you are

کو ترمیم کر کے اس طرح پڑھ رہا ہے:

Twinkle twinke little star
No I wonder what they are

لہٰذا اب ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ آج سائنس کا دور ہے اور ہمارے بچوں کو بھی اس کے شانہ بہ شانہ چلنا ہے۔بھوت پریت،راجا رانی اور پریوں کی کہانی سنانے کے بجائے سائنسی سوچ دینی ہوگی بقول شاعر:

تجھ کو ترے قلم کی قسم صاحب قلم
بچوں کو فکر دے خوش فہمیاں نہ دے

(اسماعیل ظفر)

میں بلا خوف یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آج اردو دنیا میں بچوں کے سائنسی ادب کی عدم موجودگی کی کمی،اس کی عدم پذیرائی کی وجہ سے اردو بچے سائنس میں پچھڑے پن کا شکار ہیں۔ان تمام مشکل تر حالات میں نبرد آزما ہو کر جن مصنفین نے بچوں کے سائنسی ادب پر قلم اٹھایا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہیں بلکہ ان کے یہ کارنامے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ایسے گراں قدر مصنفین کے کارنامے کو منصۂ شہود پر لاکر انھیں خراج تحسین پیش کیے جائیں۔آزادی کے بعد بچوں کے سائنسی ادب پر طائرانہ نظر سلسلہ وار ملاحظہ کریں۔

قرۃ العین حیدر: افسانہ نگار اور ناول نگار تھیں۔آپ نے ایک ناول 'جن حسن عبدالرحمٰن' لکھی جس میں بچوں کو

سائنسی کرشموں سے روشناس کرایا گیا ہے۔

کرشن چندر : آپ ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔آپ کے دو ناول الٹا درخت اور ستاروں کی سیر سے بچے سائنسی معلومات سے بہرور ہوتے ہیں۔

ظفر پیامی : آپ ممتاز صحافی، ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔آپ نے بھی ایک ناول 'ستاروں کا قیدی' لکھ کر بچوں کو خوب سائنسی معلومات فراہم کیں ہیں۔

پرکاش پنڈت : آپ مشہور ادیب تھے۔آپ نے ایک ناول 'چاند کی سیر' اور سائنسی کہانیوں پر مبنی 'سرکس کے کھیل' اور 'چاند کی چوری' تصنیف کر کے بچوں کے سائنسی ادب میں اضافہ کیا ہے۔

سراج انور: آپ کے تین ناول خوفناک جزیرہ، کالی دنیا اور نیلی دنیا ایسے ہیں جن سے بچے سائنسی معلومات سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔

اظہار اثر: آپ کا نام دنیائے سائنس میں بہت مشہور ہے۔آپ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اردو میں تسلسل کے ساتھ سائنسی فکشن لکھا ہے۔فکشن میں ان کی کتاب 'آدھی زندگی' اور 'مشینوں کی بغاوت' کافی شہرت پائیں جن سے بچے اور بڑے دونوں استفادہ کر سکتے ہیں۔آپ نے بچوں کے لیے کئی جاسوسی اور سائنسی کہانیاں لکھی ہیں جن میں تجسس، حیرت اور استعجاب وغیرہ بچوں کو سائنسی معلومات فراہم کرتی ہیں۔آپ نے نیشنل بک ٹرسٹ سے بچوں کے لیے شائع دو کتابوں ہمارا جسم اور خون کی کہانی کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ماحولیات پر ایک کتاب 'وقت کا مسافر' بہت مشہور ہے۔

ڈاکٹر محمد شمس الاسلام فاروقی : آپ سبکدوش سائنسداں اوور ماہر حشریات ہیں آپ نے کیڑوں کی دنیا، کیڑوں کی کہانی، انوکھی پہیلی، پھول کے مہمان، بگلا بھگت، چیونٹی ایک حیرت انگیز تخلیق، ننھی مخلوق، دلچسپ سیر، دماغ اور جگر کی کہانی۔خود ان کی زبانی، اللہ کی نشانی، انسانی جسم۔ایک معجزہ، حشرات قرآنی، کیڑے قدرت کے شاہکار، شہد مکھی کے انوکھے کام، کیڑوں کی پہیلیاں، کیڑوں کا میوزیم اور باہمت چیونٹیاں بچوں کے لیے سائنسی کتابوں کے علاوہ سیکڑوں سائنسی مضامین لکھے ہیں۔ان کی تحریروں سے بچوں کے سائنسی ادب کے رموز واوقاف سیکھنے کو ملتے ہیں۔

پروفیسر ادریس صدیقی: آپ ماہر معاشیات ہیں۔آپ کا آبائی وطن لکھیم پور کھیری، یوپی ہے لیکن اب آپ کناڈا میں مستقل سکونت پذیر ہیں۔آپ سائنسی کہانیوں کے شہزادہ ہیں اور یہ سعادت بہت کم بچوں کے

> **آج اردو دنیا میں بچوں کے سائنسی ادب کی عدم موجودگی کی کمی، اس کی عدم پذیرائی کی وجہ سے اردو بچے سائنس میں پچھڑے پن کا شکار ہیں۔ان تمام مشکل تر حالات میں نبرد آزما ہو کر جن مصنفین نے بچوں کے سائنسی ادب پر قلم اٹھایا ہے وہ یقینا قابل تعریف ہیں بلکہ ان کے یہ کارنامے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ایسے گراں قدر مصنفین کے کارنامے کو منصہ شہود پر لاکر انھیں خراج تحسین پیش کیے جائیں۔**

سائنسی ادیب کے حصے میں آئی ہے۔آپ نے بے شمار سائنسی کہانیوں کی کتابیں لکھی ہیں جیسے پانی کی موت (ماحولیاتی مسائل پر کہانیاں)، راکٹ (طبعیات کے اصول پر کہانیاں)، جادو (طبعیات کے اصول پر کہانیاں)، پھلوں کی ٹوکری۔I (انگور اور پپیتے پر کہانیاں)، پھلوں کی ٹوکری۔II (امرود اور آنار پر کہانیاں)، پھلوں کی ٹوکری۔ III (ناشپاتی اور سیب پر کہانیاں)، پھلوں کی ٹوکری۔ IV (آم اور کیلے پر کہانیاں)، پھلوں کی ٹوکری۔V (سنترے اور شریفے پر کہانیاں)، بھورے بھیڑیا (جانور اور اس کے اطوار اور مسکن پر مضامین)، کہانیاں پرندوں کی (پرندوں کی کہانیاں)، دھنک کے رنگ (قوس قزح کی معلومات)، ناراض سورج (گلوبل وارمنگ پر معلومات)، پکنک (دریائی آلودگی پر معلومات)، ٹاپو (گلوبل وارمنگ پر کہانیاں)، دھنواں (ہوائی آلودگی پر کہانیاں)، سبز مچھلی (آبی آلودگی پر مضامین)، بے چینی (سونامی کی کہانی)، ہوا کا جادو (ہوائی آلودگی کی کہانی)، اُڑان (ہیلیم گیس پر کہانی)، ڈھائی اینٹ کا محل (ماحول اور بادل پھٹنے کے بارے میں کہانیاں)، کامیابی کا نسخہ (جوار بھاٹا پر کہانیاں)، رنگیلی گئی (پلاسٹک آلودگی پر کہانی)، جادوگر (شمسی قوت پر کہانی)، کھودے کا سونا (ٹھوس کوڑا کرکٹ پر کہانی)، نیکی کا انعام (جنگلات یعنی جنگل بنانا اور جنگل کی کٹائی پر معلومات)، کوئی شکایت نہیں (جنگل کی دنیا پر معلومات)، موٹو (موٹاپے اور غذا پر کہانی)، سبق (موٹاپے اور ٹھنڈے مشروب پر کہانیاں)، سورج کہاں گیا (سورج سے متعلق)، لکڑی کا چولہا (ہوائی آلودگی پر کہانیاں)، چمڑے کا کارخانہ (زمینی آلودگی پر کہانیاں)، جنگل کہاں گیا (جنگل کی کٹائی پر معلومات)، دلی کی نئی کہانیاں (ٹھوس کوڑے کرکٹ کی صفائی)، پانی کی آلودگی، عالمی حرارت (گلوبل وارمنگ)، معصوم شجر کاری (جنگل کی کٹائی)، نیوکلیائی کثافت (نیوکلیائی آلودگی)، اور زمینی آلودگی پر مبنی کہانیاں وغیرہ۔اس کے علاوہ انھوں نے درجہ اول تا پنجم کہانی سائنس کی (سائنسی کہانیوں کے ذریعے معلومات) لکھ کر سائنسی ادب کو مالا مال کیا ہے۔

محمد خلیل: آپ مشہور قلمکار ہیں۔آپ رسالہ سائنس کی دنیا، نئی دہلی کے سابق مدیر ہیں۔آپ کی بچوں کے سائنسی مضامین پر مشتمل بارہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن کے نام اس طرح ہیں: عجیب وغریب جانور، سائنس اور ہم، نہرو اور سائنس، ڈاکٹر سی وی رمن۔ایک عظیم سائنسداں، حیوانات کی دنیا، سائنسدانوں کی دلچسپ باتیں، پتنگ ایک قدیم سائنسی کھیل، انوکھے پرندے، عجیب و غریب جانوروں کی دنیا، چچا جان کی سائنسی کہانیاں، دنیا کے مشہور سائنسداں اور سائنسی ایجادوں کی کہانی۔ان کتابوں کے علاوہ بچوں کے لیے سائنسی مضامین بھی رقم کیا ہے۔

انیس الحسن صدیقی :آپ مشہور سائنسی مضمون نگار ہیں۔آپ نے اپنی تحریروں سے بچوں کو کائنات کی خوب سیر کرائی ہے۔آپ نے فلکیات کے موضوعات پر بہت ساری کتابیں لکھی ہیں جیسے فلکیاتی بستہ، فلکیاتی نظارے، خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں، چلو چاند پر، گیلیلیو کی کہانی۔ان کی زبانی، کہکشاں کیا ہیں؟ کے علاوہ گرہن کیا ہے؟، چاند کیا ہے؟، سورج کیا ہے؟ زمین کیا ہے؟ اور سورج کیا ہے؟ اور چندر شیکھر کی کہانی۔ان کی زبانی کے کتابچے بھی تحریر کیا ہے۔آپ نے SCOSTEP کی سائنس کامکس کے انگریزی زبان سے اردو زبان میں ترجمے بھی کیے ہیں جو SCOSTEP کی ویب سائٹ پر موجود ہیں جن میں قطبی روشنی کیا ہے؟، قطبی علاقے کیا ہیں؟، گلوبل وارمنگ کیا ہے؟، شمسی آندھی کیا ہے؟، ارض مقناطیس میدان کیا ہے؟، فضائی کرہ کیا ہے؟، اوزون کرہ کی تہہ میں سوراخ کیا ہے؟ اور کائناتی شعاعیں کیا ہیں؟

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز : آپ ماہر نباتات اور ماہنامہ اردو سائنس کے مدیر ہیں۔آپ کے سائنسی مضامین پر مشتمل تین کتابیں سائنس نامہ، سائنس کی باتیں اور سائنس پارے ہیں جن سے بڑوں کے ساتھ بچے بھی بھرپور معلومات حاصل کرتے ہیں۔آپ نے نیشنل بک ٹرسٹ کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا جو "کائنات میں ایک سفر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

مولانا انصار احمد معروفی : آپ عالم اور فاضل کی سند رکھتے ہیں۔آپ نے برق رفتاری سے بچوں کے لیے سائنسی نظمیں لکھی ہیں۔آپ کی سائنسی نظموں پر مشتمل کئی کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں جیسے یہ زمین، یہ پیڑ پودے، یہ کائنات، یہ مہینے اور موسم، یہ بدن کے حصے، یہ آب و ہوا اور یہ جسم و جاں وغیرہ۔اس کے علاوہ نثری سائنسی مضمون پر ایک کتاب جمادات کی حرکتیں بھی شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر احرار حسین: آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تعلیم کے پروفیسر رہے ہیں۔آپ کی بچوں کے لیے سائنسی مضامین پر مشتمل عظیم سائنسداں، سائنس کی مایہ ناز ہستیاں، سائنس کوئز، سائنسی شعاعیں اور حیوانات کی دنیا نامی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

کپتان ڈاکٹر ایم ایم شیخ : آپ وظیفہ یاب پروفیسر اور ماہر حشریات ہیں۔آپ نے جانوروں، پرندوں اور حشریات پر مشتمل ایک کتاب سائنسی شعاعیں تصنیف کی ہے جو بچوں میں بے حد مقبول ہوئی ہے۔اس کے علاوہ کونج کرین۔ایک خوبصورت پرندہ، کروموز اور مجرمین، لونار جھیل۔قدرت کا شاہکار، ماحول کا تحفظ، چائے ایک صحت بخش مشروب، جانوروں کی بیرونی جلد غیر معمولی قدرت کی شاہکار اور والٹ ڈزنی وغیرہ بچوں کے لیے بہترین مضامین ہیں۔آپ کی ریشم پر ایک کتاب 'ریشم سازی' بھی ہے۔

ڈاکٹر محمد ابوالکلام: آپ وظیفہ یاب پرنسپل ہیں۔آپ نے بچوں کے ادب پر چار کتابیں شش و پنج (بچوں کے لیے سائنسی کہانیاں)، غبار (ماحولیات کے موضوع پر)، وقت کی پکار (گلوبل وارمنگ کی معلومات) اور ہمارا ماحول اور آلودگی شائع ہوئی ہیں جن کی ملک بھر میں پذیرائی ہوئی۔

ڈاکٹرجاوید احمد کامتوی: آپ وظیفہ یاب پرنسپل تھے۔آپ کے بچوں کے لیے لکھے گئے بہت سارے سائنسی مضامین ماہنامہ اردو سائنس میں جون 2004 تا 2012 لگاتار شائع ہوئے ہیں۔آپ کی لکھی ہوئی کتابیں 'ماحول اور انسان' اور 'سائنس ہمارے آس پاس' بچوں کو بیش بہا معلومات فراہم کرتی ہیں۔

شاھد رشید : آپ کے کئی سائنسی مضامین بچوں کے لیے شائع ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنے سائنسی مضامین کو ''مکاشفات'' نامی کتاب میں یکجا کیا ہے جن سے بڑے اور بچے یکساں مستفیض ہوتے ہیں۔

ایس ایس علی: آپ وظیفہ یاب معلم تھے۔آپ کی کتاب 'سائنسی تقریبات' بچوں کے لیے بہت مفید ہے۔

جنید عبدالقیوم شیخ : آپ جونیئر کالج میں سائنس کے معلم ہیں۔آپ نے بھی بچوں کے لیے سائنسی مضامین لکھے ہیں۔ان کی تین کتابیں مسلم سائنسدانوں کی سائنسی خدمات، انسانی جسم کے اندرونی اعضا اور سائنس برائے لطف (انگریزی سے ترجمہ) شائع ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر: آپ مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد کے شعبۂ نباتات کے صدر ہیں۔آپ مشہور سائنسی مضمون نگار ہیں۔درجنوں سائنسی کتابوں کے خالق ہیں۔آپ نے بڑوں اور بچوں کے لیے کئی سائنسی مضامین لکھے ہیں۔آپ کی دو کتابیں قوس قزح اور سائنسی روا بچوں کو بھرپور معلومات فراہم کرتی ہیں۔اس کے علاوہ حیاتیات، نباتات اور ماحولیات پر کئی کتابیں لکھ کر بچوں کو سیراب کیا ہے۔

عزیز ھاشمی : آپ نے جانوروں پر کئی مضامین تحریر کیے ہیں جو بچوں کے لیے باعث دلچسپی اور معلومات کا خزانہ ہیں۔آپ نے سائنسی کوئز پر بھی ایک کتاب تحریر کی ہے۔

محمد یعقوب خان: آپ سائنسی مضمون نگار ہیں جن کا تعلق کشمیر سے ہے۔آپ بچوں کے لیے سائنسی مضامین لگاتار لکھ رہے ہیں جو ملک اور بیرون ملک میں شائع ہورہے ہیں۔آپ اپنے تمام مضامین کو یکجا کرکے تین کتابیں سائنس سیریز، کائنات کی کہانی اور مسلمان سائنسداں سیریز شائع کرنے والے ہیں جو یقیناً بچوں کے لیے کارآمد ہوں گی۔

سیدہ فاطمہ زھرہ: آپ وظیفہ یاب پرنسپل ہیں۔آپ کے کئی مضامین بچوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔سائنسی مضامین پر مشتمل کتاب قوس قزح ہے جو بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

شاہ تاج خان: آپ صحافی اور سائنسی مضمون نگار ہیں۔آپ نے بچوں کے لیے سائنسی معلومات کو مکالمہ نگاری اور کہانی کی شکل دے کر عمدہ لکھ رہی ہیں۔ان کے مضامین کا مجموعہ 'پکنک' منظر عام پر آیا ہے۔جس کی پزیرائی خوب ہوئی ہے۔

وکیل نجیب: آپ بچوں کے مشہور ادیب ہیں۔آپ نے بچوں کے لیے کمپوٹان بہترین ناول تخلیق کی ہے۔

ڈاکٹر عبیدالرحمن: آپ محقق، شاعر، ادیب اور سائنسداں تھے۔آپ نے کئی مضامین مسلمان سائنسدانوں پر لکھے ہیں۔آپ کی تصنیف کردہ کتاب 'کچھ سائنس سے' بہت مقبول ہوئی ہے۔

رفیعہ منظور الامین : آپ مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔آپ کی دو کتابیں سائنس میں کیوں اور کیسے جلد (اول اور دوم) اور سائنسی زاویے شائع ہوئی ہیں جن میں بچوں کے لیے معلومات شامل ہے۔

ڈاکٹر صابرہ خاتون : آپ موظف پروفیسر ہیں۔آپ کی تین کتابیں سائنس میں کیوں اور کیسے، کھیل کھیل میں سائنس اور کیا، کیوں اور کیسے شائع ہوئی ہیں جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔

محمد سجاد عالم: آپ کئی سالوں تک بچوں کی سائنسی معلومات پر مبنی سوالات و جوابات بعنوان 'سائنس ناؤ' اور دیگر سائنسی مضامین لکھتے رہے ہیں جو ملک کے اخبار میں شائع ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر انور ادیب : آپ نے بھی کئی سائنسی مضامین بچوں کے لیے لکھے ہیں جیسے سائنس کوئز، میراث کوئز، چندریان۔اول خلائی مشن، اول دور کے مسلم سائنسداں، عظیم سائنسداں۔عبدالسلام، قرون وسطی کے جغرافیہ داں وغیرہ۔

بچوں کے چند سائنسی مصنفین

اب ہم ان بچوں کے مصنفین سے تعارف کرائیں گے جس کی ایک یا دو کتابیں بچوں کے سائنسی ادب پر نظر آئی ہیں۔ان کے نام کے بعد قوسین میں ان کی کتاب/کتابوں کا نام ہے:

طلعت عزیز (سائنس کا کرشمہ اور ایٹم سے نیوٹنک)، فریدالدین احمد (سائنس کی دنیا اور مواصلاتی سیارے)، شبانہ اسلام (ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے اور بجلی کی کہانی: ترجمہ)، طیبہ بیگم (ہماری کائنات)، شفیقہ فرحت (چوں چوں بیگم)، عادل رشید (ہمارے سائنسداں)، محمد اسلام فاروقی (سائنس نامہ)، وددوالحق (آنکھ کی کہانی اور انڈے سے چوزے)، انور سعید خان (سائنس: آج اور کل)، سراج الدین ندوی (مسلمان اور سائنس)، سید شہاب الدین دسنوی (کیمیا کی کہانی)، اطہر پرویز (پودوں اور جانوروں کی دنیا اور چارلس ڈارون)، ناظمہ پروین (سائنس کوئز) وزارت حسین (آرشمیدس۔ایک عظیم سائنسداں)، وسیم احمد فریدی (سراغ رساں ڈی این اے)، قیصر سرمست (رینگنے والے جانور)، ضیاء الدین علوی (ایجادات کی کہانی)، حکیم نعیم الدین (کمپیوٹر کیا ہے؟)، فریدالدین احمد (سائنس کی دنیا)، علی ناصر زیدی (غذا کی کہانی)، عارف محمد خان (ہندوستانی سائنسداں)، محمد اسحق صدیقی (سلسلہ عجائبات قدرت)، ریاض الدین احمد (حیرت کدہ عالم)، ایم یوسف انصاری (جانوروں کی نرالی دنیا)، محمد الحق (زمین کے بھید)، انیس اعظمی (جانوروں کی دنیا)، یوسف کمال (زمین کی کہانی)، شاداں پرویز (فضائی اور خلائی اڑان)، شریف احمد (جراثیم)، احمد حسین (ایٹم کیا ہے؟)، محمد ابراہیم (آبیات)، رشیدالدین

احمد (پیڑ پودوں میں وائرس سے پھیلنے والی بیماریاں) ابن آدم (روبوٹ)، محمد شمس الحق (آؤ سمندر کی سیر کریں)، اسلم پرویز (پانی کا جہاز اور اس کی تکنیک)، عارف نقوی (ٹیلی ویژن اوراس کی تکنیک)، وغیرہ۔

بچوں کے لیے سائنسی سیریز لکھنے والے چند مصنفین

خسرو متین (جانوروں سے ہم نے کیا سیکھا قسط وار شائع ہوئے ہیں)، بدیع الدین خان (کرشمات سائنس کی روشنی میں قسط وار لکھا ہے)، آفتاب احمد (الجھ گئے کے عنوان سے سیریز)، سمن چودھری (انسائیکلوپیڈیا کی سیریز)، ڈاکٹر اعظم شاہ خان (سائنسی کوئز کی سیریز)، پروین خان (سائنسی کوئز کی سیریز)، ایم اے کریمی (سائنسی کوئز کی سیریز)، سلیم احمد (آخر کیوں کی سیریز)، شہلا ناز (کیا آپ جانتے ہیں؟)، مسز فرحت مبین (سائنسی کوئز)، جمیل احمد (نام کیوں اور کیسے؟)، سرفراز احمد (ہماراجسم)، عقیل عباس جعفری (ہے حقیقت کچھ)، پروفیسر ایس ایم حق (ٹیلی ویژن)، ڈاکٹر مظہر الدین فاروقی (بلیک ہول)، احمد علی (سائنس کوئز) اورعبدالودود انصاری (میراث کوئز، پرندہ کوئز، سانپ کوئز) وغیرہ

بچوں کے چند سائنسی مترجمین

ان مصنفین نے دیگر زبانوں سے سائنسی کتابوں اورمضامین کے اردو میں ترجمے کیے ہیں:

عبد الرشید انصاری، ڈاکٹر عبید الرحمن اور ڈاکٹر محمد خلیل (بال پھونڈے کے فکشن کا ترجمہ کیے)، محمد شکیل (اروند گپتا کی تصنیف بیٹری انجن بنائیں)، نجمہ نقوی (بجلی کی کہانی)، شبانہ اسلام (ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے)، رجیہ یونس (کئی سائنسی فکشن)، طلعت عزیز (سائنس کا کرشمہ۔ایٹم سے نینو ٹیک تک)، سید آصف اختر نقوی (سمندر ایک دلکش دنیا)، سید ظفر الاسلام (دودھ اور دودھ سے بنی اشیاء) اورنسیم احمد (وائرس کاشکنجہ) وغیرہ۔

بچوں کی سائنسی شاعری

ہندوستان کے وہ شاعر بھی مبارکباد کے قابل ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے سائنسی نظمیں لکھ کر بچوں کے سائنسی ادب میں اضافے کیے ہیں۔ان میں کچھ شاعروں کی سائنسی نظموں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں جیسے:

ضمیر درویش: آپ کی سائنسی نظموں کا مجموعہ بنام ’سائنسی نظمیں‘ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے سائنس کا کرتب، گردش، اسٹیم انجن کی یاد میں، سکڑ گیا کیوں غبارہ؟ وغیرہ عنوانات پر نظمیں ہیں۔

حیدر بیابانی: آپ کی سائنسی نظموں کا مجموعہ’سائنس کی سوغاتیں‘ ہے جس میں انھوں نے ٹی وی، موٹر سائیکل، ٹیلی فون ریل، روبوٹ وغیرہ پر 27 نظمیں ہیں۔

کوثر صدیقی: آپ کی سائنسی نظموں کا مجموعہ’ہریالی‘ ہے جس میں آلودگی مٹائیں، پانی، تتلی، سارس وغیرہ پر 24 نظمیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سارے شعرا نے نظمیں کہی ہیں چند کے نام اور قوسین میں نظم/نظموں کے عنوان لکھے جا رہے ہیں۔

ہندوستان میں بچوں کے سائنسی ادب کا سرسری جائزہ پیش کرنے کے بعد ایک سوال بڑی تیزی سے منصہ شہود پر ابھر کر آتا ھے که متذکرہ ادب کی رفتار کس طرح بڑھائی جائے اور نہ صرف بڑھائی جائے بلکہ کس طرح کارآمد بنایا جائے۔اس کی اول ذمے داری سائنس کے استادوں پر جاتی ھے که وہ اپنے رشحات قلم سے اس ادب پر عملی قدم اٹھائیں کیوں که اردوداں بچے سائنسی عالم نزع میں جاں بلب ھیں اور حسرت بھری نگاھوں سے ان کی طرف دیکھ رہے ھیں۔

ڈاکٹر احمد علی برقی (کشش پرمنحصر ہے نظام کونین، آلودگی کو مٹائیں، زلزلہ، گلوبل وارمنگ اور منحصر ہر چیز ہے سائنس پر وغیرہ)، سردار رنواز صارم (خون، نوری ترکیب، کلپنا چاؤلہ، توانائی)، مرزا اشتیاق بیگ (قوانین حرکت)، خوشنود پروین (قرآن اور سائنس)، حنا وزارت (تتلی)، ممتاز فاطمہ (آنکھ)، محمد وزیر عالم (سائنس کا دور، سائنس کی ایجاد)، انور شمیم (ٹیلی ویژن، فرج اور کولر)، ڈاکٹر توصیف الحسن (انمول ذرہ) امین حزیں (سائنس کا کمال)، احمد بالا پوری، بسم اللہ عدیم برہان پوری، جاوید اکرم، وفا ناہید، ریاض انور بلڈانوی اور شبیر احمد ماہر (سبھوں کی کمپیوٹر پر نظم)، عطاء الرحمن اور محمد وکیل (انٹر نیٹ پر نظم)، مرتضیٰ ساحل تسلیمی (ٹیلی فون کی کہانی)، شکیل خان (انورٹر) اور عاکف سنبھلی (ایروپلین) وغیرہ کے علاوہ حافظ کرناٹکی، عطاالرحمن طارق، علاؤالدین عنبر نے بھی بچوں کے لیے سائنسی نظمیں لکھی ہیں۔

بچوں کے چند سائنسی مصنفین

بچوں کے سائنسی مصنفین جن کے مضامین گا ہے گا ہے دیکھنے کو ملے ہیں چند کے نام اور قوسین میں ان کے مضمون کا ایک عنوان شامل کر کے فہرست پیش کی جارہی ہے۔عصمت چغتائی (بھیڑیے کے بچے)، ڈاکٹر بلقیس بانو (پروٹین کی اہمیت)، بلقیس موسوی (عددی نظام: حصہ اول و دوم)، صائقہ بیگم (آلودگی)، روبینہ نازلی (سمندر کی باتیں)، رقیہ جعفری (ارشمیدس)، زاہدہ خاتون (پرندوں کی باتیں)، شہباز صدیقی (میں آنکھ ہوں)، توفیقہ کھروٹ (نظام شمسی کے سیارے)، کہکشاں سلطانہ (تھرمامیٹر)، نسیم احمد (جانوروں سے بچ کر کھیلیں)، شیخ شکیل احمد (گاجر گھاس)، ڈاکٹر انورادیب (ارشمیدس دنیا کا پہلا کامل سائنسداں)، انیس مرزا (بابائے سائنس گلیلیو گیلیلی)، شرجیل احمد خان (ہمارا شمسی نظام)، محمد معاویہ مغل (تھیلی دار جانور)، خسرو متین (جانوروں سے ہم نے کیا سیکھا)، جمیرا اسید (سائنسی مقابلہ) انصاری حفیظ الرحمن (ارشمیدس)، رئیسہ حشام الدین (قرآن حکیم اور حشرات الارض)، پروفیسر محمد عاقل کاظمی (مشینی انسان روبوٹ)، ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی (سائنس کارنر)، شمیم احمد صدیقی (پانی رے پانی)، شمیم صدیقی (میں الو ہوں)، رقیہ جعفری (البیرونی)، ذاکر امان (امرود)، راشد حسین (امرود)، گوہر اسلام (املی)، اسعد فیصل فاروقی (اوزون پرت)، سید عابد علی (کاربن کے مختلف روپ)، جاوید احمد (شمسی توانائی)، آصف علی خان (کمپیوٹر کی کہانی) وغیرہ۔

ہندوستان میں بچوں کے سائنسی ادب کا سرسری جائزہ پیش کرنے کے بعد ایک سوال بڑی تیزی سے منصۂ شہود پر ابھر کر آتا ہے کہ متذکرہ ادب کی رفتار کس طرح بڑھائی جائے اور نہ صرف بڑھائی جائے بلکہ کس طرح کارآمد بنایا جائے۔اس کی اول ذمے داری سائنس کے استادوں پر جاتی ہے کہ وہ اپنے رشحات قلم سے اس ادب پر عملی قدم اٹھائیں کیوں کہ اردوداں بچے سائنسی عالم نزع میں جاں بلب ہیں اور حسرت بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے اور یقیناً ایسا ہوگا کہ آپ کے قلم سے ٹپکے ہوئے سائنسی مضامین کے قطرے ان کی زندگی کو لوٹا دیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو

کل نہ پوچھا تو آج پوچھے گا
وقت اپنا حساب پوچھے گا
نونہالوں کو کیا دیا تو نے
پھر بولتا سماج پوچھے گا

آخر میں ادبی دنیا سے التماس کروں گا کہ صبح کا بھولا شام آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے ہیں۔ خدارا اب بھی بچوں کے سائنسی ادب کو ادب سمجھیں اور جائز مقام دیں۔

■

Abdul Wadood Ansari
Urdu Medium Government Primary Teachers' Training Institute
Post: Nalikul- 712407 (West Bengal)

مہمنہ خاتون

بچوں کے ادب کی اہمیت

ادب کسے کہتے ہیں

ادب عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لفظی معنی میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے اس کے معنی حسن تناول یعنی بہترین معاملہ بتائے ہیں۔ بعض لوگوں نے اسے تعلیم وتربیت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اموی دورِ حکومت میں جو خلفا بچوں کو لکھنا پڑھنا، زبان دانی، تہذیب وتمدن سکھاتے تھے انھیں مؤدب یا ادیب کہا جاتا تھا۔ یہ مؤدب چونکہ بچوں کو اخلاق حسنہ سے نوازتے تھے اور انھیں زبان دانی، فصاحت اور بلاغت سکھاتے تھے اس لیے لفظ ادب ان تمام علوم پر بولا جانے لگا۔ لہٰذا دورِ عباسی یعنی اسلامی دورِ حکومت میں ادب سے مراد وہ تمام علوم سمجھے جانے لگے جن میں نسلِ انسانی کے لیے فلاح و بہبود شامل ہوں۔ اردو ادب کی نشو ونما دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے جب عرب مسلمان تاجر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اس دور میں صوفیاءِ کرام نے اپنے پند ناموں، ملفوظات اور کتابچوں سے اردو زبان وادب کو پروان چڑھایا تا نکہ امیر خسرو نے 'خالق باری' نامی معرکۃ الآرا کتاب لکھ کر اردو ادب میں منظوم لغت کا نمونہ پیش کیا۔ حالانکہ امیر خسرو سے قبل اس قسم کی لغات لکھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا مگر یہ کتابیں عربی اور فارسی زبان میں تھیں جن کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''عربی زبان میں فنِ لغت کی سب سے قدیم کتاب ابوعلی محمد قطرب النحوی کی 'مثلثات قطرب' ہے۔ جس میں 32 اشعار میں 30 الفاظ کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔ ابونصر اسماعیل بن حماد الجوہری کی 'صحاح' فنِ لغت میں کلاسیکل کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ فارسی میں ابونصر فراہی نے 1213 میں 'نصاب الصبیان' لکھی جو درسِ نظامیہ میں صدیوں سے داخل ہے جس میں عربی لغات کو فارسی اشعار میں بیان کیا گیا ہے''۔

(جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول (قدیم دور)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009، ص 29)

ادب کی نشو ونما کا یہ سلسلہ یونہی پروان چڑھتا رہا اور دو طرح کی کتابیں ہمارے سامنے آگئیں جن میں ایک علمی کتابیں تھیں دوسری ادبی کتابیں۔ علمی کتابیں وہ ہیں جن سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے جیسے سائنس، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ کی کتابیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے ہمیں دنیا بھر کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دوسری وہ کتابیں ہیں جو ہمیں ذہنی و دلی خوشی فراہم کرتی ہیں۔ اس طرح کی کتابوں کو پڑھ کر ہمیں لذت اور مزہ ملتا ہے۔ یہ کتابیں قصہ، کہانی اور نظم وگیت وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھ کر ہمیں نیکی بدی، اچھائی برائی، خوبصورتی، بدصورتی، سچ، جھوٹ اور ان کے انجام کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ یہ کتابیں ہماری ادبی تربیت کرتی ہیں۔ ادب کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی عکاسی کرتا ہے۔ زمانے کی بول چال، رسم ورواج اور رہن سہن کا اندازہ ہمیں اس دور میں تخلیق کیے گئے ادب سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ 'باغ و بہار' پڑھیں یا 'فسانۂ عجائب'، 'رانی کیتکی کی کہانی' پڑھیں یا 'فسانۂ آزاد' ہر ادبی تخلیق اپنے دور کا آئینہ نظر آتی ہے۔ ادیب وشاعر ہمارے ادب کے وہ معمار ہیں جن کی بدولت ہمیں اپنے سماج، سوسائٹی، ملک، قوم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات ہمارے دلوں میں حبِ وطن، امن وآشتی، میل ملاپ اور ترقی قوم کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ گویا یہ حضرات ہمارے سماج کے اہم بنیاد گزار ہیں۔

ادب اظہار و بیان کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ جتنے عمدہ اور پراثر انداز میں ہم اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کر سکتے ہیں کریں اسی کا نام ادب ہے۔ جیسا دور اور جیسی معاشرت ہوگی ویسے ہی جذبات وخیالات ہوں گے اور پھر ویسا ہی ادب تخلیق ہوگا۔ ادب ہر دور میں تخلیق کیا گیا جس قوم یا سماج کا کوئی ادب نہیں ہوتا وہ قوم مردہ تصور کی جاتی ہے۔ ادب کی تخلیق کا سب سے بڑا مقصد قوم میں انسانیت، آزادی کا جذبہ، خود اعتمادی، بیداری اور اتحاد پیدا کرنا ہے۔

ادب تخلیق کرتے ہوئے مقصد کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر دور میں جو بھی ادب تخلیق کیا گیا شعوری اور لاشعوری طور پر اس میں ایک مقصد ضرور پنہاں رہا ہے۔ پھر بھی بامقصد ادب کی تخلیق کے لیے Creativety یعنی اختراع اندازی کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ ادب محض خبر اور ضرورت بن کر رہ جاتا ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

''مقصد میں جب تک ایک تخلیقی مثبت Creative plus sign کا اضافہ نہ ہو وہ ادب نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ محض واقعے کی اطلاع یا اخبار کی نامہ نگاری دنیا میں آج تک ادب کا درجہ حاصل نہیں کر سکی''۔

(مجنوں گورکھپوری: ادب اور زندگی، اردو گھر علی گڑھ، طبع چہارم، 1965، ص 38)

ادب کی تخلیق کا مقصد اس وقت پورا ہو جاتا ہے جب اس کے مطالعے سے انسان خود بخود اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس پر عمل پیرا ہو کر مہذب وشریف بن جائے۔

بچوں کے ادب کے تقاضے اور مقاصد

بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جاتا ہے جو ان کی کردار سازی اور ذہنی تربیت میں معاون ہو۔ بچوں کے ادب کی بنیاد علم اور اخلاق پر ہو اور اس کے مقاصد اچھی

تعلیم و تربیت پر مبنی ہوں جو بچوں کی فطری صلاحیتوں کو ابھار سکیں بقول شفیع الدین نیر ”بچوں کے لیے ایسے موضوعات پر مشتمل نظمیں، کہانیاں یا مضامین مناسب ہوتے ہیں جن میں صحت، صفائی، تفریح، درس اور محنت و مشقت کی طرف انھیں توجہ دلائی جائے۔ مختلف کھیلوں کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے۔“ بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے جس کے مطالعے سے بچوں میں حب الوطنی، باہمی اتحاد اور قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہو۔ اس میں مذہبی و اخلاقی موضوعات شامل ہوں کیونکہ ان کی دماغی و ذہنی نشو و نما اور تربیت کے لیے ان کے ادب میں اخلاقیات کا درس بہت اہم ہے۔ بچے کورے کاغذ کی طرح ہوتے ہیں جو چاہیں ہم ان پر لکھ سکتے ہیں۔ اگر ابتدا ہی سے انھیں اچھی اخلاقی باتیں بتائی جائیں گی تو ان کی صحیح اور صحت مند نشو و نما ہوگی۔ بچوں کو اخلاقی باتیں، مذہبی اور تاریخی واقعات کو نظم و نثر کی شکل میں لکھ کر اور سنا کر سکھائی جا سکتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کا درسی نصاب ان کی عمر کے لحاظ سے تشکیل دیا جاتا ہے اور نرسری سے ہی انھیں بہادری کی، پریوں کی، طلسم کو حاصل کرنے کی، راز کو ڈھونڈنے کی کہانیاں اور نظمیں سنائی جاتی ہیں۔ ان کے لیے تحریر کی گئی نظمیں ان کی عمر کے لحاظ سے معلومات افزا ہوتی ہیں جیسے

ایک طرف سے چوہیا آئی ایک طرف سے دودھ ملائی
یہ بھی کھالوں وہ بھی کھا لوں
میاؤں میاؤں میاؤں میاؤں
چوں چوں کرتی چڑیا آئی دانے دانے کو للچائی
اس کو آخر کیوں ترساؤں
میاؤں میاؤں میاؤں میاؤں

(افسر)

اس نظم میں تین سے چار سال کے بچوں کو یہ سمجھایا جارہا ہے کہ چوہیا گھر بھر میں دوڑتی پھرتی ہے اور ہر چیز میں منہ مارتی ہے اس کا دل چاہتا ہے کہ یہ بھی کھالوں وہ بھی کھالوں۔ اسی طرح چڑیا پھدک پھدک کر دانے تلاش کرتی رہتی ہے تو شاعر بچوں سے کہتے ہیں کہ چڑیا کو بھی کچھ کھانے کو دے دو اسے بھی نہ ترساؤ۔ اس عمر کے بچوں میں تلاش و جستجو بہت زیادہ ہوتی ہے وہ ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں اور سوالات کرتے ہیں۔ ان کے سوالات کو نہایت سنجیدگی سے سننا چاہیے اور جوابات دینا چاہیے۔ والدین اور اساتذہ کی لاتعلقی بچوں کی ذہنی نشو و نما کو روک دیتی ہے۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ بچے کے ہر سوال کا نہایت خوش مزاجی سے جواب دیں۔ بچوں کی تعلیم کا بڑا مقصد کردار سازی اور سیرت سازی ہے۔

یہ نقطہ ان کے لیے تیار کیے جانے والے ادب میں ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اگر ہمارا ادب اس مقصد کو پورا نہیں کرتا تو ہم بچوں کو بہترین انسان بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے ان کے ادب میں اخلاق و سیرت سازی کے واقعات کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ اگر ہمارے بچے سچائی، رواداری اور صالح قدروں سے نا آشنا ہے تو ان کے مستقبل کا خدا ہی مالک ہے۔ نرسری اسکول کے بعد بچہ صحیح معنی میں ادبی زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ یہ عمر پانچ سال سے لے کر تمام زندگی پر محیط ہے۔ عمر کے اس دور میں بچوں کو کتابوں سے خاص لگاؤ ہوتا ہے اور ان میں مسابقتی جذبہ پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اسکول کے مختلف پروگراموں میں حصہ لینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، نظموں، کہانیوں کی طرف ان کی دلچسپی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ بچوں کی درجہ بہ درجہ ادبی نشو و نما کے پیش نظر پروفیسر مسعود حسین خان فرماتے ہیں:

”چھ سال کی عمر تک وہ صاف تلفظ کے ساتھ زبان بولنے لگتا ہے۔ چھ برس کی عمر سے بچوں کو اپنی مادری زبان پر عبور حاصل ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد اسی منزل پر بچے میں ادبی شعور جاگتا ہے۔ اس کے بعد فرہنگ، اظہار بیان، اصلاحات عملیہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ چیزیں ادبی نشو و نما میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ صوتیات اور جملے ٹھیک ہو جاتے ہیں چونکہ اس عمر میں بچے کو وزن اور عروض کا احساس ہونے لگتا ہے اس لیے وہ منظوم ادب میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی آسان نظمیں گاتا اور گنگناتا ہے۔ چونکہ منظوم ادب پُرکشش بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی۔ بچے میں تک بندی کا شوق بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے تک بندی خوب کرتے ہیں جب کہ انھیں اوزان کا قطعی احساس نہیں ہوتا۔ بچے کی ذہنی صلاحیت اس عمر میں ہی واضح ہوتی ہے۔ اس کی قوتِ متخیلہ میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا ذہن تیزی سے خیالی دنیا میں پرواز کرتا ہے۔ اسی سبب نظم کے بعد بچہ اگر کسی چیز میں دلچسپی لیتا ہے تو وہ خیالی کہانیاں ہیں۔“

(حسین، پروفیسر مسعود، 'بچوں کا ادب'، سیمینار 'اردو میں بچوں کا ادب'، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، فروری 1975، ص 2)

لہٰذا ضروری ہے کہ بچوں کی مناسب اور مثالی تربیت کے لیے گھر اور اسکول، والدین اور اساتذہ سب لوگ متحد ہو کر ان کی کردار سازی کے منصوبے کو عملی جامہ پہنائیں۔

سات آٹھ سال کی عمر کے بچوں کو ایسی کتابیں فراہم کی جاتی ہیں جو آسان زبان میں، پُرکشش، باتصویر اور دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ تصویریں بچوں کے ادب میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ ایک تصویر کو دیکھ کر متعدد سوال کرتے ہیں۔ جیسے یہ کیا ہے؟ یہ کون ہے؟ یہ کس نے بنائی؟ اس کا رنگ کون سا ہے؟ وغیرہ۔ ان تصاویر کے ذریعے ہم ان کو اسکول، استاد، مثالی شخصیات، تاریخی عمارتوں، مساجد و منادر، پارک، جھولے، ذرائع آمد و رفت، پھلوں، پھولوں، سبزیوں، جانوروں اور پرندوں کے بارے میں دنیا جہاں کی معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں ہم بچوں سے مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں اسکول، پارک، ہوائی جہاز اور اسی قسم کے دیگر موضوعات سے متعلق چار لائنیں لکھ کر دکھائیں۔ اس سے بچوں میں یاد کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگی اور ہم ان میں بیک وقت تحریری و تقریری شعور پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

نو سے پندرہ سال کی عمر کے بچوں میں بڑے لوگوں کی تقریباً تمام تر عادات آ چکی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے تئیں بہت سمجھدار ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے وہ ہر مہم سر کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ وہ مختلف منصوبے بناتے ہیں اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں جس کی مثال ہمیں عصمت چغتائی کے ناول 'تین اناڑی' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ناول کے کردار تین بچے گکو، ٹیٹو اور بیلو ہیں جو چھٹیاں گزارنے کے مختلف منصوبے بناتے ہیں۔ ایک دن وہ گڑ کی مٹھائی بنانے اور اسے بیچ کر منافع کمانے کے بارے میں سوچتے ہیں اور اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے گڑ جمع کرتے ہیں۔ سب کی آنکھ سے چھپ کر وہ کچن میں گھستے ہیں اور جب کوئی برتن خالی نہیں ملتا تو ایک بڑے بھگونے میں جمع شدہ گڑ ڈال کر اسے پکاتے ہیں۔ ظاہر ہے بچوں کی کم عمری اور ناسمجھی کی وجہ سے گڑ بھگونے میں چپک جاتا ہے اور ان کا گڑ کی مٹھائی کی تجارت کا منصوبہ فیل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اور منصوبے بناتے ہیں اور ناکام ہوتے ہیں مگر اپنی ہر ناکامی سے وہ کچھ نہ کچھ سبق ضرور سیکھتے ہیں۔ بچوں کے یہی تجربات انھیں ایک پختہ کار انسان بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اس عمر کے بچوں کے لیے ایسا ادب تیار کیا جاتا ہے جس میں مشاہیر کے کارنامے، بہادروں کے قصے، جوشیلی نظمیں اور مہم سر کرنے والی کہانیاں شامل ہوں۔ اس عمر کے بچوں کو ڈراموں سے بھی بہت دلچسپی ہوتی ہے اور انھیں مثالی شخصیات کا رول ادا کرنے میں بڑی لذت اور خوشی ملتی ہے۔ یہ وقتی نقل ان کی تمام زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ اپنے اسلاف کی طرح بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مظفر حنفی اپنی ایک نظم 'میری بھی ہے ذمہ داری' میں بچوں کی

اسی حساسیت اور ذمے داری نبھانے کے جذبے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جوں جوں بچوں میں بڑے ہونے کا شعور بیدار ہونا شروع ہوتا ہے وہ اپنے گھر بار، ملک، قوم وطن اور اڑوس پڑوس میں ہورہی تبدیلیوں میں حصہ لینا شروع کردیتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک ذمے دار انسان ماننے لگتے ہیں:

آمدنی کم، کنبہ بھاری　　بچے بھوکے، ماں دکھیاری
لاحق روز نئی بیماری　　سب کا باعث ہے بیکاری
میری بھی ہے ذمہ داری

چودہ سے اٹھارہ سال کی عمر تک بچوں میں مکمل طور پر پختگی آجاتی ہے۔ وہ خود مختار ہوجاتے ہیں اور اپنے فیصلے بھی کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے بڑوں، بزرگوں اور اساتذہ سے مشورہ طلب کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ جس کے بارے میں خوشحال زیدی لکھتے ہیں:

''اس منزل پر بچہ پوری طرح ہوشمند ہوجاتا ہے۔ وہ دنیا، سماج، ماحول، خاندان اور اپنے قرب وجوار سے پوری طرح واقف ہوجاتا ہے۔ اس کو اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ، تخیل میں رفعت، تجربات میں وسعت اور اعتماد میں پختگی آجاتی ہے۔ اب بچہ آزادی اور خود مختاری کو پسند کرتا ہے، اپنی پسند اور ناپسند پر اس کو اصرار ہوتا ہے۔ جو کچھ بھی اس کو اپنے ماحول، تعلیم اور ادب سے ملتا ہے اس سے وہ پوری طرح متاثر ہوتا ہے۔ دراصل اس عمر میں بچے کی شخصیت، مزاج، عادت واطوار اور کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔''

(زیدی، خوشحال، اردو میں بچوں کا ادب، ادارہ بزم خضر راہ، غفار منزل، اوکھلا، نئی دہلی، مارچ 1989، ص40)

بچوں کو کامل انسان بنانے میں کتابوں کا بہت اہم کردار ہے۔ انھیں بآسانی کتابوں کے ذریعے سچ، جھوٹ، اچھے برے، غم خوشی، انصاف ونا انصافی، ایمان داری اور بے ایمانی کے فرق کو سمجھایا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کے مطالعے سے ان کے اندر یہ بات ذہن نشیں ہوجاتی ہے کہ بے غرض محبت کا صلہ آخر کار اچھا ہی ہوتا ہے اور برائی کا بدلہ برا ہی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین کی کہانی 'آخری قدم' میں دکھایا گیا ہے کہ ''ایک مالدار آدمی جو بظاہر کنجوس ہوتا ہے مگر پوشیدہ طور پر غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا رہتا ہے۔ کئی مدرسے اور اسکول اس کی امداد سے چلتے ہیں مگر لاعلمی کی وجہ سے لوگ اسے طعنہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو اتنا مالدار ہو کر بھی نہ اچھا پہنتا ہے اور نہ اچھا کھاتا ہے اور نہ ہی کسی کی مدد کرتا ہے۔ وہ اکثر اس قسم کی باتیں سن کر دل بر داشتہ ہوجایا کرتا تھا یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آجاتا ہے۔ وہ اپنی تمام اچھائیاں اور نیک کام ایک ڈائری میں لکھا کرتا تھا، اپنے آخری وقت میں وہ سوچتا ہے کہ جب میں مرجاؤں گا تو لوگ اس ڈائری کو پڑھیں گے پھر انھیں اس وقت شرمندگی ہوگی کہ ہم اتنے نیک آدمی کو یونہی برا بھلا کہتے تھے۔ مگر فوراً ہی اسے خیال آتا ہے کہ لوگوں کو شرمندہ کرکے مجھے کیا حاصل ہوگا۔ میں نے یہ سب کام لوگوں کو دکھانے کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے کیا ہے۔ لہٰذا وہ اس ڈائری کو جلا دیتا ہے اور پُرسکون ہوکر مسکراتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے''۔ نیکی کا جو صلہ اس کنجوس مالدار کو ملتا ہے بچوں کے لیے اس میں بہت بڑی نصیحت پنہاں ہے۔ ان کے دل میں بھی نیکی کا جذبہ پیدا ہوسکتا ہے لہٰذا اس قسم کا تعمیری ادب بچوں کی بہترین نشو ونما کے لیے ضروری ہے۔

بچوں کا ادب تیار کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد بچے اپنے بڑوں کا ادب واحترام کرنے والے بنیں، ان کے دلوں میں دوسروں کے لیے ہمدردی، نرمی، محبت اور مدد کا جذبہ پیدا ہو۔ اس کے لیے عملی نمونہ بن کر دکھانا بھی ضروری ہے۔ جو لوگ بچوں سے ادب واحترام سے پیش آئیں گے تو بچے بھی ان کا کہنا مانیں گے، ان کی ہدایات و احکامات پر عمل کریں گے لیکن اگر بچوں سے حاکمانہ اور جارحانہ انداز میں بات کی جائے گی تو ان پر بڑوں کی نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ بچے باغی بن جائیں گے۔ اس لیے بڑوں کو چاہیے کہ وہ لکھتے پڑھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، مہمان نوازی کرتے وقت بچوں کے سامنے عملی نمونہ بن کر دکھائیں۔

بچوں کا ادب تشکیل کرتے وقت ان کی نفسیات کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ کس طرح کی چیزیں پسند کرتے ہیں، انھیں کن چیزوں کا شوق ہے۔ ان کی دلچسپی اور شوق کا خیال رکھتے ہوئے انھیں کتابیں فراہم کی جاتی ہیں تاکہ مطالعہ کرنے کا عمل متواتر بنا رہے۔ اگر والدین واساتذہ بچوں کی نفسیات اور ان کے شوق وذوق سے لاعلم ہوں گے اور ان پر زبردستی کتابوں کو لادیں گے تو ان کی دلچسپی کتابوں سے ختم ہوجائے گی اور پڑھنے سے ان کا دل اچاٹ ہوجائے گا۔ بچوں کو کس قسم کی کتابیں پسند ہوتی ہیں اس کا ذکر مشیر فاطمہ اس طرح کرتی ہیں:

''بہترین اور اچھی چیزوں میں سے بہت کم یاب چیزیں بچے پسند کرتے ہیں۔ بچوں کو ایسی کتب زیادہ پسند آتی ہیں جن میں سچائی، دیانت داری، ایثار، قربانی، حق کی فتح اور بصیرت ہوتی ہے''۔

(مشیر فاطمہ: بچوں کے ادب کی خصوصیات، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1962، ص77)

بچوں کے لیے بامقصد ادب تیار کرنا چاہیے کیونکہ اگر کسی کتاب کو پڑھ کر ان کے خیالات میں خوش آئند تبدیلی واقع نہ ہوئی تو وہ کتاب بچوں کی ذہنی تربیت کرنے سے قاصر سمجھی جائے گی اور اس قسم کی کتابیں فراہم کرکے ہم بچوں کا وقت اور ان کی ذہنی ترقی میں رکاوٹ کا سبب بنیں گے۔

جن بچوں کو بچپن ہی سے اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ہوجاتی ہے وہ بڑے ہوکر اچھے ادیب، شاعر اور فن کار بنتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کو بھی بہتر بناسکتے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ آج جو بچہ ذہنی طور پر صحت مند ہے وہ زندگی کے ہر میدان میں آگے نظر آئے گا۔ جو بچہ عقل مند، تیز اور سمجھ دار ہوتا ہے اس کے خیالات بلند، ارادے پختہ اور شخصیت پُرکشش ہوتی ہے۔ اس بچے میں ہر کام کو خود کرنے کی جستجو اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو بچہ زندگی میں بہت کامیاب انسان بن کر ابھرے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچے کی نشو ونما مناسب ماحول میں ہو۔ بچہ ایسا آزادانہ ماحول چاہتا ہے جو اس کے خیالات اور تصورات کو عملی جامہ پہنانے میں مدد کرے۔

■

Dr. Mohaimina Khatoon
Dept of Urdu
University of Laddakh
Kargil Campus
Kargil- 194105 (J&K)

> ''بچوں کو کامل انسان بنانے میں کتابوں کا بہت اہم کردار ہے۔ انھیں بآسانی کتابوں کے ذریعے سچ، جھوٹ، اچھے برے، غم خوشی، انصاف و نا انصافی، ایمان داری اور بے ایمانی کے فرق کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کے مطالعے سے ان کے اندر یہ بات ذہن نشیں ہو جاتی ہے کہ بے غرض محبت کا صلہ آخر کار اچھا ہی ہوتا ہے اور برائی کا بدلہ برا ہی ملتا ہے۔''

بلال احمد گنائی

اردو میں ادب اطفال

> معیاری ادب اطفال ہم اسے ہی کھیں گے جس میں عمروں کے لحاظ سے بچوں کی نفسیات کا خیال رکھا گیا ہو۔ کوئی سبق آموز بات کھی گئی ہو۔ ایسی عام فھم زبان استعمال کی گئی ہو جوان کی لسانی استعداد کے عین مطابق ہو۔سبق کو رنگوں کے بھترین امتزاج سے اور خاکوں، تصاویر و قدرتی مناظرکی مدد سے جاذب نظر اور پر کشش بنایا گیا ہو اور کتابوں کی اشاعت و طباعت معیاری ہو۔

ادبِ اطفال کی بڑی اہمیت ہے۔اس کے ذریعے بچوں کی ذہنی تربیت ہوتی ہے، شخصیت نکھرتی ہے، نفسیات سنورتی ہےاور سماجی ذمے داریوں کا احساس جاگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں ادبِ اطفال کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ ادبِ اطفال اس بنیاد کی طرح ہے جس پر عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہ جتنی مضبوط ہوگی اس پر اتنی ہی منزلیں تعمیر ہوسکیں گی۔ بظاہر بچوں کا ادب بڑا سہل اور آسان لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی تخلیق و ترتیب میں ہمیں کئی پل صراطوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ نفسیات ماہرینِ لسانیات اور دانشوروں کی ایک ٹیم سر جوڑ کر مدتوں بیٹھتی ہے تب کہیں جاکر بچوں کا نصاب تیار ہوتا ہے۔ ادبِ اطفال کے زمرے میں وہ تخلیقات بھی آتی ہیں جو ادیب اور شاعر اپنے ذوق وشوق یا ضرورت کے تحت ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ اس کی تیاری میں خاکوں، تصویروں اور مناظر کو استعمال میں لاتے وقت رنگوں کے بہترین امتزاج کا خیال بھی رکھا جاتا ہے تاکہ بچوں کی دلچسپی قائم رہے۔ اس لیے مواد کی تیاری میں فنِ مصوری سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ آج کل تو ادبِ اطفال میں برقی میڈیا کا عمل دخل بھی ناگزیر ہوگیا ہے؛ جیسے کارٹون فلمیں، سلائڈس، سمعی امداد وغیرہ۔ یہ چیزیں بھی ادبِ اطفال کا حصہ ہیں۔

معیاری ادبِ اطفال ہم اسے ہی کہیں گے جس میں عمروں کے لحاظ سے بچوں کی نفسیات کا خیال رکھا گیا ہو۔ کوئی سبق آموز بات کہی گئی ہو۔ ایسی عام فہم زبان استعمال کی گئی ہو جوان کی لسانی استعداد کے عین مطابق ہو۔ سبق کو رنگوں کے بہترین امتزاج سے اور خاکوں، تصاویر وقدرتی مناظر کی مدد سے جاذب نظر اور پر کشش بنایا گیا ہو اور کتابوں کی اشاعت وطباعت معیاری ہو۔ ادب اطفال کی تیاری میں بچوں کی دلچسپی کو قائم رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسی سطح پر بھی مندرجہ بالا باتیں بچوں کا نصاب تیار کرتے وقت پیش نظر نہیں رہیں گی تو وہ اسے نصاب کی کمزوری سمجھا گائے گا۔ نصاب کی کوتاہیاں بچوں کی طبیعت میں اچاٹ پن لے آتی ہیں۔ ادبِ اطفال میں ایک اہم چیز سائنٹفک temperament. کو ہونا ہے یعنی بچوں کے نصاب میں منطقی دلائل سے چیزوں کا دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بچے پڑھتے اور سمجھتے وقت کسی تناؤ اور الجھاؤ کا شکار نہ ہوں ورنہ ہم انھیں وہ نہیں دے پائیں گے جو انھیں دینا چاہتے ہیں۔ یہاں ہم شعری آہنگ سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو چیزیں یاد کرانے اور یاد رکھنے میں بچوں کی مدد کرتی ہیں اس طرح بڑی بڑی باتیں چھوٹے چھوٹے انداز میں ان تک پہنچ سکتی ہیں۔ سیکھتے وقت ایسا کھلا ماحول ہونا چاہیے کہ کھیل کھیل میں ان تک باتیں پہنچتی رہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ادبِ اطفال ہمارا ساتھ دے۔

ادبِ اطفال کے موضوعات میں تنوع ہونا چاہیے۔ وطن سے پیار، بڑوں کا ادب و احترام، صفائی ستھرائی، صحت وتندرستی، جانوروں سے محبت، امن وشانتی، جھوٹ وفریب سے نفرت، غریبوں اور کمزور طبقوں کی مدد اور ان کی عزت وغیرہ کے علاوہ بچوں کی دلچسپی کے متعدد ایسے موضوعات ہیں جو ادبِ اطفال کا موضوع بنتے رہے ہیں لیکن یہاں عصری تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، جیسے گلوبل وارمنگ کے مسائل، آلودگی کے مسائل، دہشت گردی اور مذہبی جنون سے پیدا ہونے والے مسائل، ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ سے سامنے آنے والے مسائل، برقی میڈیا کے مثبت اور منفی پہلو، ٹوٹتے سماجی رشتوں کے نقصانات وغیرہ۔ ظاہر ہے یہ موضوعات بچوں کے لیے کافی مشکل اور بھاری بھر کم ہیں لیکن عصرِ حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادبِ اطفال سے انھیں یکسر خارج نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کم سے کم اشاروں اور کنایوں میں ان باتوں کو اٹھا کر انھیں بچوں کے شعور کا حصہ بنا سکتے ہیں۔ زبان سلیس وسادہ اور لہجہ یقیناً دھیما ہوگا۔

ہمارے یہاں اردو میں بچوں کا جو ادب دستیاب ہے، اس میں ترمیم واضافے کی بڑی گنجائشیں ہیں۔ اول تو وہ بہت کم لکھا گیا ہے۔ دوسرے عالمی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ محدود موضوعات ہیں۔ بچوں کی نفسیات کے عین

مطابق بھی نہیں ہے۔ افادیت سے محروم ہے۔ جدید حسیت کی عکاسی نہیں کرتا۔ طباعت و اشاعت بھی اچھی نہیں ہے۔ان باتوں کے علاوہ بچوں کے اندر نہ سائنٹفک شعور پیدا کرتا ہے اور نہ ان میں innovativeness لاتا ہے۔اردو میں ادبِ اطفال سے متعلق رسائل اور جرائد کی بھی کمی ہے۔کہا جاتا ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم کی گئی بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے اور یاد بھی رہ جاتی ہے۔شاید اسی لیے اردو میں منظوم قواعد لکھی گئیں۔ اردو میں ادبِ اطفال کی روایت کافی پرانی ہے۔ یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی کی آخری دہائیوں سے شروع ہوتا ہے۔

اردو میں ادبِ اطفال کے موضوعات اس طرح ہیں :

1. زبان کی درس وتدریس میں تلفظ اور قواعد کے اصول
2. مناظر قدرت کا بیان
3. وطن پرستی اور قومی یکجہتی
4. انسان دوستی اور محبت واخوت
5. مذہبی عقائد اور سماجی ذمے داری
6. پرندوں اور چرندوں سے پیار
7. اخلاقی اقدار
8. تہذیبی وثقافتی زندگی کی عکاسی
9. علم کے حصول کی اہمیت وافادیت
10. اہم سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیات کو خراجِ عقیدت وغیرہ

ادب اطفال کے یہ متنوع موضوعات بتاتے ہیں کہ مادی زندگی کے مقابلے میں ہمارا زیادہ زور اخلاقی اور روحانی اقدار پر رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادبِ اطفال میں دو اہم باتیں نہیں ہیں یعنی scientific temprament اور innovation جن کی بچوں کی ذہن سازی میں بڑی اہمیت ہے۔ اردو میں بچوں کو زبان سکھانے کے جو طریق کار دستیاب ہیں وہ غیر سائنٹفک ہیں۔زبان سیکھنے اور سکھانے کی جدید تکنیک کو بروئے کار نہیں لایا گیا ہے۔تلفظ کی مشقوں کے لیے بھی صوتی عمل خانوں میں کوئی مواد دستیاب نہیں ہے۔سلائڈ، تصاویر، خاکوں اور نقشوں کا بھی رواج نہیں ہے۔یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ تلفظ اور قواعد کے تعلق سے اردو میں جو مواد ملتا ہے اس میں منظوم مشقیں بھی شامل ہیں۔کردار سازی اور اخلاقی رویوں کو لے کر ادبِ اطفال میں جو تحریریں سامنے آئیں ان میں پہلا بڑا نام نظیر اکبرآبادی کا ہے جنھوں نے صحیح معنوں میں اردو میں ادبِ اطفال کی بنیاد ڈالی اور بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر لکھا۔اس میں بچوں کے تلفظ کو معیاری بنانا بھی شامل ہے۔نظیر اکبرآبادی نے بچوں کے احساسات ومحسوسات کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور ایسی باتوں سے گریز کیا جو ان کی شخصیت میں جذباتی بکھراؤ پیدا کریں۔ وہ خود بھی استاد تھے اور بچوں کی نفسیات اور ان کی دلچسپیوں کو سمجھتے تھے۔بچوں کی فرمائش پر بھی انھوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔مثال کے طور پر برسات کی بہاریں، عید، ہولی، جاڑے کی بہاریں، آدمی نامہ' ان کی مشہور نظمیں ہیں جو اردو کے ادبِ اطفال میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

انجمن پنجاب، لاہور نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا جس میں اردو شاعری کی ایک صنف 'نظم' متعارف ہوئی۔اردو کے مشہور ومعروف شعرا اور ناقدین نے اس مشاعرے میں شرکت کر کے اپنا کلام سنایا۔اس محفل میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور اسمٰعیل میرٹھی بھی تھے جنھوں نے اپنی نظمیں سنائیں جو بہت پسند کی گئیں۔ اسمٰعیل میرٹھی کو اپنی نظموں کی وجہ سے ادبِ اطفال کا شاعر کہا گیا کیونکہ ان کی زیادہ تر نظمیں بچوں کے لیے تھیں۔ ان کے کلام میں اخلاقی اقدار کے علاوہ سماجی ذمے داریوں اور رویوں کو لے کر بچوں کی ذہن سازی کی گئی تھی۔بچوں کی نفسیات اور دلچسپیوں کو لے کر ان کے لیے نصاب بھی تیار کیے۔انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جو وقت کی ضرورت تھے۔ان کی نظم چھوٹی چیونٹی، پن چکی، ہماری گائے، شیر، ماں اور بچہ، کچھوا اور خرگوش اتنی مقبول ہوئیں کہ یہ آج بھی بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی اگر ان کے تحریر کردہ ادبِ اطفال کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں موسم، جانداروں سے محبت، میلے اور تیوہار، کھیل کود، سماج رشتے وغیرہ اہم ہیں۔سر محمد اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں بچوں کے لیے لکھا ہے جسے ہم ادبِ اطفال میں شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ان کی نظم 'ترانہ ہندی' اتنی مقبول ہوئی کہ ایک طرح سے قومی ترانہ بن گئی۔دوسری مشہور نظم 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری' بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی جو آج بھی اسکولوں میں بچوں کے نصاب کا حصہ ہے۔ ایک گائے اور بکری، ایک پہاڑی اور گلہری، ماں کا خواب بھی اپنے زبان وبیان اور اسلوب وآہنگ کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ علامہ اقبال کی بچوں کی نفسیات پر گہری نظر تھی اس لیے ان کی ہر نظم گہرے تاثر چھوڑتی ہے۔عہد طفلی، طفل شیر خوار، بچہ اور شمع نظمیں بھی ایک کارنامہ ہیں۔علامہ اقبال کی نظم ایک آرزو کا مرکزی خیال انگریزی سے ماخوذ ہے لیکن وہ بھی اپنی مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑتی ہے۔

تلوک چند محروم کا نام بھی اردو کے ادبِ اطفال میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ خود بھی بچوں کے استاد تھے اور ان کی نفسیات کو سمجھتے تھے۔انھوں نے بچوں کے لیے کئی خوبصورت نظمیں لکھیں ہیں: جیسے بچوں کا سویرے اٹھنا، اچھے کام، کتاب، بلبل، صفائی، اچھا آدمی، پھول برسات وغیرہ۔اردو کے مشہور شاعر حفیظ جالندھری نے بھی بچوں کے لیے لکھا۔ان کا موضوع بچوں کے اندر خود اعتمادی اور ایثار وقربانی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ نمائندہ نظموں میں خدا سب کو دیکھتا ہے، بول میرے مرغے بول، سورج، بہادر کسان، گرمی کی رت آئی، بیساکھی کا میلا، تاروں کی محفل وغیرہ ادبِ اطفال کا بہترین سرمایہ ہیں۔ شفیع الدین نیر بھی ادبِ اطفال میں ایک بڑا نام ہے۔ انھوں نے مختلف عمر کے بچوں کے لیے نفسیاتی، جذباتی، فکری اور سماجی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے متعدد نظمیں لکھی ہیں۔نظموں کے موضوعات میں ایثار، دوستی، محبت، صفائی ستھرائی کے علاوہ جانوروں، پرندوں اور پھولوں کی رنگ وبو کو لے کر کئی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔انھوں نے نظموں کے علاوہ نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں۔

حامد اللہ افسر، راجہ مہدی علی خاں، اندر جیت لال، لطیف فاروقی، صوفی تبسم، مائل خیرآبادی وغیرہ کے نام بھی اہم ہیں جنھوں نے ادبِ اطفال میں گرانقدر اضافے کیے ہیں۔

ادبِ اطفال کے تعلق سے اگر نثری کاوشوں پر نظر ڈالیں تو کئی ایسے نام سامنے آئیں گے جو اردو فکشن کے بڑے ادیب ہیں لیکن انھوں نے بچوں کے لیے بھی لکھا ہے: جیسے حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر وغیرہ۔ڈاکٹر ذاکر حسین جو بعد میں صدر جمہوریہ ہند بھی ہوئے، انھوں نے بھی بچوں کے لیے کہانیاں لکھی ہیں۔ جہاں تک بچوں کے رسائل کا تعلق ہے، ان میں پھول، کلیاں، غنچہ، بچوں کی دنیا، کھلونا، چاند، ہلال، نور، بچوں کا آجکل، امنگ وغیرہ اہم ہیں۔

حواشی

1. اردو ادب اطفال کے معمار، مصنف: ڈاکٹر خوشحال زیدی، نہرو چلڈرن اکیڈمی، (سنہ اشاعت: جنوری 1993)
2. بچوں کے ادب کی تاریخ، مصنف: ڈاکٹر سید اسرارالحق سبیلی (اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج سدی پیٹ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
3. ادبِ اطفال ایک مطالعہ، مصنف ڈاکٹر بانو سرتاج، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

Helal Ahmad Ganai
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

تجمل حسین راحت

اردو میں بچوں کا سائنسی ادب

اردو زبان اپنی خوبصورتی اور شیرینی کے ساتھ ساتھ سائنسی موضوعات کی پیچیدگیوں اور اس کے مشکل مسائل کو بیان کرنے کی بھی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ سائنس کو جتنا خشک موضوع سمجھا جاتا ہے دراصل وہ اتنا خشک بھی نہیں ہے بلکہ سائنس کو پڑھانے کا طریقہ اس موضوع کو خشک یا پسندیدہ بناتا ہے۔

بچوں کا ذہن اکثر نیچرل سائنس کے سوالوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔ مناظر فطرت بچے جن کا روزمرہ کی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں ان کے بارے میں وہ جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ جیسے بارش کیسے ہوتی ہے، موسم کی تبدیلیوں کی وجہ کیا ہے، رات اور دن کے آنے جانے کا معاملہ کیا ہے، سورج چاند ستارے جو نظر تو آتے ہیں اور پراسرار بھی لگتے ہیں مگر بچے ان کے بارے میں سائنسی نقطۂ نظر سے نہیں جانتے اس لیے یہ سوالات ان کے ذہنوں میں بار بار آتے ہیں۔ اگر ان سوالوں کا لٹریچر اور کہانیوں کی شکل میں سائنٹفک جواب نہیں دیا جاتا ہے تو وہ سائنسی مزاج سے دور توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر ان موضوعات پر بچوں کی نفسیات کا خیال کرتے ہوئے آسان اور سادہ اسلوب میں مضامین اور کتابیں لکھی جائیں تو ان کے بہت سے سوالوں کا جواب بھی مل جائے گا اور ہم سائنسی مزاج رکھنے والی ایک پوری نسل کی ذہنی تربیت بھی کر سکیں گے۔

اردو میں بچوں کے لیے سائنسی ادب تخلیق کرنے والوں میں اندر جیت لال، احرار حسین، سائنس دان محمد خلیل، انصار احمد معروفی، عبدالودود انصاری، انیس الحسن صدیقی، ادریس احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، شمس الاسلام فاروقی اور عادل اسیر دہلوی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اندر جیت لال بچوں کے لیے سائنسی مضامین لکھنے والوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے آزادی کے بعد بے حد دلچسپ اور معلومات افزا سائنسی مضامین لکھے۔ ان کی کتابوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ سائنسی موضوعات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فلسفہ، ہندوستانی سائنسداں اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں جس سے بچوں کے معصوم ذہنوں میں اس ملک کی تاریخ، تہذیب، روایت اور فلسفہ و حکمت کا نقش اول قائم ہو جاتا ہے۔ اندر جیت لال کی کتابیں ہیں تعمیر نو، ہمارے سائنس داں اور ایٹم کی کہانی۔

تعمیر نو دراصل آزادی کے بعد ہندوستان میں ہونے والی سائنسی ترقیوں کو کہانیوں کی شکل میں پیش کرنے کا ایک خوبصورت تجربہ ہے۔ جب ملک آزاد ہوا تھا تو ہر طرف غربت و افلاس اور جہالت تھی۔ ہمارا قدیم نصاب تعلیم فلسفہ و حکمت، پند و نصیحت اور شعر و ادب تک محدود تھا۔

اندر جیت لال تعمیر نو کے دیباچے میں لکھتے ہیں

''آپ نے کئی قصے کہانیاں پڑھی ہوں گی، دلچسپ کہانیاں عجیب و غریب کتھائیں، زندگی سنوارنے والے قصے، سبق آموز کہانیاں، نئے رنگ کی کہانیاں یا پھر ایسی کہانیاں جن سے ہمیں روشنی ملتی ہو۔ تحقیق تجربے کی بات معلوم ہوتی ہو۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا حال معلوم ہوتا ہو اور جن کے پڑھنے سننے سے ہماری معلومات بڑھتی ہو۔ میرے ان مضامین کے پیچھے ہمارے ملک کی سائنس کی کہانی ہے، ہماری صنعت کی کہانی ہے، ٹکنالوجی کی کہانی ہے، زراعت کی کہانی ہے، توانائی کی کہانی بلکہ یوں کہیے کہ ساری قوم کی سائنس کی کہانی ہے۔'' (ص:10)

خوبصورت انداز اور عام فہم زبان میں لکھی گئی قوم کی سائنسی کہانی میں بچوں کے لیے سبق آموزی اور لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ یہ کہانی نئی معلومات کا بیش بہا ذریعہ بھی ہے۔

'ہمارے سائنس داں' ان کی مشہور کتاب ہے جس میں انھوں نے ہندوستانی سائنس دانوں کے حالات زندگی اور ان کے سائنسی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جیسے نوبیل انعام یافتہ سائنس داں سی وی رمن، جگدیش چندر بوس، ہندوستان میں ایٹمی توانائی کے بانی ڈاکٹر جہانگیر بھابھا، گیہوں کی کھیتی میں انقلاب کا محرک ڈاکٹر ایم ایس سوامی ناتھن وغیرہ

اندر جیت لال ذاتی طور پر سائنس دانوں کے قدر دان اور ڈاکٹر سی وی رمن کے عقیدت مند تھے وہ لکھتے ہیں کہ:

دراصل سائنس داں سماجی ہیرو ہیں کیونکہ یہ سائنسی زاویہ نگاہ کو پھیلانے میں مدد کرتے ہیں۔ جدید انکشافات و سائنسی تحقیق سے عوام کو فیضیاب ہونے کے طریقے بتاتے ہیں۔ صنعت دانوں کو ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کا راز بتاتے ہیں۔ حکومت کو قومی سطح پر پلانوں اور منصوبوں کو ترتیب دینے میں مدد دیتے ہیں اور اس طرح سائنس کو ترقی و خوشحالی اور کامیابی کا وسیلہ بناتے ہیں۔ ایسے سماجی سربراہوں میں سری وی رمن کا نام اور کام کاج رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ (ص:8)

وہ اپنی تحریروں میں مسلسل سائنس کی اہمیت اور سائنس دانوں کی قدردانی پر زور دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے بچوں کی شروع سے ہی ایسی تربیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے اردگرد پائی جانے والی چیزوں کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ انھیں لایعنی قصے کہانیوں کے بجائے مشہور ایجادات کے بارے میں بتائیں۔ سائنسدانوں کے حالات زندگی کو کہانیوں کی طرح بچوں کو سنائیں تاکہ ان کی ذہنی نشو و نما میں معروضیت پیدا ہو۔

اس کتاب میں 'ہندوستان میں ایٹمی توانائی کا بانی ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا' کے عنوان سے ایک اہم مضمون ہے جس میں جہانگیر بھابھا کے بچپن کے حالات، ان کی تعلیمی لیاقت اور آزادی کے بعد ان کی سربراہی میں اٹامک انرجی کے ادارے کے قیام کی تفصیل ہے۔

مجموعی طور پر اندر جیت لال کی کتاب 'ہمارے سائنس داں' سادہ اور سلیس انداز میں لکھی گئی بچوں کی سائنسی استعداد کو بڑھانے والی ایک اہم کتاب ہے جس میں ملک کے سائنسی ہیروز کی دلچسپ سرگزشت حیات بھی ہے۔

احرار حسین نے بچوں کی نفسیات اور ان کی دلچسپیوں

کو مدنظر رکھتے ہوئے کئی سائنسی کتابیں لکھی ہیں جیسے سائنسی شعاعیں، عظیم سائنس داں، سائنس کی مایہ ناز ہستیاں اس کے علاوہ انھوں نے طبیعات کیمیا، حیاتیات اور عام فہم سوالات پر مبنی ایک سائنسی کوئز بھی تیار کیا ہے جو طلبا کی سائنسی استعداد کو بڑھانے اور سائنسی ذوق وشوق کو پروان چڑھانے میں معاون ہے۔ ان کی کتاب سائنس کی مایہ ناز ہستیاں 2000 میں ثنا پبلشر دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے مشہور سائنس دانوں کا مختصر تعارف اور ان کی سائنسی ایجاد کا خاکہ پیش کیا ہے۔ کل 52 سائنس دانوں کا اس کتاب میں ذکر ہے، جن میں یونیورسل لا آف گریوٹی کی تھیوری دینے والے آئزک نیوٹن، نظریہ ارتقا پیش کرنے والے چارلس ڈارون، ٹیلی فون جیسی اہم ایجاد کرنے والے الیگزینڈر گراہم بیل اور واٹسن، انیسویں صدی میں چیچک جیسے خطرناک وبائی مرض کی ویکسن تیار کرنے والے ایڈورڈ جیمس، دنیا کو ہوائی جہاز کا نایاب تحفہ دینے والے رائٹ برودرس۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں دنیا کی واحد خاتون کا بھی ذکر ہے جنھوں نے سائنس کی دو الگ الگ شاخوں میں نوبل انعام حاصل کیا۔ ماریہ کیوری پولینڈ کی رہنے والی تھی۔ Physics میں ان کی خدمات کے لیے 1903 میں انھیں نوبل انعام سے نوازا گیا جب کہ 1911 میں ان کی کیمیائی خدمات کے بدلے کیمسٹری کا بھی نوبل انعام دیا گیا۔ ریڈیو ویوز، کمیونیکیشن پر تحقیق کرکے ریڈیو ایجاد کرنے والے اور پوری دنیا کے مواصلاتی نظام میں انقلاب برپا کرنے والے مارکونی کا بھی ذکر ہے جنھیں 1915 میں نوبل انعام برائے طبیعات سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے مشہور سائنس دانوں کا مختصر تعارف، ان کی سائنسی کاوشوں اور اس کے نتیجے میں بدلی ہوئی ایک سائنسی دنیا کا نقشہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

انصار احمد معروفی بچوں کے لیے سائنسی نظمیں لکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب 'یہ کائنات' کے ابتدائیہ میں اس کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ''بچوں کے دل ودماغ کی نشوونما اور ان کے مزاج کی رعایت کرکے کچھ لکھنا آج کے دور کا اہم تقاضا اور بڑی ضرورت ہے۔ آج کے بچے جب اپنی فکروفہم کے مطابق اردو زبان میں نثرونظم میں کوئی تخلیق پاتے ہیں تو شوق سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں بالخصوص نظم کی طرف وہ تیزی سے لپکتے ہیں اور بڑی چاہت سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔'' (ص:8)

بچوں کی اسی چاہت کو دیکھتے ہوئے انھوں نے سائنسی موضوعات کو نظموں کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نظام شمسی زمین کی کشش ثقل، سورج اور گرمی، ماحولیات کا تحفظ، بادل اور بارش، اور پیڑ کے فوائد جیسے بچوں کے دلچسپ موضوعات پر انھوں نے نظمیں کہی ہیں۔

انھوں نے اپنی ایک نظم میں سورج کے گرد زمین کی گردش اور اس کے نتیجے میں ہونے والی موسمی تبدیلیوں کو سائنٹفک طریقے سے بچوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے۔

دیکھیے اب آگیا ماہ مئی
اتنی لو جیسے کہ ہو سورج کئی
دھوپ میں جانے سے جلتا ہے بدن
ہر گھڑی کرتا نہانے کا ہے من
کیوں مئی میں اتنا ہو جاتا ہے گرم
جنوری میں جب کہ یہ ہوتا ہے نرم
میں نے پھر استاد سے پوچھا اسے
گرم سورج کیوں بنے یہ بتلایئے
بولے وہ سورج بدلتا ہی نہیں
رنگ چڑھتا اور اترتا ہی نہیں
گھومتی ہے یہ زمین سورج کے گرد
صبح و شام اس کا یہی رہتا ہے ورد
ایک چکر سال میں سورج کا وہ
کرلیا کرتی ہے چکر پورا وہ
جب وہ آجاتی ہے سورج کے قریب
معاملہ قدرت کا ہوتا ہے عجیب
یہ مئی اپریل میں سورج کے پاس
آکے وہ کرتی ہے سورج کو کراس
تب شروع ہوتی ہے گرمی اور لو
ہوتی ہے ٹھنڈی جگہ کی جستجو

ان اشعار میں بچوں کی نفسیات کا خیال کرتے ہوئے ان کے معصوم ذہنوں میں اٹھنے والے سوالوں کا سائنٹفک جواب دیا گیا ہے۔

سائنس داں محمد خلیل بچوں کے پسندیدہ مصنف ہیں۔ وہ سہ ماہی 'سائنس کی دنیا' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے سائنسی موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں جیسے۔ سائنس اور ہم، نہرو اور سائنس، انوکھے پرندوں کی دنیا وغیرہ اس کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں سائنسی موضوعات پر ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا پسندیدہ موضوع Zoology یعنی حیوانات کی دنیا ہے جسے بچے بھی بے حد پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب 'انوکھے پرندے' میں ہندوستانی پرندوں کے علاوہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں پائے جانے والے پرندے، ان کے اقسام اور ان کے عادت واطوار پر دلچسپ گفتگو کی ہے جیسے نیوزی لینڈ میں پائے جانے والا پرندہ، کیوی اور انٹارکٹیکا میں پایا جانے والا پرندہ پینگوئن وغیرہ۔

پروفیسر اورلیس احمد صدیقی بھی بچوں کے سائنسی ادیب ہیں۔ ان کا اصل میدان تو معاشیات ہے مگر وہ بچوں کی ضرورتوں، ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور کچھ حد تک اپنی ابتدائی محرومیوں کے ازالہ کے لیے سائنسی ادب تخلیق کرتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ اپنی کتاب 'پانی کی موت' میں خود بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

چونکہ میں نے ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی جہاں دور حاضر اور سائنسی مسائل کا گزر نہیں تھا۔ ثانوی تعلیم کے لیے انگریزی اسکول گیا تو ایک نئی دنیا سے روشناس ہونے پر اپنی کم مائیگی اور تعلیمی خامی کا احساس ہوا۔ آج جب میرا بیٹا درجہ چہارم میں ماحولیات کے اسباق پڑھتا ہے تو مجھے اردو مدارس ومکاتب کی پسماندگی کے ساتھ بچپن کی اپنی علمی کم مائیگی کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ ان کہانیوں کے ذریعے مدارس ومکاتب میں پڑھنے والے بچوں کے بجائے اپنی ابتدائی تعلیم کی کم مائیگی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی سائنسی کہانیاں بنیادی طور پر Environmental Science سے متعلق ہوتی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں ماحولیات کے تحفظ پر زور دیتے ہیں شجر کاری اور باغبانی کی تاکید کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں فضائی آلودگی، آبی آلودگی اور فضائی کثافت وغیرہ جیسے موضوعات اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ پانی کی موت، پانی کی آلودگی، عالمی حرارت، کہانیاں پرندوں کی، معدوم شجر کاری، نیوکلیائی کثافت وغیرہ۔

اردو رسائل وجرائد اور اخبارات میں بھی بچوں کے سائنسی ادب پر مسلسل لکھا جارہا ہے۔ گرچہ کچھ ماہانہ رسالے پورے طور پر سائنسی نہیں ہیں مگر کچھ سائنسی مضامین شمارے میں ہوتے ہیں۔ جیسے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' قومی کونسل دہلی، ماہنامہ 'امنگ' اردو اکیڈمی دہلی، ماہنامہ 'قومی زبان'، تلنگانہ اردو اکادمی، کھلونا کی خدمات، گل بوٹے، پھول اور پیام وغیرہ اردو زبان میں سائنسی شعور پیدا کرنے اور سائنسی ذوق وشوق پیدا کرنے میں ماہنامہ 'سائنس' ناقابل فراموش ہے، جو مسلسل 28 سالوں سے ڈاکٹر اسلم پرویز کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ اردو میں سائنسی کوششوں کے علاوہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے میدان میں ہورہی زبردست تبدیلیوں اور ترقیوں سے اردو داں طبقے کو اردو میں متعارف کرانا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

■

Tajammul Husain Rahat
Room No. : 20, Satluj Hostel
JNU, New Delhi - 110067
Mob.: 7905623176

محمود شکیل

میں چاہتا ہوں کہ میری زبان زندہ رہے

خواجہ کوثر حیات

ولی اور سراج کی سرزمین اورنگ آباد (دکن) جس نے ادب کو سکندر علی وجد، صفی، قاضی سلیم، بشر نواز، حمایت علی شاعر، قمر اقبال، نورالحسنین جیسے گوہر نایاب عطا کیے۔ ان میں ایک منفرد اسلوب کے مالک محمود شکیل۔ باشعور افسانہ نگار ہیں جنھوں نے افسانے کو اس کی تمام جزئیات اور محرکات کے ساتھ برتا ہے۔ وہ سنہ 1958 سے افسانہ لکھ رہے ہیں۔اور افسانے کی وجہ سے وہ ساری دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ آپ نے ایک ناولٹ اور 80/ سے زائد افسانے لکھے جو برصغیر کے موقر رسائل اور جرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔

خواجہ کوثر حیات: اپنی پیدائش اور اپنے خاندانی پس منظر سے ہمیں واقف کروایئے؟

محمود شکیل صاحب : پیدائش 1942 کی ہے۔ خاندانی پس منظر تعلیمی میدان رہا ہے والد اور چچا دونوں ہی مدرس تھے۔ والد بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے شاگرد تھے۔ آپ انگریزی اور مرہٹی کے بہت اچھے استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔

خ ک ح: آپ کا تعلیمی پس منظر ہم جاننا چاہیں گے؟

م ش ص: تعلیمی پس منظر، آج کے جدید زمانے کے لحاظ سے کوئی خاص نہیں۔ ساٹھ سال پہلے میٹرک ہوجانا، ایک معراج سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد ڈی ایڈ کیا اور خاندانی روایات کا ایک حصہ بن گیا۔

خ ک ح: آپ کس پیشے سے وابستہ تھے۔اور حالیہ مصروفیت سے متعلق بتایئے؟

م ش ص: شروع میں بطور اسٹینو ٹائپسٹ مشہور زمانہ کمپنی اورنگ آباد سلک ملز سے وابستہ رہا۔ اس کے بعد جیسا کہ اوپر واضح کرچکا ہوں کہ خاندانی روایت کا ایک حصہ بن گیا۔ رہی حالیہ مصروفیت کوئی خاص نہیں، ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی سمٹ جاتی ہے۔ اب زیادہ وقت مطالعے میں گزرتا ہے۔

خ ک ح: آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا اور اس کے محرکات کیا تھے؟

م ش ص: تقریباً 1960 سے ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے افسانہ لکھنے کے محرکات وعوامل میں اورنگ آباد کی ادبی فضا اور گھریلو ماحول شامل تھا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا والد صاحب مولوی عبدالحق کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان کی ذہنی وفکری تشکیل وتربیت میں بابائے اردو کی خصوصی توجہ شامل تھی۔ اس ماحول کے زیر اثر میں نے پہلے بچوں کی کہانیاں لکھی، درجہ ہشتم میں پہلا افسانہ لکھا عنوان تھا 'سرخ اینٹیں' جسے 'مطلع ادب' کی نشست میں سنایا، یہاں اس وقت 'مطلع ادب' کے تحت ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں جس کے منتظم جے پی سعید ہوا کرتے تھے جو خود بھی شاعر تھے۔ ان کے علاوہ ان نشستوں میں قاضی سلیم، بشر نواز، وحید اختر، صفی الدین صدیقی، معین شاکر، پروفیسر ابراہیم رنگلا، انور معظم اور عباس اخگر اسی طرح نئے لکھنے والوں میں رفعت نواز، الیاس فرحت، سریندر کمار مہرا اور دوسرے شریک ہوتے تھے۔ بڑی باقاعدگی سے اپنی تخلیقات پیش کی جاتی تھیں۔ ان تخلیقات پر بحث ہوا کرتی۔ جس سے لکھنے والوں کو بعد میں کافی فائدہ ہوا۔ ابتدا میں میں محض ایک سامع کی حیثیت سے ان نشستوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ان تمام کی موجودگی میں آٹھویں کے طالب علم کا افسانہ لکھنا اور مشہور شعرا اور افسانہ نگاروں کی موجودگی میں ایک ہی نشست میں سنانا بہت بڑی بات تھی اس پر کافی گرما گرم بحث ہوئی۔ بحث میں تمام ہی لوگوں نے حصہ لیا۔ ساتھ ہی تنقید بھی ہوئی اور پذیرائی بھی۔ محترم رفعت نواز اور الیاس فرحت صاحب کے مشورے پر مشہور ادبی رسالہ 'شاعر' کو بھجوایا اور وہ چھپ بھی گیا۔ آٹھویں سے میٹرک تک کے تعلیمی سفر میں شاعر، شاہراہ، پگڈنڈی، تخلیق میں چھپتا گیا۔ ہندوستان کے دیگر رسائل میں تحریک (دلی)، کتاب (لکھنؤ)، خیال (کامٹی)، تناظر (دلی)،، نشانات، شاہکار، شب خون (الہ آباد)، غبار خاطر اس کے علاوہ پاکستان سے اوراق، فنون، ساقی، افکار، داستان، سیپ، ادب لطیف جیسے معروف رسائل میں میری کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔

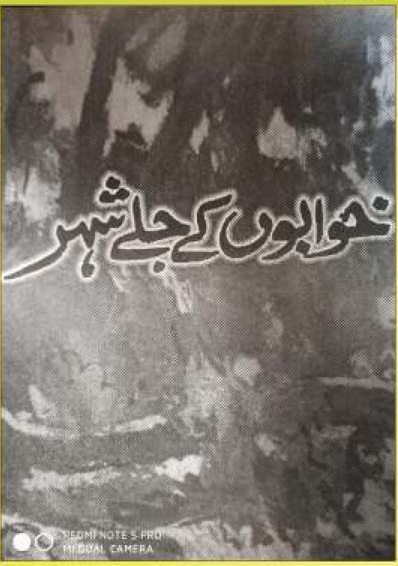

خ ک ح: آپ کی پسندیدہ صنف کون سی ہے؟

م ش ص: جیسا اوپر لکھ چکا ہوں 'افسانہ' پسندیدہ صنف رہی ہے۔

خ ک ح: آپ کس سے اصلاح لیا کرتے تھے اور آپ کا باقاعدہ سلسلۂ تلمذ کس سے رہا ہے؟

م ش ص: مرحوم رفعت نواز، الیاس فرحت صاحب سے اصلاح لی، باقاعدہ سلسلہ بھی ان ہی سے قائم رہا۔ رفعت نواز صاحب کے گزر جانے کے بعد اب الیاس صاحب سے مشورہ لیتا ہوں۔ رفعت نواز اور الیاس فرحت کا خیال تھا کہ اب مجھے انھیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر میرے دل میں ان کا احترام ابھی بھی قائم ہے۔

خ ک ح: جب آپ کی پہلی ادبی تخلیق شائع ہوئی تو آپ نے کیسا محسوس کیا اور آپ کے اقربا کا کیا ردعمل رہا؟

م ش ص: پہلی تخلیق کی اشاعت کے بعد ایک سکون، مسرت اور خود اعتمادی کی کیفیت سے سرشار ہوا۔

خ ک ح: اب تک کی آپ کی مطبوعات؟

م ش ص: اب تک افسانوں کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ویسے تقریباً 80/افسانے لکھے (اس طویل ادبی سفر میں لکھنے والوں کی سیکڑوں تحریریں اور بیسوں کتابیں چھپ جاتی ہیں)۔ افسانے ہندو پاک کے بڑے ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ ایک ناولٹ 'خوابوں کے جلے شہر'، 'اوراق' لاہور کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ ناولٹ رومانی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے مطابق میرے تمام افسانوں میں یہ افسانہ (ناولٹ) بہترین تخلیق ہے۔

خ ک ح: ترقی پسند ادب اور مابعد جدیدیت سے فن افسانہ نگاری میں آج تک کیا تبدیلیاں ہوئیں اور اس سے نقصانات کیا ہوئے اور اس کا فائدہ کیا رہا۔

م ش ص: افسانہ زندگی سے عبارت ہے اور افسانہ زندگی کے معمولات سے تعلق رکھتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات افسانے میں سما جاتی ہے۔ ویسے تو اردو ادب میں افسانہ بنیادی طور پر مغرب سے آیا، اس سے قبل ہمارے پاس افسانہ کئی صورتوں میں موجود تھا۔ قدیم داستان اس کی بہترین مثال ہے۔ اس کے بعد غیر ملکی ادب کے تراجم نے افسانے کو قاری سے متعارف کرایا۔ اور تراجم کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں بھی افسانہ لکھا جانے لگا۔ اردو ادب میں ابتدائی افسانہ نگاروں میں نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے ترجمے بھی کیے اور کئی شاہکار افسانوں کو اردو میں منتقل کیا۔ لیکن اس زمانے میں افسانہ محض تفریح کا ایک ذریعہ سمجھا گیا۔ کچھ لوگوں نے اصلاحی افسانے لکھے جن کے قارئین کا حلقہ تو بہت وسیع تھا لیکن ادبی نقطۂ نظر سے ان افسانوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ اردو کا قاری غیر ملکی افسانے پڑھنے کے بعد ذہنی طور پر ان افسانوں سے اپنے مزاج کو ہم آہنگ نہیں پاتا تھا۔ اس کے بہت بعد پریم چند اور اس قبیل کے دیگر افسانہ نگار جن میں سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی شامل ہیں جنھوں نے ہندوستانی پس منظر میں خصوصاً دیہاتی معاشرے کو بنیاد بنا کر جو افسانے لکھے انھیں قارئین نے پسند کیا اور صحیح معنوں میں یہیں سے اردو میں افسانے کی تاریخ کا آغاز ہوا۔ اس میں ہیئت کے کئی تجربات ہوئے، بعد کی کچھ تحریکوں نے افسانے کو متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک نے افسانہ، ناول اور شاعری میں مقصدیت کو بطور خاص ملحوظ رکھا۔ کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ انھوں نے اس طرح اس کو محدود کر دیا تھا۔ میں ایسا نہیں سمجھتا 'جنگ آزادی کی تحریک' آزادی اور اس کے بعد کے حالات، تقسیم ہند اور فسادات نے ادب کو بھی متاثر کیا۔ یہ ایک طویل بحث ہے (اور ہمیشہ ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی) بھلے آپ اسے گزرے ہوئے وقت کی بات کہہ کر ختم کر دیں۔ جدیدیت کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے (گویہ مختصر وقت کے لیے ہی ہے) اگرچہ کہ تحریک نے افسانے کو بے معنی کر دیا تھا۔ (اس سے وابستہ بہت سی اصطلاحوں کا جنم ہوا جو بعد میں اپنی موت آپ مرگیا ہے) جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بحث چل پڑی۔ افسانے میں کہانی یا کہانی پن کی واپسی کی باتیں ہونے لگیں۔ اس زمانے میں بھی زندگی بھر افسانہ لکھا جاتا رہا۔ معاشرہ تبدیلی سے متعلق ہے، آج ہم جہاں ہیں، سیاسی، معاشی، سماجی اعتبار سے اس کی جھلک آج افسانہ میں موجود نظر آتی ہے۔ جس طرح پانی، ہوا اور آگ اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے، افسانہ بھی اپنا راستہ خود بنالے گا۔

خ ک ح: انگریزی ادب کی افسانہ نگاری میں اور اردو ادب کی افسانہ نگاری میں کیا فرق ہے؟

م ش ص: ماحول کا فرق، زمینی حالات اور معاشرتی فرق، سماجی رشتے، ان کے تقاضے۔

خ ک ح: دنیا کی کس زبان کی افسانہ نگاری سب سے بہتر افسانہ نگاری ہے اور کیوں؟

م ش ص: آج کے دور میں یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ دنیا کی ہر زبان اپنے ملک کے حالات سے متاثر ہے۔ ایک دور تھا جب اسی سوال کا جواب بہت آسان تھا۔ انگریزی، فرانسیسی اور روسی زبان کا افسانہ بہترین ادب سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے لکھنے والوں نے انگریزی سے واقفیت کے سبب اسے زیادہ پڑھا، سمجھا اور متاثر ہو کر لکھا۔ دوسری زبانوں کے تراجم پڑھے، میں نے بھی روسی ادب کے تراجم پڑھے ہیں اور کسی حد تک اپنے سے قریب محسوس کیا ہے۔

خ ک ح: ہندوستان کے جدید افسانہ نگاروں کی تخلیقات سے آپ مطمئن ہیں؟ نہیں تو کیوں؟

م ش ص: نہیں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اردو کے افسانہ نگار بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان مختلف حصوں اور زبانوں میں بٹا ہوا ہے۔ علاقائی زبان کے افسانہ نگار اور ملک بھر کی زبان، ہندی اور اردو میں بڑے معرکے کے افسانے لکھے جارہے ہیں۔ خاص بات اردو افسانہ میں خواتین کی تحریریں، گزرے زمانے کے افسانے کے بہ نسبت آج کی خواتین افسانہ نگار، بہترین کہانیاں لکھ رہی ہیں۔

خ ک ح: آپ کی زندگی کا وہ لمحہ جو آپ بھول نہیں سکتے؟

م ش ص: زندگی سالوں، مہینوں اور دنوں میں سمٹی ہوئی ہوتی ہے، مگر ان میں وہ پل یا وہ لمحہ جو زندگی میں بھول نہیں پاتا، اچھی اچھی چیزیں پالینا یا حاصل کر لیا، زندگی بھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ مگر وہ لمحہ جو آپ کی زندگی میں سب سے زیادہ خوشی لاتا ہے اور جب تک زندہ رہوں گا محسوس کرتا رہوں گا۔ جب دل اور دماغ اور سوچ سے نکلی ہوئی پہلی تحریر اور آخر کی اشاعت جب رسالہ ہاتھ میں آیا اور کہانی کے ساتھ اپنا نام دیکھا وہ لمحہ میں بھول نہیں سکتا۔

خ ک ح: یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ فنکار کو اس کی زندگی میں وہ پذیرائی نہیں ملتی جس کا وہ حق دار ہے۔ اس تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

م ش ص: ادب کی حد تک یہ بات سچ ہے اور خاص طور پر اردو میں یہاں کسی حد تک شخصی تعلقات، نظریاتی اختلافات یہ وجوہات ہیں جو فن کار کو اس کا حق نہیں دیتے۔ یہ بحث بہت طول بھی پکڑ سکتی ہے۔ ایسا فن کار جو مجلسی نہیں ہے، اس کا شکار رہا ہے۔

خ ک ح: آپ کو زندگی میں ملے اعزازات، کامیابیوں و کامرانیوں سے متعلق بتائیں؟

م ش ص: کوئی خاص نہیں۔ کچھ سالوں پہلے اورنگ آباد میں اردو میلہ منایا گیا تھا۔ اس میں مجھے ادبی نہیں بہترین معلم کا اعزاز دیا گیا تھا۔ 'عالمی ادب' رسالے کی طرف سے رفعت نواز، الیاس فرحت اور میرے اعزاز میں ایک نشست رکھی گئی۔ جس میں سینئر افسانہ نگاروں کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ایسی نشستوں کی جو ایک روایت ہے، 'شال اور ڈھال' دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔ اور بس۔

خ ک ح: اردو ادب و زبان کی ترویج کے لیے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

م ش ص: یہاں یہ بات بھی پیدا ہوتی ہے کہ آپ کی بساط کیا ہے۔ میں کوئی زبان و ادب کا جید عالم نہیں ہوں۔ ہر شخص کو اپنی زبان سے محبت ہوتی ہے، مجھے بھی ہے، میں چاہتا ہوں کہ میری زبان زندہ رہے۔ اس کے اخبارات و رسائل خوب ترقی کریں اور ان کی نکاسی بھی ہو، یہ زبان کے زندہ رہنے اور اس کی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ادب زندہ حقیقتوں کے اظہار کا نام ہے۔ خیالی سوچ ادب کا حصہ نہیں۔ وہ زندہ اور پائیدار ادب نہیں ہوگا۔ وہ پانی کے بلبلے کے مانند ہوگا جو ہوا کی ہلکی سی لہر سے فنا ہو جائے گا۔

■

Mr. Khwaja Kauser Hayat
Flat No: 8, Safa Complex
Kala Darwaza
Aurangabad-431001 (MS)
Mob:8421934949

ندیم احمد انصاری

مولانا محمد یعقوب نانوتوی گمنام اور ان کا شعری سرمایہ

مولانا محمد یعقوب نانوتوی گمنام حافظ، عالم، طبیب، دارالعلوم دیوبند کے اول صدر مدرس، شیخ الحدیث اور استاذ الاساتذہ ہونے کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی زبان کے شاعر بھی تھے۔ آپ نے شعر و شاعری کو مستقل مشغلہ نہیں بنایا، لیکن آپ کے دستیاب کلام سے آپ کی مہارت فن اور طبیعت موزوں کا اندازہ ہوتاہے۔ آپ فطری شاعر تھے۔

ہم نے گمنام وہاں پاؤں جمائے اپنے
یا فرشتے کا بھی جس جا پہ پھسلتا دیکھا

مولانا محمد یعقوب نانوتوی گمنام حافظ، عالم، طبیب، دارالعلوم دیوبند کے اول صدر مدرس، شیخ الحدیث اور استاذ الاساتذہ ہونے کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی زبان کے شاعر بھی تھے۔ آپ نے شعروشاعری کو مستقل مشغلہ نہیں بنایا، لیکن آپ کے دستیاب کلام سے آپ کی مہارتِ فن اور طبیعتِ موزوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ فطری شاعر تھے۔ آپ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی رقم طراز ہیں:

آپ کی شاعری خالص اسلامی شاعری ہے، کیونکہ آپ کا جس قدر کلام ہے اس میں حمد ونعت، مدحِ مرشد، شوقِ دیدارِ الٰہی، شوقِ زیارتِ حرمین شریفین یا معرفت کے سوا اور کچھ نہیں۔ غزل میں بھی معرفت کا ہی جلوہ نظر آتا ہے اور بات تو وہی ہے جس کا تذکرہ میں ابھی کر چکا ہوں کہ ان صاحبان کا معاملہ فنِ شعر کے ساتھ ایک زائد دوراز کار کا سا تھا۔ کبھی کوئی محرک سامنے آیا اور بے ساختہ پن میں فنِ شعر کا لحاظ رکھے اور کانٹ چھانٹ کیے بغیر جو کچھ قلم کی زبان پر آتا چلا گیا، لکھ دیا۔ لیکن ان تمام خیالات کے باوجود ان کے کلام سے فنِ شاعری کا پتا چلتا ہے۔ (شعرفقیہ، ص 26,27)

مولانا یعقوب نانوتوی نے شاعری کا فن باقاعدہ کسی استاذ سے حاصل نہیں کیا، لیکن آپ کا کلام سادہ، سلیس، متاثر کن اور فنی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ آپ کے والد ماجد استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی بھی عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب وشاعر بھی تھے، اس طرح آپ کو علمی وادبی ماحول ورثے میں ملا۔

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے مولانا مملوک العلی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''دہلی کالج میں مولانا مملوک العلی کا وہی مرتبہ تھا جو شہر دہلی میں غالب کا تھا۔ دہلی کالج کے پرنسپل کو جب فارسی کے استاد کی تلاش ہوئی تو اس نے یہی کہا کہ فارسی میں ہمیں ایسا آدمی درکار ہے جیسے کہ عربی میں مملوک العلی ہیں۔ چنانچہ غالب کا انتخاب ہوا۔ بعد میں غالب نے معذرت کر لی اور نوکری قبول نہ کی، لیکن اصول تو قائم ہو گیا کہ فارسی میں غالب اور عربی میں مولوی مملوک العلی کا ہم پلہ کوئی نہیں۔ (استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی، ص 35)

درسِ نظامی پڑھنے پڑھانے والے عربی و فارسی ادبیات سے واقف ہوتے ہی ہیں، اس لیے کہ شاعری و بلاغت نصاب کا حصہ ہوتی ہے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے اُردو شعرا کے کلام کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ منشی محمد قاسم کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

درمیانِ اشعار دیوانِ حافظ اور مثنوی وغیرہ اور شعرا میں سے خواجہ میر درد، سودا، ذوق کا دیوان لے کر کچھ اشعار متفرق لے لو۔ (مکتوب یعقوبی، ص 112)

مولانا ایک مذہبی عالم تھے۔ تصوف کا ان پر غلبہ تھا۔ ان کے کلام میں اس تصوف کا رنگ ہے، جس کی بنیاد 'کأنک تراہ' ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات میں ہے: 'بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا یعقوب صاحب مجذوبین کی جماعت کے سردار تھے'۔

(ملفوظات حکیم الامت، 1/209)

مولانا یعقوب نانوتوی کے کلام کو اس طرح فراموش نہیں کیا جانا چاہیے تھا، جس طرح کیا گیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق فرما گئے ہیں:

میں ان صوفیائے کرام کو اردو کا محسن خیال کرتا ہوں۔ یہ بزرگ اس زبان کے بڑے ادیب اور شاعر نہ تھے یا کم سے کم ان کا مقصد اس زبان کی ترقی نہ تھی، نہ اس کا انھیں کچھ خیال تھا۔ ان کی غایت ہدایت تھی، لیکن اس ضمن میں خود بہ خود اس زبان کو فروغ ہوتا گیا اور عہد بہ عہد نئے نئے اضافے اور اصطلاحیں ہوتی گئیں اور ان کی مثال نے دوسروں کی ہمت بڑھائی، جس سے اس کے ادب میں نئی شان پیدا ہوگئی۔ گو یہ اب ایک بھولی بسری داستان ہے، لیکن اردو زبان کا مؤرخ ان کے احسان کو

کبھی نہیں بھول سکتا۔

(اردو ادب کے ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص 76)

جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا یعقوب نانوتوی کا کلام حمد، نعت، مدحِ مرشد، شوقِ دیدارِ الٰہی، شوقِ زیارتِ حرمین شریفین اور قصیدۂ خلیفۃ المسلمین پر مشتمل ہے اور دیگر کلام کے ساتھ آپ کی چند غزلیں بھی دستیاب ہیں، یعنی حمد، نعت، قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، فرد وغیرہ مختلف اصناف میں آپ نے طبع آزمائی کی، گویا آپ کو ہر صنف پر قدرت اور بصیرت حاصل تھی، لیکن آپ کا کلام جس قدردانی کا استحقاق رکھتا تھا، اس سے محروم رہا، آپ کے خوشہ چینوں نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی۔ آپ کا شعر ہے۔

میں جس طرح کہ رہا سب جگہ نا مقبول
الٰہی میری طرح پر نہ ہووے میرا کلام

مولانا یعقوب نانوتوی کی تاریخ ولادت 13 صفر 1249ھ اور تاریخی نام منظور احمد ہے۔ (حالات طیب، ص 32) سن تمیز کو پہنچنے پر بعد حفظِ کلام مجید علوم ظاہری آپ نے اپنے (والد) قبلہ و کعبہ حضرت مولانا مولوی مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ (مدرسِ اعلیٰ مدرسہ عالیہ، دہلی) سے حاصل

کیے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً آپ اجمیر شریف میں تیس روپے کے ملازم ہو کر تشریف لے گئے۔ (آپ نے 1267ھ، 1851 میں اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی) اس وقت آپ بہت کم سن (فقط اٹھارہ سال) کے تھے۔ پرنسپل اجمیر نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ حقیقتاً مولوی تو بہت اچھا ہے، مگر نو عمر و کم سن ہے۔ آپ کی ذکاوت و ذہانت وفہم وفراست کا تجربہ کر لینے کے بعد بلا اطلاع آپ کے پرنسپل نے اجمیر گورنمنٹ میں سفارش کر کے آپ کے لیے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ منظور کرالیا۔ بعد منظوری جب آپ کو اس عہدے پر مامور ہونے کی اطلاع کی تو آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد (اجمیر سے) آپ سو روپے ماہ وار پر بنارس بھیجے گئے، وہاں سے پھر ڈیڑھ سو روپے کی تن خواہ پر ڈپٹی انسپکٹری پر سہارن پور تشریف لائے۔ پھر کچھ عرصے بعد 1857 کا ہنگامہ پیش آیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مکتوبات و بیاض یعقوبی، ص 17) آپ نے جودھ پور میں (بھی) ملازمت کی کوشش کی تھی مگر اس کے نتائج کا علم نہیں۔

(حاشیہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار، ص 317)

آپ نے 1857 کے ہنگامے کے بعد میرٹھ کے 'مطبع مجتبائی' اور 'مطبع ہاشمی' میں خدمات انجام دیں۔ مولانا احمد علی صاحب نے اپنی یادداشت میں مولانا محمد یعقوب کو بخاری شریف کے متن کی تصحیح کی خدمت میں اپنا مددگار لکھا ہے۔

(قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار، ص 78)

جب دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا تو مولانا محمد قاسم نانوتوی کی نظرِ انتخاب آپ پر پڑی۔ اس وقت آپ کی عمر تینتیس چونتیس سال تھی۔ قیامِ دارالعلوم کے دوران آپ کو مختلف مقامات سے زیادہ مشاہروں پر مدعو کیا جاتا رہا، لیکن آپ نے اس قلیل رقم پر قناعت کی اور دینی خدمات میں مشغول رہے۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان ہے:

مولانا جمال الدین مدار المہام شوہر والیۂ ریاست سکندر جہاں بیگم، حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے شاگرد تھے اور چاہتے تھے کہ استاذ زادے مولانا محمد یعقوب صاحب کو تین سو روپے پر ریاست میں بلا کر حق خادمیت ادا کریں، مگر مولانا مرحوم اس وقت اکابرِ ملت (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) کی تجویز سے دارالعلوم دیوبند میں تیس روپے ماہ وار پر مدرسِ اول ہو چکے (تھے) اور اجمیر کی یک صد روپے ماہ وار کی ملازمت اور بریلی کی انسپکٹری مدارس کو خیر باد کہہ کر فقیرانہ، مخلصانہ درس گاہ کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے تھے، اس لیے آپ نے بھوپال جانے سے انکار کر دیا اور مولوی جمال الدین کو لکھا: لا حاجۃ فی نفس یعقوب الا قضاھا۔ یعقوب کی

مولانا یعقوب نانوتوی کا کلام حمد، نعت، مدح مرشد، شوق دیدار الٰہی، شوق زیارت حرمین شریفین اور قصیدۂ خلیفۃ المسلمین پر مشتمل ہے اور دیگر کلام کے ساتھ آپ کی چند غزلیں بھی دستیاب ہیں، یعنی حمد، نعت، قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، فرد وغیرہ مختلف اصناف میں آپ نے طبع آزمائی کی، گویا آپ کو ہر صنف پر قدرت اور بصیرت حاصل تھی، لیکن آپ کا کلام جس قدردانی کا استحقاق رکھتا تھا، اس سے محروم رہا، آپ کے خوشہ چینوں نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی۔

دلی حاجت جو کچھ تھی، وہ پوری ہو چکی کہ بہ قدرِ ضرورت معاش کے ساتھ اہل اللہ کا قرب اور علمیہ دینیہ خدمت نصیب ہوگئی، لہٰذا اب کہیں آنے جانے کا خیال نہیں'۔

(تذکرۃ الخلیل، ص 103)

مولانا دارالعلوم دیوبند میں طویل عرصے تک خدماتِ جلیلہ انجام دیتے رہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ نے آپ سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد انبہٹوی، مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد یٰسین دیوبندی اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مشاہیر دیوبند آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کے مطابق مولانا یعقوب نانوتوی کی ملازمتوں کی ترتیب کی واقعیت میں شبہ ہے، جس کی مولانا محمد یعقوب کی تصحیح کی ہوئی مطبوعہ کتابوں سے تائید ہوتی ہے۔ سنہ 82-1281ھ میں نول کشور میں تصحیح کتب پر مامور تھے اور 'احیاء العلوم' کی درستگی وطباعت میں مولانا مظہر کے معاون تھے اور اس کے فوراً بعد مطبع صدیقی بریلی میں علمی کتابوں کی صحت و ترجمے میں معاون نظر آتے ہیں اور جب مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) قائم ہوا، اس وقت مولانا بریلی میں تھے، اس لیے بہ ظاہر مولانا کی تحریر میں کچھ غلطی ہے۔ ملازمت کے مراحل نول

کشور، میرٹھ، بریلی، دیوبند صحیح معلوم ہوتے ہیں، تاہم مزید معلومات کی ضرورت ہے۔

(استاذ الکل مولانا مملوک علی نانوتوی، ص 317)

3 ربیع الاول 1302 کو آپ نے تقریباً ترپن سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا کی تصنیفات کے متعلق پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی کا کہنا ہے کہ جہاں تک ہماری تحقیق کی رسائی ہے کوئی خاص تصنیف موجود نہیں ہے۔ لے دے کر صرف تین کتابیں ملتی ہیں یعنی (1) سوانح قاسمی- جو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات پر تیس چالیس صفحات کا رسالہ ہے، اور (2) دوسری کو تصنیف تو نہیں کہا جا سکتا، البتہ خطوط کا مجموعہ جو بیاضِ یعقوبی اور مکتوباتِ یعقوبی کے نام سے موسوم ہے، اور (3) تیسری کتاب حاجی امداد اللہ صاحب کی فارسی کتاب 'ضیاء القلوب' کا عربی زبان میں ترجمہ ہے۔ (سیرت یعقوب و مملوک، ص 145)

مولانا کے مکتوبات موضوع و مواد کے لحاظ سے بہت مفید ہیں۔ مکتوب الیہ منشی محمد قاسم نے نیاگری کے مطابق خود مولانا یعقوب نانوتوی انھیں شائع کرنے کا قصد فرما چکے تھے، لیکن ان کی اولین اشاعت آپ کی وفات کے کئی سال بعد ہو سکی۔ ان مکتوبات پر آپ کے بھتیجے حکیم امیر احمد عشرتی نے ایک جامع مقدمہ لکھ کر مولانا رشید احمد سالم انصاری کے مطبع احمدی سے 1327ھ میں شائع کروایا۔ پھر آپ کے لائق شاگرد مولانا اشرف علی تھانوی نے اسے بڑی محنت سے دوبارہ شائع کیا۔ پہلی اشاعت 1337ھ میں ہوئی اور دوسری اشاعت سات سال کی محنت کے بعد مع حواشی 1344ھ میں منظرِ عام پر آئی۔ مولانا تھانوی اشاعتِ دوم کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

ان مکاتیب سابقہ فی الطبع ولاحقہ فی الطبع کے متعلق جمع کے وقت ہی سے خیال تھا کہ بعض بعض مقامات حل طلب کا تحشیہ کیا جاوے۔ مگر اتفاقاتِ مانعہ کے سبب توقف ہوتا رہا۔ بحمد اللہ تعالیٰ اب نصف صفر 1344ھ کو (کہ جمع کے وقت سے پورے سات سال ہوتے ہیں) اس تحشیے کا سلسلہ شروع ہوا، اتمھا اللہ تعالیٰ بالخیر۔ اور نام ان حواشی کا 'حظوظِ خوبی بر خطوطِ یعقوبی' کئی مہینے پہلے سے سوچ لیا تھا۔ (بیاض یعقوبی، ص 30)

مولانا یعقوب نانوتوی کے مکتوبات بھی ان کی شاعری کی طرح ہی تصوف کا دفتر ہیں۔ اس میں راہِ سلوک کے دقائق کو سہل انداز میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہ قول محمد ایوب قادری:

مولانا نہ صرف اردو اور فارسی کے شاعر تھے بلکہ عربی زبان میں بھی بے تکلف لکھتے تھے۔ چنانچہ 'بیاض یعقوبی' میں عربی میں لکھے ہوئے نعتیہ اشعار موجود ہیں۔ ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے روضۂ اقدس پر پڑھے ہیں۔ کل چھے شعر ہیں۔ البتہ قصائد قاسمیہ میں سلطان عبدالحمید خاں خلیفۂ ترکی کی شان میں ایک طویل قصیدہ عربی زبان میں ہے۔ اس کے سوا آپ کا کلام ناپید ہے۔

دراصل وہ (مکتوبات) سلوک و معرفت کا مرقع اور حقائق و تصوف کا دستور العمل ہیں۔ سالک کے لیے وہ ایک مکمل ہدایت نامہ ہیں۔ ان خطوط میں ہمیں اکابر صوفیہ کی تعلیمات کی مکمل تصویر ملتی ہے۔ اسی زمانے میں راقم الحروف کو چشتی سلسلے کے مشہور شیخ مخدوم جہاں گیر اشرف کچھوچھوی (ف 808ھ) کے مکتوباتِ عالیہ کے مطالعے کا اتفاق ہوا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوباتِ یعقوبی، مکتوباتِ اشرفی (فارسی) کا مختصر اردو اڈیشن ہیں۔ مولانا محمد یعقوب کا مقصودِ حیات اتباعِ سنتِ رسول اللہ، طاعتِ خداوندی اور محبتِ باری تعالیٰ تھا اور ان کی زندگی تمام تر اسی سے عبارت ہے۔

(مولانا محمد احسن نانوتوی، ص 167)

بعد میں یہ مکتوبات 'بیاضِ یعقوبی' کے ساتھ 'مکتوبات و بیاضِ یعقوبی' کے نام سے شائع ہوتے رہے۔ 'مکتوبات و بیاضِ یعقوبی' میں بہ شمول مکتوبات کے دو حصوں کے بیاض کے پانچ حصے بھی شامل ہیں: تاریخیات، علمیات: یعنی فوائدِ علمیہ، عشقیات: یعنی تصوف و دقائق، عملیات: یعنی رقی و عزائم، طبیات: یعنی نسخہ جات و ادویات۔ جس سے مولانا کی کمال جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا تھانوی نے اس کے طبی حصے کو احتیاطاً مولانا حکیم محمد مصطفیٰ (میرٹھ) کی نظر سے گزارا ہے اور حکیم صاحب نے کہیں کہیں حاشیے کے طور پر کچھ فوائد بھی لکھے ہیں۔

آخر میں مولانا کے شعری سرمایے کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں:

اردو کلام:

(1) قصیدۂ میمیہ۔ یہ حضرت نبی اکرمؐ کے ساتھ والہانہ محبت اور عشق کا نتیجہ ہے۔ اس قصیدے میں 245 اشعار ہیں۔

(2) ایک اور قصیدۂ نعتیہ ہے، اس میں 22 اشعار ہیں۔

(3) ایک مدحیہ قصیدہ لامیہ ہے، جو اپنے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجرِ مکی کی شان میں لکھا ہے۔ اس قصیدے میں 302 اشعار ہیں۔

(4) ایک غزل عشقِ حقیقی میں ہے، جس کے 68 اشعار ہیں۔

(5) ایک اور غزل توحید پر ہے، جس کے (10) اشعار ہیں۔

(6) ایک اور غزل توحید پر ہے، جس کے 15 اشعار ہیں، اس کے علاوہ اور 4 اشعار توحید میں ہیں۔

(7) ایک شجرۂ بیعت ہے، جس کے 25 اشعار ہیں۔

فارسی کلام:

(1) حج بیت اللہ کے زمانے میں سفرِ مدینہ کے دوران میں نعتیہ اور عشقیہ اشعار 13 ہیں، جو فارسی زبان میں ہیں۔

(2) اسی طرح ایک اور فارسی نعت کے اشعار کی تعداد 9 ہے۔

(3) فارسی میں منظوم شجرۂ قادریہ 50 اشعار پر مشتمل ہے۔

(4) فارسی کے چند قطعات ہیں۔

(5) چند فرد اشعار فارسی میں ہیں۔

(6) دو تین فارسی رباعیاں ہیں۔

نوٹ: پروفیسر شیرکوٹی کے مطابق یہ قطعات، فرد اور رباعیاں بابا طاہر عریاں کی ہیں، ان کے اول میں از بابا رحمہ اللہ لکھا ہے۔

عربی کلام:

مولانا نہ صرف اردو اور فارسی کے شاعر تھے بلکہ عربی زبان میں بھی بے تکلف لکھتے تھے۔ چنانچہ 'بیاض یعقوبی' میں عربی میں لکھے ہوئے نعتیہ اشعار موجود ہیں۔ ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے روضۂ اقدس پر پڑھے ہیں۔ کل چھے شعر ہیں۔ البتہ قصائدِ قاسمیہ میں سلطان عبدالحمید خاں خلیفۂ ترکی کی شان میں ایک طویل قصیدہ عربی زبان میں ہے۔ اس کے سوا آپ کا کلام ناپید ہے۔

کاش کوئی محقق مولانا کے کلام کو تلاش و جستجو کے بعد جدید اصولوں کے مطابق مدون و مرتب کر کے شائع کرے، تاکہ مولانا کی یہ حسرت پوری ہو

یہ حالِ خستۂ گمنام اب ہوا مشہور
کہ اس سے ہو گئی آگاہ اب تمام انام

■

Nadeem Ahmed Ansari
Flat No.: 18, Second Floor
Sai Prasad Nagar, A-Wing
Bori Colony, Achole Road, Nalasopara (E)
Taluka: Vasai- 401209
Mob.: 9022278319

لعل و گہر

یوسف ناظم
جہان طنز و مزاح کا
لاثانی ناظم

قیصر الحق

یوسف ناظم کا اصل نام سید محمد یوسف تھا اور تخلص ناظم۔ ادبی دنیا میں یوسف ناظم کے قلمی نام سے مشہور ہیں۔ آبائی وطن جالنہ جو کہ اب ریاست مہاراشٹرا کا ایک ضلع ہے۔ ان کی ولادت 18 نومبر 1918 کو اسی مقام (جالنہ) پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اورنگ آباد اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد چلے گئے۔ نوکری کے سلسلے میں مہاراشٹر کے لیبر آفیسر تعینات ہوئے اور 1976 میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر آف لیبر وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ ان کی وفات 23 جولائی 2009 کو مہاراشٹر میں ہی ہوئی۔

یوسف ناظم نے مزاح نگاری کی شروعات 1944 میں کی۔ مزاحیہ تحریر کو پڑھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے تقریباً خالی الذہن ہو کر شروع کیجیے اور بے جھجک تحریر کی شاہراہ پر گامزن ہوجائیے۔ یوسف ناظم اپنے مزاح کا خمیر تو زندگی ہی سے اٹھاتے ہیں۔ ان کے لیے خیال یا زندگی کا ہر وہ واقعہ ہدف ہے، جس سے مزاح پیدا ہوسکے۔ مولوی سے لے کر موت تک وہ ہر شے پر مسکراتے ہیں، مگر یہ مسکراہٹ کسی دل آزار طنز میں تبدیل نہیں ہوتی۔ یوسف ناظم کے مزاح کی شائستگی بنیادی طور پر دلآزاری کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ ظرافت میں وہ پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ زندہ اور جاں بخش فضا قائم کرتے ہیں۔ کامل نظم و نسق سے یوسف ناظم زندگی کی تلخ حکایتوں اور حقیقتوں کی طرف ہلکے ہلکے خیال افروز اشارے کرکے قاری کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یوسف ناظم شریفانہ مزاح کے قائل نظر آتے ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

''اگر یہ بات مان لی گئی ہے کہ آدمی حیوان ظریف ہے تو یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ دنیا کی تخلیق ظرافت کی خاطر ہوئی ہے .... علاوہ ازیں اس کتاب کا نام میں نے 'فی الفور' یہ سوچ کر رکھا تھا کہ یہ جلد شائع ہوگی۔ ہمارے یہاں ہر وہ کام جو دو سال کی تاخیر سے انجام پائے 'فوری' ہی سمجھا جاتا ہے۔'' (فی الفور، یوسف ناظم، ص 4-3)

یوسف ناظم وہ طنز و مزاح نگار ہیں جنہوں نے زود نویسی کے باوجود تحریروں میں اپنے معیار کو زیادہ تر برقرار رکھا ہے۔ ان کے یہاں مشاہدے کی تیزی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ بظاہر وہ دنیا سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی تحریروں میں زندگی کی رنگارنگی، تگ و دو، کشمکش، نشیب و فراز اور خوب و خراب کی تمام تر عکاسی ملتی ہے۔ یوسف ناظم لگتا ہے جتنا وقت لکھنے پر صرف کرتے ہیں، اس سے زیادہ وقت کیا لکھیں اور کیسے لکھیں پر صرف کرتے ہیں۔ یہ فقط طنز و مزاح کا کمال نہیں بلکہ موضوعات اور مسائل کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے اور ان کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے کی دلیل بھی ہے۔ یہاں تذکرہ شادی کے دعوت ناموں کا، نامی گرامی پریس کی بیمار مشین کا اور اردو کے رسائل کی تاخیر سے چھپنے پر تیکھا وار نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس:

''کوئی نامی گرامی پریس اسے چھاپنے کے لیے رضامند نہیں ہوتا کیونکہ ان کی مشین اکثر بیمار رہتی ہے۔ بہت اصرار کیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ کارڈ تو ہم چھاپ دیں گے لیکن یہ کام شادی کی تاریخ گزرنے کے بعد ہی پایہ تکمیل کو پہنچ پائے گا۔ چاق و چوبند رکن خاندان پریس کے منیجر کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ بھائی صاحب شادی کا دعوت نامہ ہے اردو کا کوئی رسالہ نہیں ہے کہ جب چاہے چھاپ دیا جائے۔'' (فی الحقیقت، یوسف ناظم، ص 37)

یوسف ناظم کی وطن دوستی، استحصال کے خلاف احتجاج، معاشی بدحالی، کساد بازاری، معاشرتی انتشار، اقتدار کی زوال پذیری، برسر اقتدار طبقے کی بے راہ روی اور سیاستدانوں کی خرمستیوں پر ان کے بے لوث اور مخلصانہ ردعمل نے ان کی تحریروں میں جاذبیت پیدا کردی ہے۔ یوسف ناظم کو اپنے قلم کی نمائش منظور نہیں، وہ ہنسنے ہنسانے کا سامان قاری کو فراہم تو کرتا ہے لیکن اس سے ماورا معاشرتی صلاح و فلاح کا مقصد ان کے مضامین سے مترشح ہوتا ہے۔ عصر حاضر میں انسانی فطرت کے ایک پہلو پر بے حد بلیغ اور دوٹوک طنز ملاحظہ ہو:

''اب ایسی مشینیں بن گئی ہیں جو یہ بتا سکتی ہیں کہ آدمی سچ بول رہا ہے یا جھوٹ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر یہ تجربہ کس امید پر کیا جارہا ہے۔ کیا اب بھی کوئی ایسا بدنصیب ہے جو سچ بولے۔'' (بالکلیات، یوسف ناظم، ص 47)

یوسف ناظم کا مزاح ان کی شوخ طبیعت اور زبان کی شگفتگی و شیرینی کے توازن سے تخلیق پاتا ہے۔ فکر و خیال اور الفاظ و امثال کی ہم آہنگی سے بڑا لطف پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کی تشبیہات میں بلا کی ندرت ہے جس سے حسِ مزاح کو تحریک ملتی ہے۔ ان کی کم و بیش ہر تحریر میں ظرافت و شگفتگی، بذلہ سنجی و برجستگی، سادگی و سلاست، مدھم لہجہ اور فکر انگیز خیالات کے دل نشین جلوے نظر آتے ہیں۔ سبک خرامی یوسف ناظم کی تحریر کا ایک اہم وصف ہے۔ اگر آپ ان کی تحریروں میں دریاؤں کی روانی کو محسوس کرنا چاہیں تو شاید آپ کو مایوسی ہوگی۔ کیونکہ

یوسف ناظم رک رک کر لکھنے کے عادی اور تھم تھم کر بہنے کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آنسو اگر اصلی ہوں تو نمکین ضرور ہوں گے۔ لکھتے ہیں:

'' آدمی کے آنسو ذائقے میں نمکین ہوتے ہیں، شرط یہ ہے کہ آنسو اصلی ہوں..... آنسوؤں کے نمکین ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی جب بھی اپنے منہ کا مزہ بدلنا چاہتا ہے، اپنے آنسو پی لیتا ہے۔ (آدمی کتنا خود مکتفی ہے)

(فی الحال، یوسف ناظم، ص15)

مندرجہ بالا اقتباس کا آخری جملہ قوسین یعنی Brackets میں ہے۔ غور کیجیے کہ اس جملے میں کیسی زبردست چوٹ گئے ہیں۔ اس طرح کے قوسینی جملے یوسف ناظم کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ اپنے تقریباً ہر اہم نثر پارے کے اختتام پر ایک چھوٹا سا جملہ قوسین میں لکھتے ہیں۔ یوسف ناظم کے قوسینی جملوں کے چرچے جہانِ ادب میں ہر سو پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مزاح نگار مسیح انجم نے انھیں 'یوسفِ قوسین' کا خطاب بھی دیا۔ یوسف ناظم کی مزاحیہ خاکہ نویسی میں فن اور شخصیت کا سنگم نظر آتا ہے۔ وہ شخصیت پر لکھتے ہیں تو فن کی پرتیں کھلنے لگتی ہیں اور فن پر لکھتے ہیں تو شخصیت ابھرنے لگتی ہے۔ زمانے کی تلخی اگر زبان کی تلخی میں بدل جائے تو یہ مزاح نہیں مذاق ہے لیکن اگر زمانے کی تلخیوں کو گھول کر اس میں ظرافت کی شیرینی پیدا کی جائے تو یہ مزاح ہے جو فن کار کے باطن سے پھوٹتا ہے۔ یوسف ناظم کی نگارشات میں سطحی تمسخر نہیں بلکہ گہرائی ہے کیونکہ طنز و مزاح ان کے درون سے پھوٹ رہا ہے۔ ان کے فنی کمالات میں عالمانہ شان اور ان کے مختصر جملوں میں شاعرانہ آن بان محسوس ہوتی ہے۔ وہ ظریفانہ واقعات، عملی مذاق اور تمسخر سے مزاح پیدا نہیں کرتے بلکہ فضابندی، ماحول آفرینی، مرقع نگاری اور اسلوب کے ذریعے مزاح کی محفلیں سجاتے ہیں۔ طولِ کلام سے اجتناب کی رعایت، محاوروں کا برجستہ برتاؤ وغیرہ ان کے اہم تخلیقی اوصاف تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے معمولی واقعے یا عام مشاہدے کو بھی تلازمات، تعبیروں اور منفرد تاویلوں کے طفیل لطف انگیز بناتے ہیں۔ ان کے یہاں نہ شکوہ و شکایت ہے نہ نصیحت و فہمائش، ان کی تمام تر جستجو فرد اور اجتماعیت کی قباحتوں کو دیکھنے اور دکھانے کی آرزو سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

یوسف ناظم کے طنز و مزاح کا قوی موضوع معاشرہ ہے۔ اس کے خدوخال کی مختلف شکلوں کو انھوں نے اپنی تحریروں میں خوبصورتی کے ساتھ جگہ دی ہے۔ سماج میں طویل مدت سے رہائش پذیر خاندانوں کی منفرد طرزِ حیات کے متنوع گوشے اور میل جول کی روایتی وابستگی کا احساس یوسف ناظم کے فن پاروں میں نظر آتا ہے۔ وہ کسی بھی شخص کی ذات کو طنز کا نشانہ نہیں بناتا بلکہ خوشگوار انداز میں شخصیت کی آبرو اور وقار کا لحاظ رکھتا ہے۔ طنز کی اعلیٰ قسم وہی ہے جو شخص کے ذاتی معاملات اور نجی جذبات کی نشتر زنی سے پرہیز کر کے اس کے ظاہر و باطن پر یکساں اور فلاحی سوچ رکھتا ہو۔ خیال رہے کہ مزاح مذاق نہ بن جائے اور طنز تشدد کا روپ نہ اختیار کرے۔ یوسف ناظم ان نازک مراحل کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ اس تعلق سے آفاق صدیقی لکھتے ہیں:

''یوسف ناظم کا طنز ان کی خود کی ذات کی الجھنوں اور ذاتی معاملات کی تلخیوں کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کے طنز و مزاح کی اساس ذاتی اغراض و مقاصد پر مبنی ہے، بلکہ اپنی تحریروں میں انھوں نے اپنے عہد کے مختلف النوع معاملات اور گوناگوں ناہمواریوں اور عام زندگی کے بے ڈھنگے پن کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا معاشرہ ان کے طنز و مزاح کا موضوع ہے اور اسی معاشرے سے انھوں نے طنز و مزاح کا مواد حاصل کیا ہے۔''

(مضمون 'طنز و مزاح اور یوسف ناظم'، آفاق حسین صدیقی، ماہنامہ 'شاعر' فروری 1980، ص22)

یوسف ناظم کے فنِ طنز و مزاح کو جو عناصر نکھارتے اور سنوارتے ہیں، ان میں انشا پردازی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کو بات کہنے ہی کا نہیں بلکہ بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی خوب آتا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں موضوعات کا وافر ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں متنوع رنگ جھلکتے ہیں اور لوچ و لچک ایسی کہ جس موضوع پر قلم آرائی کرتے ہیں، وہ اپنے اسلوب سے ہم آہنگ نظر آتا ہے، گویا یہ اسلوب اسی موضوع کا متقاضی ہے۔ زبان و بیان پر قدرت ہو تو طنز و مزاح نگار کے نقش و نگار ابھر آتے ہیں۔ یوسف ناظم نے اپنے مضمون 'انگریز ہندوستان میں۔ تاریخ جدید' میں برطانوی عہد کی تاریخ کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ واقعات میں بنیادی طور پر کسی تبدیلی کے باوجود برطانوی سامراج کے ظلم و ستم، مالی استحصال، چیرہ دستی، درندگی، سفاکیت اور مردم آزاری تمام و کمال اجاگر ہوجاتی ہے۔ ایسے مضامین میں ان کا فن بامِ عروج پر ہوتا ہے۔ وہ کچھ نہیں کرتے، صرف اپنے اسلوب سے کام لیتے ہیں۔ الفاظ کا الٹ پھیر، دھیما اور مدھم لہجہ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کے حوالے سے ملاحظہ ہو، برطانوی سامراج پر لطیف اور بھرپور طنز:

'' کارنوالس پہلا انگریز تھا جس نے ہندوستان جیسے ملک میں مرنا قبول کیا۔ تاہم یہ بات یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جس وقت کارنوالس ہندوستان میں مرا، ہندوستان انگریزوں کے لیے 'دیارِ غیر' نہیں بلکہ ان کا اپنا ہی وطن تھا۔'' (دامنِ یوسف، عنایت علی، ص29)

اسلوب سے طنز و مزاح پیدا کرنا اس فن کی اعلیٰ سطح ہے۔ یوسف ناظم کے یہاں اس کی خوبصورت مثالیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انھوں نے اکثر و بیشتر مراحل پر طنز نگار کی ذمے داری نبھائی ہے۔ وہ اپنے طنز کو مزاح کے شیریں کیپسول میں پیش کرتے ہیں۔ طنز کے بغیر مزاح پھکڑ پن اور سرکس بازی کے مسخروں کی حرکتیں بن جاتا ہے۔ مزاح کے بغیر طنز بھی واعظ خشک کی نصیحتیں، تلخ و ترش اور زہرناکی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یوسف ناظم کے یہاں طنز کا پلڑا بھاری ہونے کے باوجود مزاح کی آمیزش کچھ یوں ہوتی ہے کہ دونوں کو علیحدہ کرنا مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔ عمومی طنز اور تیر بہ ہدف طنز یونہی معرضِ وجود میں نہیں آتا بلکہ اس کے لیے غور و فکر کی عمیق ضرورت ہوتی ہے۔ طنز و مزاح کی فنی پختگی کا راز یہی ہے کہ قلمکار کو منجملہ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے علم و آگہی حاصل ہونی چاہیے، تب جاکر ادب عالیہ کے اہم فن پارے وجود میں آتے ہیں۔

طنز و مزاح نگاری میں یوسف ناظم کا منفرد اسلوب اپنی مثال آپ ہے۔ اردو زبان کی باریکیوں پر انھیں خلاقانہ دسترس حاصل ہے۔ الفاظ اور محاوروں کو نئی معنوی جہات دے کر مزاح اور طنز کے نت نئے پہلو تراشنے میں وہ حقیقی فنکار معلوم ہوتے ہیں۔ یوسف ناظم ادب کے علاوہ ہمعصر عالمی صورت حال، سیاست، معیشت اور کلچر کے باہمی رشتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں پختہ سماجی شعور اور ادبی بصیرت کے گوناگوں رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا مزاح جہاں بادِ نشاط پلاتا ہے وہیں زخم پنہاں کا بھی پتہ دیتا ہے۔ مزاح کی شوخی گفتار میں دانش و بینش کی ایک دنیا آباد ہے۔ انھوں نے اپنی شگفتہ تحریروں سے دکھی دلوں کی مسیحائی کی اور زندگی کے ستائے انسانوں کو زندگی کی ناہمواریوں پر ماتم کرنے کے بجائے زندہ دلی سے مسکرانے کا سلیقہ سکھایا۔ یوسف ناظم اپنے فن کے ذریعے پوری دیانت داری، خلوص اور انہماک کے ساتھ اس کارِ خیر میں مصروف رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے فن کا رشتہ عام انسانوں اور انسانی فطرت کے مشترکہ عناصر سے جوڑے رکھا۔

■

Qaisarul Haq
Research Scholar (SRF)
Dept of Urdu, University of Kashmir, Hazratbal
Srinagar - 190006 (J&K)
Mob.:6005283230

افسانہ نگار ناقد اختر اورینوی

محمد حسنین رضا

اختر اورینوی ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ جنھوں نے ادبی کارناموں کا ایک یادگار ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اختر اورینوی شاعر، افسانہ نگار، ڈراما نگار، ناول نگار، محقق اور ناقد بھی تھے۔ ادب کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں انھوں نے تصنیف و تالیف کی صورت میں خوبصورت موتی نہ بکھیرے ہوں۔ ہر صنف ادب میں انھوں نے قلم کا زور دکھایا ہے۔

اختر اورینوی کا اصل نام سید اختر احمد تھا۔ اختر تخلص کرتے تھے۔ عرف عام میں اختر اورینوی کے نام سے مشہور ہوئے اور ادبی دنیا میں بھی اسی نام سے شہرت ملی۔

اختر اورینوی کے والد کا نام سید وزارت حسین اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی خدیجہ تھا۔ آپ کی پیدائش 19 اگست 1910 کو ضلع گیا میں ہوئی تھی۔ اختر اورینوی کی شادی مشہور و معروف خاتون افسانہ نگار شکیلہ اختر (شکیلہ بانو) سے ہوئی۔ وہ ایک خوش حال اور ذی علم خاندان کے فرد تھے۔ ننھیال اور ددھیال دونوں جہت سے عزت

”اختر اورینوی شاعر، افسانہ نگار، ڈراما نگار، ناول نگار، محقق اورناقد بھی تھے۔ ادب کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں انھوں نے تصنیف و تالیف کی صورت میں خوبصورت موتی نہ بکھیرے ہوں۔ ہر صنف ادب میں انھوں نے قلم کا زور دکھایا ہے۔“

دار اور پروقار۔ وہ خوب صورت تھے اور خوش خلق و خوش پوش بھی۔ نرم مزاجی اور نیک دلی اختر اورینوی کی سرشت تھی اور غم گساری و منکسر المزاجی ان کا شعار تھا۔ وہ تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔ انسانی ہمدردی سے لبریز وہ ہر کسی سے لطف و اخلاق سے پیش آتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے مخالفین سے بھی وہ خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

اختر اورینوی ایک پیدائشی ادیب تھے اور تخلیق کاری ان کی وہبی استعداد تھی۔ انھوں نے لکھا اور خوب لکھا اور ہر میدان میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ وہ شاعر بھی اعلیٰ مقام کے تھے اور افسانہ نگار بھی منفرد تھے۔ ناول نگاری اور ڈراما نگاری میں بھی ان کی شخصیت قابل ستائش تھی اور بحیثیت ناقد و محقق بھی بلند پایہ تھے۔ 'انجمن آرزو' اور 'یک چمن گل' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ جہاں تک ڈراما اور ناول کا تعلق ہے ان کا ناول 'حسرت تعمیر' اور دو ڈرامے 'شہنشاہ حبشہ' اور 'زوال کینٹین' فکری و فنی اعتبار سے کامیاب اور معیاری ہیں۔ 'بہار میں اردو ادب کا ارتقا' ان کا معرکتہ الآرا کارنامہ ہے۔ جس میں انھوں نے لسانیات سے متعلق اپنی مدلل رائے پیش کی اور تحقیق کا حق ادا کیا۔ علاوہ ازیں ان کی کئی تنقیدی تصانیف بھی منظر عام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ جس میں تحقیق و تنقید، نئی تنقید، سراج و منہاج اور بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا کو ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی۔ اختر اورینوی نے اپنے تنقیدی مضامین و تصانیف میں تنقید کے بنیادی مسائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی۔

شاعری اور کہانیوں سے اختر اورینوی کی دلچسپیوں کا سلسلہ دور طفولیت اور آغاز نوجوانی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اختر اورینوی اپنی اس دلچسپی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

”بچپن میں کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا۔ گھر کی بڑی بوڑھیوں کی خوشامدیں کیا کرتا تھا اور خوب کہانیاں سنا کرتا۔ دادی اماں مذہبی قصے سناتی تھیں اور دوسرے لوگ

دنیا بھر کی حکایتیں اور داستانیں سناتے تھے۔ بیمار بہت پڑتا تھا اور کہانیوں سے میری بیماریاں بہلائی جاتی تھیں۔ مجھے میٹھی چیزوں اور کہانیوں کا بڑا شوق رہا۔ آج بھی ناولوں اور داستانوں پر اور حلووں پر جان دیتا ہوں۔''

(بحوالہ: ہندوستانی ادب کے معمار، اختر اورینوی، ساہتیہ اکادمی، 2004، ص 68)

کہانی سننے کا یہ شوق رفتہ رفتہ سنانے کی خلش بن گیا اور وہ ایک عظیم افسانہ نگار بن گئے جنھوں نے صوبۂ بہار کا نام افسانوی ادب میں روشن کیا۔ ان کا شمار بہار کے ممتاز ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اختر اورینوی صوبہ بہار کے وہ لعل ہیں جن کے قلم تخن نے بیسیوں افسانے کو وجود بخشا اور افسانوں کا ایک ذخیرہ تیار کیا۔

اختر اورینوی نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز 1927 میں کیا۔ اختر اورینوی اپنے ایک مقالہ 'میرا نظریۂ فن' میں خود لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یاد ہے کہ میں نے 1927 سے چھوٹے چھوٹے ادب لطیف کے نمونے پیش کرنے شروع کر دیے تھے اور غزلیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ عنفوان شباب کا خاص تعلق ادب لطیف اور غزل سے بھی ہے۔ تخلیق سے ذوق وشوق کی تسکین ہوتی تھی اور بس! ادب ونظریہ کے تصور سے بھی واقف نہ تھا۔ یہ کیفیت 1936 تک رہی اور اس لمبے عرصے میں میں نے رومانی رنگ کی تخلیقات بھی کیں۔ حقیقت پسندانہ بھی اور مقصدی ادب بھی پیش کیا۔'' (اختر اورینوی: فنکار و ناقد، ص 15)

اختر اورینوی کی افسانوی تخلیقات میں 'رتنا' جسے انھوں نے 1927 میں لکھا، ان کی اہلیہ شکیلہ اختر کے مطابق کہیں شائع نہ ہوسکی۔ ان کا پہلا افسانہ جو ادبی پرچہ میں شائع ہوا وہ 'بدگمانی' ہے۔ اس کے بعد تو وہ مسلسل ومتواتر لکھتے رہے۔ ان کے چھ افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: منظر وپس منظر، کلیاں اور کانٹے، انارکلی اور بھول بھلیاں، سمینٹ اور ڈائنامیٹ، کیچلیاں اور بال جبریل، سپنوں کے دیس میں۔ ان کے چھ افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے جن میں تقریباً سو افسانے شامل ہیں۔ 'بدگمانی' سے لے کر 'ایک درخت کا قتل' تک ان کا طویل افسانوی سفر ہے جو 1927 سے 1977 تک پھیلا ہوا ہے۔ جو مکمل آدھی صدی پر مشتمل ہے۔ اس میں اختر اورینوی نے اپنے تجربوں اور مشاہدوں، افسانوی صلاحیتوں اور فنی بصیرتوں کو بروئے کار لاکر افسانوں کی خوبصورت دنیا آباد کی ہے، جس کا کینوس فن، ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے وسیع اور متنوع ہے۔ مظہر امام اپنی بیش قیمت رائے کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اورینوی کے افسانے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے نادیدہ جہانوں کے تلاش وجستجو کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی دنیا اپنے موضوعات کے لحاظ سے بڑی وسیع اور متنوع ہے۔ یہ افسانے کسی مقید فضا میں سانس نہیں لیتے۔ ان کا خمیر زندگی سے اٹھا ہے اور زندگی کہیں دور خلا کے اندھیروں میں پرواز نہیں کرتی۔ وہ انسان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں ہنستی اور مایوسیوں میں آنسو بہاتی ہے۔ اورینوی کے زندگی آمیز اور زندگی آموز افسانوں پر ایک ہمہ جہت اور پروقار شخصیت کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔'' (ایضاً، ص 26)

اختر اورینوی نے مذکورہ بالا مجموعوں کے مختلف افسانوں میں مختلف النوع موضوع، اسلوب اور تحریکات کو سمونے کی عمدہ سعی کی ہے۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں رومانویت کا عنصر نمایاں ہے۔ چنانچہ اس تعلق سے وہ خود ایک جگہ اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے رومانی افسانہ نگار نیاز فتحپوری سے اثر قبول کیا اور علامہ اقبال سے بھی متاثر ہوئے جو ان کی تخلیقات میں دکھائی دیتا ہے۔ گھر کے مذہبی ماحول نے ان کو حالی، اقبال، شبلی اور شرر کا گرویدہ بنا دیا۔ وہیں وہ میر، غالب، نیاز، یلدرم اور اختر شیرانی سے مستفیض ہوئے اور ترقی پسندی کا بھی خاص اثر قبول کیا۔ بقول اختر اورینوی:

''میں نے اہل زندگی میں سب سے پہلے نیاز فتحپوری سے اثر لیا اور ساتھ ہی ساتھ یا اس کے کچھ بعد اقبال سے اثر پزیر ہوا۔ نیاز اور اقبال کے دو متضاد نظریہ ہائے فن ہیں۔ آج میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے کی تشکیل کا باعث ہیں۔ اردو ادب کی روایت میں ترقی پسندی بھی ملتی ہے اور عیش کوشی بھی۔ ان دونوں کا تصادم بھی ملتا ہے اور رجعت پسندی بھی۔ میرے گھر کی مذہبی فضا نے مجھے حالی، اقبال، شبلی اور شرر کا گرویدہ بنا دیا لیکن میرے مزاج کی جذبات پروری اور رومانیت نے مجھے میر، غالب، نیاز فتحپوری، یلدرم اور اختر شیرانی کی طرف بھی مائل کیا۔ درمیانی دور میں اشتراکیت سے بھی بہت متاثر ہوا ہوں۔ اسی بنا پر ترقی پسند مصنفین کی انجمن اور ترقی پسند تحریک سے گہرا اثر قبول کیا۔ اب غور کرتا ہوں تو میں کسی ایک میلان کا کبھی نہیں رہا اور ایک دھارے میں کبھی نہیں بہا۔'' (ایضاً، ص 27)

یہی وجہ ہے کہ اختر اورینوی کے یہاں ایک میلان نہیں ملتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں مختلف النوع

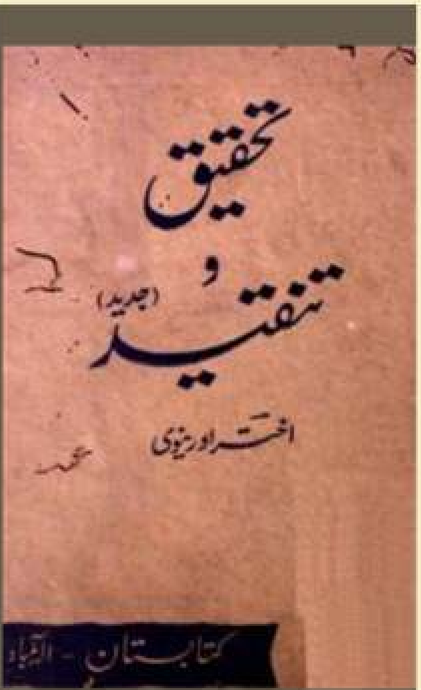

"اختر اورینوی کے افسانے کی نمایاں خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے پریم چند کی طرح بہار کی دیہی زندگی اور وہاں کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اختر صاحب نے خود کو بہار کے دیہاتوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی ہے۔ اختراورینوی کے افسانوں میں سماج کے مظالم اورسرمایہ دارانہ نظام پر طنزو تنقید بھی ہے۔ ان کو سماج کے متوسط طبقے سے ہمدردی ہے۔وہ موضوعات بھی متوسط طبقے سے لیتے ہیں مثلاً جونیئر وکیل، ٹائپسٹ، بوڑھی ماما، سینی توریم کا فقیر، پندرہ منٹ اور 'درخت کا قتل' ان کے شاہکار افسانے ہیں۔"

موضوعات کو پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔ اسی مضمون میں اختر اورینوی اپنے نظریۂ فن کو مزید وضاحت وصراحت کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''میرا نظریہ یہ ہے کہ فن کی ساری قسمیں تجربات زندگی سے خام مواد حاصل کرتی ہیں اور ترتیب فن کی اندرونی شخصیت سے نئی ترتیب تازگی، زندگی، روح سوز وساز، تعمیر ومعنویت حاصل کرتی ہیں اور پھر پیش کش کی منزل میں فنکاری کی ہنرمندی سے ترتیب وتناسب ربط وہم آہنگی، تراش وخراش، وضع وقطع، اسلوب وادا، تنظیم

وتعمیر پاتی ہیں۔ غرض یہ کہ فن، فطرت اور معاشرہ زندگی اور کائنات کی محض ترجمانی کا نام نہیں بلکہ تخلیق جدید کا نام ہے۔'' (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ خلیل الرحمن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 2007، ص 197)

پروفیسر عبدالمغنی نے اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے ابتدائی مرحلے کی نشاندہی کرتے ہوئے اس دور کے حالات وکیفیات پر مفصل روشنی ڈالی ہے:

''جس وقت اختر اورینوی نے افسانہ نگاری شروع کی، پریم چند زندہ تھے اور ان کے پیروؤں کی ایک پوری نسل بروئے کار آچکی تھی۔ سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی ابھر چکے تھے۔ اس کے ساتھ نیاز فتحپوری کا جمالستان اور سجاد حیدر یلدرم کا خیالستان بج چکے تھے۔ مجنوں گورکھپوری کا بیان بھی آچکا تھا۔ حجاب امتیاز علی کا کوہ قاف نمودار ہو رہا تھا، سعادت حسن منٹو نے ابھی لکھنا شروع کیا تھا پھر اختر اورینوی کے لکھنا شروع کرنے کے دو تین برسوں بعد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور چند سال اور بعد عصمت چغتائی بھی میدان میں آگئیں۔'' (نیا افسانہ، ص 175)

اختر اورینوی کے افسانے کی نمایاں خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے پریم چند کی طرح بہار کی دیہی زندگی اور وہاں کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اختر صاحب نے خود کو بہار کے دیہاتوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی ہے۔ اختر اورینوی کے افسانوں میں سماج کے مظالم اور سرمایہ دارانہ نظام پر طنز و تنقید بھی ہے۔ ان کو سماج کے متوسط طبقے سے ہمدردی ہے۔ وہ موضوعات بھی متوسط طبقے سے لیتے ہیں مثلاً جونیئر وکیل، ٹائپسٹ، بوڑھی ماما، سنی ٹوریم کا فقیر، پندرہ منٹ اور 'درخت کا قتل' ان کے شاہکار افسانے ہیں۔

اختر اورینوی کے تمام افسانوں میں اختر اورینوی نے اپنے عہد کی بصیرت کو بڑی احتیاط، سنجیدگی اور انسان دوستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے طبقاتی کشمکش اور متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی اقتصادی الجھنوں اور محرومیوں کو نہایت عمدگی سے بروئے کار لایا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی اختر اورینوی کے افسانوں کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں:

''اختر اورینوی نے بعض پیچیدہ مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ نچلے طبقے کی معاشی مشکلات، انسانی قدروں اور بھوک کا تصادم، قرض اور سود، لڑائی اور جھگڑے اور مقدمہ بازی، خاندانی مناقشات، زمیندار اور کاشتکار، قلی، نانبائی، رکشہ کھینچنے والے اور بھٹی جھونکنے والے سب کا مطالعہ اختر اورینوی نے قریب سے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی متوسط طبقے کی ناکامیاں ونامرادیاں بھی ان کا موضوع رہی ہیں۔'' (ساغرنو: اختر اورینوی نمبر، 1965، ص 412)

افسانوں میں وہی خوبیاں موجود ہیں جو عام طور پر معاشرتی اور سماجی مسائل کے پیچ وخم ہیں۔ وہ ایک بالغ النظر فن کار کی طرح ہندوستان کی پوری زندگی پر چھا گئے۔ ایک طرف بہار کی مخصوص فضا اور حالات میں رہنے والے کسانوں کے مصائب، خشک سالی، بھوک، غربت، سود ہیں تو دوسری جانب شہر کی بے بسی اور بے حسی کے درمیان پھنسا انسانی ہجوم اور مختلف طبقات میں بٹی ہوئی ان کی زندگی۔ ان کے افسانوی مجموعوں منظر وپس منظر، سمینٹ ڈائنا مائٹ، کیچلیاں اور 'بال جبریل' کے افسانوں میں وہی سسکتی زندگیاں ہیں جو سماج اور زمانے کے دوپاٹوں کے درمیان پسے جا رہے ہیں۔

اختر اورینوی نے سماجی بصیرت اور حقیقت کے امتزاج سے ایک ایسا اسلوب ایجاد کیا کہ اس سے زندگی کی ترجمانی میں جان پڑ گئی۔ انھوں نے دیہات کی عوامی زندگی اور ساتھ شہری زندگی کے مسائل کو واقعیت اور حقیقت شعاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقول وقار عظیم:

''شہری زندگی کی بھیڑ بھاڑ میں سے اختر اورینوی نے بہت سی چیزیں چنی ہیں اور انھیں بہت سی چیزوں سے ان کے افسانوں کی تشکیل ہوئی ہے۔ اسی بھیڑ بھاڑ کی دنیا میں نچلے طبقے کے لوگ ہیں جیسے یکہ والے، موٹر ڈرائیور، نانبائی، چھوٹے بڑے مختلف طرح کے مزدور جو شہر میں رہ کر بھی بے سروسامان ہیں اور بے سروسامانی کبھی ان کی قوت بازو اور جذبہ خودداری کا مضحکہ اڑاتی ہوئی انھیں بھیک کے پنجوں میں لا پھنساتی ہے۔'' (جادۂ اعتدال، ص 160)

اختر اورینوی کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے افسانوں میں وہی خوبیاں موجود ہیں جو عام طور پر معاشرتی اور سماجی مسائل کے پیچ وخم ہیں۔ وہ ایک بالغ النظر فن کار کی طرح ہندوستان کی پوری زندگی پر چھا گئے۔ ایک طرف بہار کی مخصوص فضا اور حالات میں رہنے والے کسانوں کے مصائب، خشک سالی، بھوک، غربت، سود ہیں تو دوسری جانب شہر کی بے بسی اور بے حسی کے درمیان پھنسا انسانی ہجوم اور مختلف طبقات میں بٹی ہوئی ان کی زندگی۔ ان کے افسانوی مجموعوں منظر وپس منظر، سمینٹ ڈائنا مائٹ، کیچلیاں اور 'بال جبریل' کے افسانوں میں وہی سسکتی زندگیاں ہیں جو سماج اور زمانے کے دوپاٹوں کے درمیان پسے جا رہے ہیں۔ زمیندار اور سرمایہ دار کے ذریعہ استحصال کا شکار ہو رہے ہیں۔ اکتاہٹ، شادی کے تحفے، کلیاں اور 'کانٹے' جیسے افسانوں سے اختر اورینوی کا شمار اردو ادب کے ان باکمال افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن میں بیدی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور حسن عسکری نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی زندگی، حقیقت کے ساتھ رومان سے قریب نظر آتی ہے جو قاری کے دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ نجمی، شاکرہ اور راشدہ کا کردار بحیثیت نسوانی کردار ان کے افسانوں کے مرکزی کردار ہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جو مسلم اور کرسچن، باعزت مڈل کلاس کے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سادہ لوح، خاموش اور محبت کی مٹی سے گندھے ہوئے ہیں۔ اختر اورینوی کا مطالعہ ومشاہدہ اس تناظر میں بھی کم نہیں۔ ان کرداروں پر اختر اورینوی کی نظر موضوع سے زیادہ قریب ہوتی ہے اور وہ ان کرداروں کی گہری جذباتی ہیجان کو نہایت قریب سے پیش کرنے میں بہت ہی ماہرانہ چابکدستی سے کام لیتے ہیں۔ بحیثیت افسانہ نگار ان کا قد بلند دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کا گہرا مطالعہ اور اس کے معنی خیز پہلوؤں کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ وہ کہانی میں کردار، پلاٹ اور ہیئت کو اس سلیقہ مندی سے پیش کرتے ہیں کہ کہیں بھی تاثر کم نہیں ہوتا۔ زبان میں تاثیر اور کیفیت ہے۔ ان کے افسانے ہمیں گرد وپیش کے متعلق ایک بصیرت عطا کرتے ہیں اور ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جو زندگی کی تصویر کشی میں نفسیات کے مطالعہ سے کام لیتے ہیں۔ انھیں انسانیت کی بنیادی قدروں کا بھی عرفان ہے اور وہ زندگی کے کائناتی نظام سے بھی واقفیت ہے۔

بلاشبہ اختر اورینوی کی ادبی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ ان کے جادو نگار قلم کی جولانیاں مختلف اصناف ادب میں نظر آتی ہیں۔ اختر اورینوی اردو ادب کے اعلیٰ ادیب وشاعر ہیں۔ شاعری ہو کہ افسانہ، ناول ہو کہ ڈراما، تاریخ ہو کہ صحافت اور تحقیق ہو یا تنقید ہر جگہ ان کی جلوہ سامانی موجود ہے اور وہ اتنی آہستگی اور شائستگی کے ساتھ یہ کارنامہ انجام دیتے ہیں کہ ہر سو ان کے فن کا ڈنکا بجنے لگتا ہے۔ اختر اورینوی کی غیر معمولی کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

■

Md Hasnain Raza
D-4, Second Floor, Okhla Vihar,
Jamia Nagar Okhla
New Delhi-110025
Mob.:9891675442

مراٹھی زبان پر اردو کے اثرات

ہاجرہ بانو

داستان چاہے کوئی بھی ہو/ حروف اور الفاظ نہایت آسانی سے صدیوں کی کہانی بیان کرتے چلے جاتے ہیں جن کے نشیب وفراز میں انسان گردش کرتا ہوا زبان کو قوت بخشتا چلا جاتا ہے۔ جب دو زبانوں کے حروف والفاظ ایک دوسرے میں شامل ہوتے ہیں تو اس عمل سے مثبت اور منفی پہلو بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ کسی کو اپنی زبان کے خزانے میں اضافہ نظر آتا ہے تو کسی کو اپنی زبان گم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ حروف بھی اڑتی تتلیوں کی مانند ہیں کبھی اس پھول پر بیٹھے تو کبھی اس ڈال پر بیٹھے۔ شاید اسی موقعے کے لیے کہا گیا کہ۔

حرف رسوا ہوئے صدا بن کر
آبرو رہ گئی اشاروں کی

آج ہم ریاست مہاراشٹر کی مراٹھی زبان پر اردو کے اثرات دیکھیں گے لیکن اس سے پہلے ذرا مہاراشٹر کی ایک جھلک چند سطروں میں دیکھتے ہیں جو کہ مضمون کی نوعیت کے اعتبار سے ضروری ہے۔

طبعی ساخت کے اعتبار سے خوبصورت ریاست مہاراشٹر ساحلی، پہاڑی اور سطح مرتفعائی، تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس کا زیادہ تر زمینی حصہ آتشی چٹان یعنی بسالٹ سے بنا ہوا ہے۔ کھڑکھڑاتی ہوئی بہتی ندیوں میں گوداوری، تاپتی، نربدا، بھیما اور کرشنا کا شمار ہوتا ہے۔ مغربی حصے میں وسیع بحر عرب جلوہ افروز ہے۔ علاقوں کے اعتبار سے گرم اور معتدل آب و ہوا ہر طرف چھائی رہتی ہے۔ جن پر غیر مساوی بارش کی تقسیم جاری رہتی ہے۔ یہاں کاشتکاری ایک اہم پیشہ مانا جاتا ہے۔ دیہاتی وشہری زندگی کی جھلک بیک وقت نظر آتی ہے۔ کچے پکے، ڈھلوان، چھت والے، سیمنٹ کانکریٹ کے گھر انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات کو پوری کرتے ہیں۔ لباس میں دھوتی، صدری، پگڑی، ساڑی اور کرتا زیب تن کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں موتی، منکے، کوڑی سیپیوں اور مختلف دھاتوں کے زیورات استعمال کیے جاتے ہیں اور شہروں میں سونا، چاندی اور نگینوں کا استعمال ہوتا ہے۔ جوار، باجرہ، چاول، ناچنی، ورتی، گیہوں، اڑد، مونگ، ارہر، لہسن، مرچ، پیاز اور سبزی ترکاریوں کا استعمال اپنی غذا میں کرتے ہیں۔ سمندری دولت، معدنی دولت، جنگلاتی دولت، سیاحتی دولت، صنعتی دولت اور فلمی دولت سے مالامال مہاراشٹر پورے بھارت میں اپنی مثال آپ ہے۔

مہاراشٹر بنیادی طور پر کئی آدی واسیوں کے کلچر پر مبنی ریاست ہے، جس میں بنجارا، گونڈ، بھیل، کوکنا، لمان، پاردھی کیکاڑی، دھنگر، کورکو، وارلی، ٹھاکر، مہادیو کولی، کولام، آندھ وغیرہ شامل ہیں۔ اس تناظر میں دیکھیں تو گورماٹی، مالونی، اہیرانی، مراٹھی اور کوکنی یہاں کی اصل زبانیں ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے بعد ہندوستان مختلف علاقائی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ محمود غزنوی کی آمد سے کئی سیاسی وسماجی تبدیلیاں ہوئیں جو تقریباً پونے دو سال تک قائم رہیں۔ اس کے بعد محمد غوری اور قطب الدین ایبک نے اپنی حکومتوں کی بنیاد ڈالی تو ہندوستانی ریاستوں نے پھر نئی کروٹ لی۔ اسی درمیان وسط ایشیا سے چنگیز خان کے خوف سے ایرانی بڑی تعداد میں ہندوستان آئے۔ 1316 میں علاء الدین خلجی نے جب دکن فتح کیا تو ایک نئے دور کی شروعات ہوئی جو اورنگ زیب اور انگریزوں و مراٹھوں تک جاری رہی۔ یہ مختصر ترین تاریخی ادوار کا خاکہ ہند آریائی زبانوں کی تشکیل عمل میں لاتا ہے۔ ان متعدد صدیوں میں تہذیبی اختلاط کی کئی مختلف نوعیتیں رہیں۔ زبان ومکان میں اشتراک کی جڑیں بہت گہرائی سے پیوست ہوئیں، جس کا اثر مہاراشٹر دکن کی سماجی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ یوروپ اور ہندوستان کے تین بڑے خاندانوں کی زبانیں ہند جرمانی، سامی، تورانی میں سے تیسرے خاندان کی تورانی کا سلسلہ دریائے گنگا کے جنوبی حصے کے ذریعے ریاست مہاراشٹر کے شہر ناگپور تک پہنچتا ہے۔ جہاں متمدن کول، گونڈ اور دوسرے تورانی قبائل بسے ہوئے ہیں۔ اس علاقے میں تورانی خاندان کی وہ نو زبانیں بولی جاتی ہیں جو اس لسانی خاندان کے چوتھے ضمنی خاندان کول اور دراوڑی خاندان پر مشتمل ہیں جو مہاراشٹر اور ہندوستان کے مغربی حصے میں ہندی سے اور دکن میں مراٹھی آمیز تیلگو سے قربت رکھتے ہیں۔ ان زبانوں میں سے ایک گونڈ زبان ہے جو ناگپور کے قریب آکر مراٹھی میں ضم ہوجاتی ہے۔ مراٹھی اپنی وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے ہندوستانی زبانوں میں صرف ہندی زبان کے بعد رکھی جاسکتی ہے۔ ناگپور سے شمال کی طرف چل کر اندور جا پہنچتی ہے اور پھر جنوب کی طرف مختلف غیر متعین سمتوں سے ہوکر سورت تک جاکر سمندر سے جاملتی ہے۔ یہیں خاندیش کی پہاڑیوں میں بھیل قبیلے کے لوگ ملتے ہیں جو کول ہی کی ایک بولی بولتے ہیں۔ مراٹھی زبان کا دکنی خط ناگپور سے ہوتا ہوا بیجاپور پہنچ جاتا ہے پھر یہ زبان بلدام او ردھارواڑ سے ہوتی ہوئی کنڑی زبان میں شامل ہوجاتی ہے۔

چودہویں صدی میں ایران سے کئی صوفیائے کرام نے دکن میں اپنی ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تصنیف اور تصوف کے اثرات زبان اور روایتی کلچر میں صاف نظر آتے ہیں۔ محمد بن تغلق کے دور میں امیر نجم الدین حسن دکن تشریف لائے تھے۔ جو اعلیٰ مرتبہ شاعر اور تصوف میں ڈوبی ہوئی مقدس شخصیت کے مالک تھے۔ صحیح معنوں میں ان کی آمد سے فارسی ادب کا آغاز دکن میں ہوا۔ ایرانی خیالات اور روایات، زبان کے ساتھ ساتھ دکن کو بھی اپنی گرفت میں لیتے چلے گئے۔ امیر نجم الدین حسن کو مہاراشٹر کی زمین اتنی پسند آئی کہ وہ دوبارہ ایران نہیں گئے۔ آج بھی ان کا روضۂ مبارک خلدآباد مہاراشٹر میں موجود ہے۔

پندرہویں صدی میں دکن میں زبان کا ایک سنہرا دور رہا ہے جس کا تاج فارسی اور اردو دونوں عظیم زبانوں کے سر رہا ہے۔ دکن میں یہ دور فارسی ادب اور ثقافت کا عروج کا تھا۔ ایرانی تاجر خواجہ محمد گیلانی بہمنی سلطنت میں اپنی دانشوری کے باعث وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ گیلانی کی ہمہ جہت شخصیت میں بہترین مصنف، اعلیٰ پایہ کا شاعر دوررس سائنسداں اور ماہر ریاضیات پوشیدہ تھے۔ اس لیے جب انھوں نے سلطان کی اجازت سے بمقام بیدر ایک انڈو پرشین طرز کا جامعہ قائم کیا تو اس کے علم و فراست کی روشنی دور دور تک پھیل گئی۔ اس وقت سرکاری زبان کا درجہ فارسی کو حاصل تھا اور آج بھی بشمول ممبئی ان علاقوں پر فارسی کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ عہد بندہ نواز سے عہد محمود گیلانی تک اور پھر عہد قلی قطب شاہ اور عہد ولی دکنی ان سب ادوار میں دکنی زبان کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ جس میں فارسی زبان کی روح علاقائی زبانوں کے جسموں کے ساتھ شامل ہے۔ یہ دور فن کا دلدادہ رہا۔ اگر حکمراں فن کی سرپرستی کرے تو فن آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے اور یہی وہ سنہری دور تھا جب ہر طرف فن،

تصوف اور زبان کا بول بالا تھا۔ ان ہی ادوار میں تخلیق شدہ ادب ساری زبانی خوبیوں کا مرقع ہیں۔ رنگینی، سادگی، روانی، نشاطی، معنی آفرینی، تشبیہی اور استعاراتی جواہرات سے مزین ہیں اور اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ یہ سارے جواہرات ایران و عربستان سے آئے اور دکنی زبان کے تاج میں جڑ گئے۔ ان ادوار کے صوفی شعرا کا کلام ہو یا خواجہ بندہ نواز گیسو دراز یا پھر حکمراں قلی قطب شاہ ہوں یا پھر ولی دکنی ان سب کی تصانیف اس بات کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ کرناٹک، تلنگانہ، آندھرا پردیش، کیرالہ اور مہاراشٹر کی مقامی زبانوں کے الفاظ اور لسانی قواعد کے اشتراک سے دکنی زبان نے ایک نیا رنگ پایا لیکن ان کی بنیاد عربی اور فارسی ہی رہی کیونکہ فارسی زبان کو ایک سیکولر ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ تمام مذاہب کے لوگوں نے اسے پوری طاقت و قوت اور ہم آہنگی سے اپنایا۔ بعد میں سیاسی حالات کے پیش نظر مہاراشٹر کو الگ ریاست قرار دیا گیا اور فارسی کی مہک کے ساتھ اردو کے 40% سے زیادہ الفاظ مقامی زبان مراٹھی میں شامل ہو گئے۔ جو آج بھی پوری تابنا کی کے ساتھ مروج ہیں۔ الفاظ کی دنیا تو انسانی دنیا سے مماثلت رکھتی ہے جس میں حسن، محبت، توانائی، رعنائی، ہم آہنگی، نزاکت، استحکام، پائیداری، کمزوری، شرافت اور منافقت بھی پائی جاتی ہے۔ الفاظ تو اشیا، کیفیات اور حالات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ جب انسان روزمرہ کی زندگی میں ان الفاظ کے ربط میں آتا ہے تو یہ ترجمانی ایک خوبصورت معانی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ علمی زبان میں انھیں معانی کی علامتیں کہتے ہیں۔ ان ہی علامتوں کے ذریعے انسان سماج میں ایک دوسرے سے کاروباری اور جذباتی اظہار کرتا ہے۔ الفاظ کی تاریخ ہی علاقے میں اپنے سماجی ماحول کی مطیع رہی ہے۔ الفاظ ایک لامتناہی زندگی کا نام ہے اور جہاں زندگی ہے وہاں موت بھی ہے۔ ماحول میں الفاظ جنم لے کر پھلتے پھولتے ہیں اور پھر اسی طرح حالات اور کیفیات کے تحت نشیب و فراز کا شکار ہو کر اپنی زندگی کی افق پر معدوم بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ الفاظ ہی ہوتے ہیں جو عبارتوں میں جان ڈالتے ہیں اور بسا اوقات عبارت کی جان نکال بھی لیتے ہیں۔ کبھی یہی الفاظ کئی جذبات و خیالات کو تصویری روپ دیتے ہیں، اسی پلڑے میں الفاظ کی گرانی و ارزانی ماپی جاتی ہے، جس کی کسوٹی انسان کے جذبات اور خیالات پر منحصر ہوتی ہے جو آگے چل کر الفاظ کی کئی سمتیں مقرر کرتی ہے، بعض الفاظ جذبات کی آئینہ داری کرتے ہیں ان میں انسان کی دلی کیفیت کا عکس ہوتا ہے، بعض الفاظ مرقع ہوتے ہیں جن میں صرف خارجی کائنات نظر آتی ہے اور بعض الفاظ اپنی گرانی کے سبب بلندی پر قائم رہتے ہیں، ان میں ساز اور رس سمائے رہتے ہیں جب یہ الفاظ عبارت کا روپ لیتے ہیں تو ایک حسین موسیقی پیدا کرتے ہیں۔ مہاراشٹر کی اردو، ہند آمیز مراٹھی بولی اسی کی مثال ہے۔ صوفیوں کے الفاظ میں لاانتہائیت ہوتی ہے جو افق کے پار موجودات کی نشاندہی کرتی ہے، اس لیے یہ سب سے افضل ترین ہوتی ہے۔

علامتی ادب میں الفاظ بعض ذہنی، نفسیاتی، روحانی اور سیاسی کیفیتوں کا نشانہ بھی بن جاتے ہیں۔ یہ حالت الفاظ کے استعمال کرنے والے پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ امید اور توانائی کا پیغام دیتا ہے یا خود اسے کمزور بنا کر رکھتا ہے۔ ہر زبان میں الفاظ کے عروج و زوال کو اس کے لسانی، تاریخی اور سماجی پس منظر میں دیکھنا چاہیے کیونکہ یہاں تکنیکی فارمولہ کام نہیں آسکتا۔

اب ان الفاظ کو دیکھتے ہیں جو مراٹھی زبان میں پوری آب و تاب کے ساتھ ہیں: خدا، نماز، روزہ، داشتہ، ناشتہ، نادیدہ، خانساماں، گلستان، چمنستان، چراغاں، درگاہ، مصیبت، دوستی، دشمنی، اصل، نقل، جان، حقیقت عام بول چال میں، اخباری، زبان میں آسانی سے بولے اور سنے جاتے ہیں۔ پہلے سرکاری زبان فارسی ہونے کی وجہ سے تمام سرکاری دفاتر اور عدلیہ میں فارسی آمیز اردو کی اصطلاحات کا چلن عام تھا۔ مثلاً، سرکاری، سرکار، دفتر، سرکاری دفاتر، دستاویز، دستور، دستوری، دستخط، عدالت، حلف نامہ، وصیت نامہ، قلم (ایکٹ)، حاضر، عمل نامہ، شکایت نامہ، گواہ، چشم دیدہ گواہ، گواہی، پیش، پیشی، پیشکش، پوچی، پوچی خط، منصف، منصف کورٹ، وکیل، وکالت، وکالت نامہ، قید، قیدی، حکم، حکم نامہ، فیصلہ، قانون، دعویدار، تھانے دار، قید خانہ وغیرہ یہ عدلیاتی اصطلاحات مراٹھی زبان میں اب بھی استعمال ہوتی ہیں۔

مہاراشٹر میں ڈراما، تھیٹر اور فلم انڈسٹری کے نقوش کافی قدیم ہیں جس پر آریائی تہذیب اور فارسی آمیز اردو کے اثرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کا اثر علاقائی فلموں میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے۔ مراٹھی فلمیں بھی اردو زبان کے اثر سے خالی نہیں ہیں۔ مغل اور مراٹھا تہذیبوں کا سنگم ان فلموں کو خوبصورت بنا کر اپنی جڑوں تک رسائی کرواتا ہے۔ جرأت مندانہ مراٹھا لہجہ اور مغل تہذیبی پوشاک اور زیورات سے آراستہ ان مراٹھی فلموں کے اردو آمیز مکالمے حاضرین میں نیا جوش پیدا کر دیتے ہیں۔ فن موسیقی میں اردو، فارسی، عربی اور مراٹھی کا سنگم دیکھیے۔ راگ، ندا، ناد، آواز، ساز، ندب، نادی، صدر، نوبت، گان، گائین، گانا، نفیری، باجے، شہنائی، مدنگ، تال، تار، ستار، سارنگی، نقارچی، اونچا، سمل، سملت، عور، آسکت، آورت، عشق، عاشق، شاعر، راغ، دف، رباب، طبلہ، طبل بازی، راغب، رغب، راغی وغیرہ۔

مراٹھی زبان میں رائج پیشے، صنعت کار اور پیشہ وروں کے ضمن میں بھی اردو زبان حاوی نظر آتی ہے۔ جس سے مسلم دور کے سماجی و تجارتی ماحول کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔ مسلم دور میں بالخصوص مغل دور میں تجارت اور فنون و حرفت و صنعت اپنی انتہا پر تھی۔ سودا، کسب، کمانا، بازار، دکان، مزدور، دلال، لین دین یہ عربی فارسی الفاظ مراٹھی زبان روزمرہ کاروباری استعمال میں ہیں۔ عربی فارسی میں مزدور اور بغیر پیسے کی مزدوری کو بیگار کہتے ہیں یہ بھی مراٹھی زبان میں مستعمل ہے۔ ان کے علاوہ طلب، بیباق، جیسے ثقیل الفاظ بھی تجارتی زبان میں کہے جاتے ہیں۔ تجارتی زبان میں ہنڈی اس خط یا پیغام کو کہا جاتا ہے جو لین دین کرنے والے مہاجن کسی کو روپیہ دلانے کے لیے بھیجتے ہیں یا جسے مہاجنی چیک کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ سلسلہ و روایت راجا ٹوڈرمل سے منسلک ہے۔ مدت، انداز، سند، دام، ضروری، کوری، یہ الفاظ اردو زبان اور تہذیب سے متصل ہیں۔ مہاراشٹر میں جواہرات و زیورات کی بات کریں تو یہاں بھی اردو، عربی و فارسی کا اثر نظر آتا ہے۔ خزانہ، خزانہ داری، صراف، صرافہ، سونا، چاندی، نگینہ، کھرا کھوٹا، ماشہ، تولہ، بارہ بانی، سونے کا فرق، کندن، مینا کاری یہ سارے الفاظ اردو فارسی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اناج و سبزی ترکاریوں میں تو اردو کے الفاظ ہی مراٹھی زبان میں چھائے ہوئے ہیں۔ گیہوں، جوار، باجرہ، مکئی، چنا، تل، مسور، ارہر، مونگ، ٹماٹر، بیگن، بھاجی، آلو، بھنڈی، گوبھی، کریلا، مولی، ادرک، لہسن یہ سارے الفاظ اردو کے ہیں۔ لکڑی اور تعمیراتی کام کی اصطلاحات بھی اردو سے منسلک ہیں۔ جیسے تعمیری کام کرنے والے کو مراٹھی زبان میں مستری کہتے ہیں۔ مستر یہ فارسی زبان کا لفظ مزدور کے لیے مخصوص ہے جو تعمیری کام کرتا ہے۔ تعمیرات میں درکار اوزاروں کے نام بھی مراٹھی میں اردو فارسی کے لیے کہے جاتے ہیں۔ جیسے خراد (جو لکڑی کو چکنا کرنے کے لیے ہوتا ہے)، برما، برادہ، دروازہ، چوکھٹ، خط (لائن لگانا)، ریگ مال، ساہل، میز، کرسی، تخت وغیرہ سب مراٹھی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح زمین اور عمارت کی تعمیرات کے سلسلے میں حد، چونا، سردو (جس سے زمین پکی کی جاتی ہے) دیوار جو دیوال کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کنگورہ، برج، گمٹی، (چھوٹا برج) مفیار، مخمل وغیرہ سب مراٹھی زبان میں رائج ہیں۔

■

Dr. Hajra Bano
Aurangabad (MS)
Sector/A 93, CIDCO-N-13
Mob.:9860733049
Email.: hajerabano555@gmail.com

عبدالرشید اعظمی

یادوں کے دریچے سے

(سالک دھامپوری پر تعزیتی نوٹ)

ورق ورق میں پلٹتا رہا کہانی کا
بہت طویل سفر ہے یہ زندگانی کا

پوری دنیا تین سال سے کورونا کا کرب جھیل رہی ہے۔ ہر باحیات شخص کا کوئی نہ کوئی عزیز ضرور اس وبائی بیماری کا شکار ہوا ہے۔ اگر عالمی پیمانے پر اس درد کی داستان قلمبند کی جائے تو لاکھوں صفحات کم پڑ جائیں گے۔ اب تک کورونا کی چار لہریں شمار کی جا چکی ہیں۔ ہر لہر نے کسی کے عزیز کو چھینا ہے، کتنے گھروں کو ویران کیا ہے، کتنے خاندان کو ملول و مغموم کیا ہے۔ میرا دفتر تقریباً سو ارکان پر مشتمل ہے۔ لیکن کورونا کی پہلی لہر کا شکار صرف میں ہوا۔ بس خدا نے اہل و عیال اور اپنوں کی دعاؤں کے صدقے میں زندگی بخش دی۔ لیکن دوسری لہر میں میرے والد محترم یکم ستمبر 2021 کو، کورونا کی زد میں آگئے۔ اس کے بعد جانے والوں کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ 2021 رمضان کے پہلے عشرے میں دلی میں مقیم میرے بہی خواہ، ہمدرد، سرپرست کی حیثیت رکھنے والے میرے سینئر دوست پروفیسر اشتیاق دانش صاحب میری نظروں کے سامنے کورونا کا ہدف بن گئے۔ کتنے اپنوں کو بے سہارا چھوڑ گئے۔ اسی رمضان کے پہلے ہی عشرے میں کورونا نے میرے دوست صحافی فاروق سلیم صاحب کو نہیں بخشا، مذکورہ متاثرین، روز کے ملنے جلنے والے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے، ایک سال نہیں بیتا کہ میں دو بھائیوں سے محروم ہوگیا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ خدا جانے یہ زنجیر کب ٹوٹے گی۔

2022 کے رمضان کا پہلا عشرہ ایک ایسے یار باش شخص کے لیے پیغام اجل لایا جس کی بزم احباب میں اس کی دو نسل قبل اور دو نسل بعد کے دوست شامل تھے جسے دنیا سالک دھام پوری کے نام سے جانتی ہے۔ 11 اپریل کو علم و ادب کا یہ چراغ بجھ گیا اور اپنی بزم احباب کو سوگوار و تاریک چھوڑ گیا۔ اپنی ایک زیر ترتیب تصنیف سے متعلق ناقد عصر حقانی القاسمی سے ملاقات کا پروگرام بنا رہے تھے کہ رمضان کے باعث یہ ملاقات ادھوری اور ختم ہوگئی۔ رمضان سے دس روز قبل حکیم سید احمد خان اور خالص یونانی دواخانے کے مالک اویس صاحب کے ساتھ غریب خانے کو رونق بخشی تھی۔ رمضان سے دو روز قبل ایک چائے خانے میں ملاقات طے ہوئی اور تادیر گفتگو رہی۔ بیحد اصرار پر بھی گھر آنے کو تیار نہیں ہوئے۔ میں نے بہت کہا کہ میری بیگم نے آپ کو قیمے کی گجیا پر آپ کو دعوت دی ہے۔ غالباً انھیں یہ احساس تھا کہ ابھی چند روز پہلے ہی تو حاضر ہوا تھا۔ خیر!

ابوالفضل انکلیو کے دو چوک، ڈی بلاک اور ای بلاک کے احباب کو روزانہ چہرہ دکھانے والا ہر دل عزیز شخص اب دنیا سے پردہ کر گیا۔ بے شمار چہروں کو اپنی قائم کردہ 'بزم احباب' کے ذریعے شناخت دینے والا، سرپرستی کرنے والا، اردو زبان و ادب اور شاعری کی زلفیں سلجھانے والا، بات بات پر واقعہ بیان کرنے والا درمیان میں تلخ و شیریں باتیں کرنے والا، سدا کے لیے خاموش ہوگیا۔ حافظ عبدالقادر کے چائے خانے میں چہچہانے والا پرندہ دام دنیا سے اڑ گیا۔

میرے محترم قارئین! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیوں یاوہ گوئی کیے جا رہا ہوں۔ درجنوں کتابوں کے مصنف کی علمی ادبی شخصیت پر گفتگو کے بجائے میں بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہا ہوں جن کا کوئی ربط نہیں۔ دوستو! سالک دھامپوری کی علمی و ادبی شخصیت پر گفتگو کرنے کے لیے سلجھے ہوئے مقالہ نگار، ادب کے پارکھ کافی ہیں۔ میں نے تو قلم و قرطاس کے ذریعے سالک صاحب سے متعلق اپنے احساسات و جذبات اور درد و کرب ظاہر کیے ہیں۔ جبکہ ان کی متعدد تخلیقات و تصنیفات میں خاکسار کی آرا شامل رہی ہیں۔

دوستو! سالک صاحب کی زندگی مختلف الجہات تھی۔ وہ جماعت اسلامی سے منسلک تھے۔ جماعت کے رکن تھے، معاشرے و سماج کے تمام گوشوں سے وابستہ تھے۔ عوامی بہبود و فلاح میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے زندہ دل انسان تھے۔ زمینی سطح پر لوگوں کے کام آنے والے تھے، راشن سے لے کر دوا تک فراہم کرتے، ضرورت مندوں کا حتی المقدور ساتھ دیتے۔ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھے، عمر کے جس حصے میں جہاں بھی

رہے، جس ماحول جس سماج میں رہے وہاں سے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر بہت کچھ سیکھا حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کے اردگرد مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ اخذ کرنے والی نظر درکار ہے۔ سالک صاحب جہاں بھی رہے وہاں سے انھوں نے موضوعات اٹھائے، مضامین منتخب کیے اور اپنے تخلیقی ذہن سے اپنی تخلیقات کے پلاٹ طے کیے۔

سالک صاحب کے والد کی عروس البلاد بمبئی میں ایک ڈائمنڈ بیکری وڈائمنڈ اسٹور تھا۔ وہ ثانوی درجات میں تھے کہ والد محترم انھیں لے کر بمبئی چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے ہائی اسکول ماہم آر۔سی کرسچین اسکول سے پاس کیا۔ بچپن گزرا، لڑکپن آیا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا۔ حلقے میں وسعت آئی۔ تخلیقی ذہن تھا۔ لکھنے کا شوق تھا۔ اخباروں میں چھپنا شروع ہوئے۔ رسائل تک پہنچے۔ بمبئی کی زندگی میں مکتبہ جامعہ، بمبئی شاخ پر آنا جانا ہوا۔ وہیں کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری اور ندا فاضلی وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ مزید آگے بڑھا تحریروں میں پختگی آئی۔ اس طرح ایک عرصہ گزر گیا۔ حالات اور وقت نے والد کا سارا بزنس تباہ کر دیا۔ پھر واپس دھام پور لوٹے۔

محترم قارئین! سالک صاحب کی زندگی میں چائے اور چائے خانہ ایک استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چائے اور چائے خانے نے بہتوں کو بہت کچھ بنا دیا اور بہتوں کو تباہ بھی کر دیا۔ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ انھیں چائے سے حد درجہ شغف تھا۔ اگر ہر گھنٹے پر چائے مہیا ہو تو کوئی ہرج نہیں لیکن قلیل مقدار میں۔

دوستو! میں چائے کے ذکر پر بھٹک گیا تھا۔ دراصل مجھے یہ بتانا تھا کہ بمبئی سے دھام پور واپسی پر انھوں نے دھام پور میں ایک چائے خانہ کھولا تھا جو بہت زمانے تک رہا۔ بمبئی اور دھام پور میں چائے خانے کے تجربات و مشاہدات نے باقاعدہ ایک تصنیف 'چائے کی دوکان' عطا کی۔ حالانکہ دھام پور کے دوران قیام مستقیمی صاحب کی قیادت میں ان کے گھر پر جماعت اسلامی کے پروگرام ہوا کرتے تھے۔ سالک صاحب لوکل ذمے دار بھی تھے لیکن تخلیقی ادب سے سدا منسلک رہے۔ بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کی یاد تازہ کرنے کے لیے ملنسار تھے اس لیے اکثر اپنے ماضی کے دوستوں کو یاد کر کے ان کے قصے سنایا کرتے۔ وقتاً فوقتاً بمبئی کے احباب سے ملنے جایا کرتے تھے۔ بمبئی کے دوستوں میں ایک دوست آصف پلاسٹک والا بہت مشہور ہے۔ آصف پلاسٹک والا بھی ادب و شعر اور تخلیق سے حد درجہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ سالک صاحب کی کئی کتابوں کا آصف پلاسٹک والا نے بمبئی سالک صاحب کو بلا کر اجرا کیا وہ فلمی دنیا سے بھی جڑے ہیں۔ چائے کا دھندا اور چائے خانے کے ماحول میں طرح طرح کے افراد سے ملاقات کا سلسلہ سالک صاحب کے لیے مضر نہیں بلکہ مفید رہا۔ سماجی سطح پر گفتگو شنید سے بہت سارے عقدے حل ہوتے، بہت سارے نکات ملتے جو تخلیق میں معاون ہوتے نیز کتابوں کی زینت بنتے۔

سالک صاحب کی زندگی مختلف الجہات تھی۔ وہ جماعت اسلامی سے منسلک تھے۔ جماعت کے رکن تھے، معاشرے و سماج کے تمام گوشوں سے وابستہ تھے۔ عوامی بھبود و فلاح میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے زندہ دل انسان تھے۔ زمینی سطح پر لوگوں کے کام آنے والے تھے، راشن سے لے کر دوا تک فراہم کرنے، ضرورت مندوں کا حتی المقدور ساتھ دینے۔ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھے، عمر کے جس حصے میں جہاں بھی رہے، جس ماحول جس سماج میں رہے وہاں سے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر بہت کچھ سیکھا حاصل کیا۔

سالک صاحب کے حلقہ احباب میں حکما و اطبا خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سالک صاحب سے میری پہلی ملاقات اتفاقاً ابوالفضل انکلیو تین نمبر یونانی ریسرچ دواخانے میں ہوئی۔ وہ حکیم سید احمد خان کے او پی ڈی میں تشریف فرما تھے کہ میں پہنچا۔ سید صاحب نے مریضوں کی بھیڑ میں ہی سالک صاحب سے میرا تعارف کرایا کہ ''راشد صاحب ان سے ملیے یہ سالک دھام پوری ہیں'' میں نے ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر ماضی میں چلا گیا کہ میں اپنے بچپن میں سالک دھام پوری کی تحریریں پڑھا کرتا تھا۔ تاہم یقین نہ آیا کہ یہ وہی سالک دھامپوری ہو سکتے ہیں حالانکہ کتابیں لکھنے والوں کو ہم کسی اور دنیا کی مخلوق سمجھتے تھے، ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا تھا کہ ایسے لوگوں سے ہماری کبھی ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ قرطاس و کتاب پر چھپے الفاظ کو ہم دنیا کی دولت بے بہا سمجھتے تھے۔ یہ سوچتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں کہاں سے آتی ہیں۔

سالک صاحب سے وہیں بیٹھے بیٹھے سید صاحب نے میرا تعارف کرایا تو سالک صاحب نے بغیر کچھ سوچے کہا کہ پھر تو اگلے پروگرام میں، ان کو مہمان ذی وقار کی حیثیت سے مدعو کرتے ہیں۔ میرے استفسار پر بتایا کہ ہماری بزم احباب میں ماہانہ شعری نشستیں ہوتی ہیں۔ آپ آئندہ ہونے والی نشست کے لیے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے مدعو ہیں۔ اس کے بعد سے میں ان کی قائم کردہ بزم احباب کا مستقل شریک رہا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے انھوں نے سکریٹری بھی بنایا۔ میں بہت کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن بھٹک جاتا ہوں۔ باتیں بڑی بے ربط ہو جاتی ہیں۔ دراصل میں سالک صاحب کی اطبا سے قربت وصحبت پر صراحت کرنا چاہتا تھا جس کے اثرات سالک صاحب کی ادبی و تخلیقی کاوشوں پر مثبت پڑے۔ نتیجے میں ان کے قلم سے باضابطہ ایک تصنیف 'علاج ومعالجہ' کے نام سے وجود پذیر ہوئی جسے قومی اردو کونسل کی معاونت بھی حاصل رہی۔

سنجیدہ علمی وادبی گفتگو ان کا مزاج تھا۔ تاہم بسا اوقات ظرافت سے معمور گفتگو کرتے ہوئے لطائف سناتے اور بے تحاشا قہقہے لگا کر ہنستے۔ بزلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کے فطری ذوق نے تصنیف 'تکلف برطرف' کو وجود بخشا۔ اس کتاب میں معاشرتی وسماجی شخصیات پر لطائف ہیں۔ جس میں گہرا طنز ہوتا ہے۔ خاص کر قائدین اقوام کے لیے۔

سالک صاحب کو حقانی القاسمی سے بڑی انسیت تھی۔ ملاقات کا سلسلہ کم تھا، لیکن بہت محترم تھا۔ حال ہی میں سالک صاحب نے اپنی آخری تصنیف کا مسودہ میرے بدست حقانی صاحب کو بغرض تسوید مقدمہ تفویض کیا تھا جو اب بھی حقانی صاحب کے پاس موجود ہے۔ غالباً اب اس پر کچھ کام ہوگا۔ ویسے وہ کتاب ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہے جو آخری مرحلے میں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اپنے تجربات کو تخلیق کا جامہ پہنایا۔ ان کی زندگی کا ایک نہایت ہی اہم اور تاریخی موڑ ان کی اسیری کا زمانہ ہے۔ ایمرجنسی کا زمانہ تھا۔ کسی بھی تحریک سے تعلق رکھنے والے متحرک و فعال افراد کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تا کہ معاشرے کی بیداری میں اپنے مثبت کردار ادا کرنے سے محروم کر دیے جائیں۔ سالک صاحب بھی اس جبر کا شکار ہو گئے اور 4 جولائی 1975 کو حبس زنداں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی مدت اسیری قریباً دو سال مختلف جیلوں، ضلع جیل، بجنور، سینٹرل جیل، بریلی نیز سینٹرل جیل، نینی، الہ آباد میں کاٹنی پڑی۔ جیل کے ماحول اور صعوبتوں کو انھوں نے اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے جو بہ شکل شعری مجموعہ (کلام زنداں) کے نام سے محفوظ ہے۔ چند زندانی کلام کو انھوں نے خود ہمیں سنایا۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنے حبسی تجربات بھی بیان کرتے ہوئے مختلف قیدیوں کے احوال سے روبرو کراتے تو کبھی ہنستے اور کبھی آبدیدہ ہو جاتے۔

جیل کے کارندوں کے سلوک و رویے پر اکثر گفتگو کرتے۔ ان کی نرمیوں اور سختیوں کو لطف لے لے کر بیان کرتے۔

سالک صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک ایسا واقعہ سنایا جس کے پیچھے ایک خاص فکر کام کر رہی تھی جس سے وہ ناواقف تھے۔ بقول ان کے ہمارا امتحان ہونے والا تھا۔ ہمارے کلاس کے ایک دوست نے ہم سے کہا کہ تمھارا سینٹر فلاں جگہ ہے۔ میرا ایک سامان ہے۔ لیتے جانا ایک آدمی آکر لے لے گا۔ میں نے ہامی بھرلی۔ اس نے ایک بریف کیس لاکر مجھے دیا اور میں لے کر پرچہ دینے چلا گیا۔ لوکل ٹرین سے اترا تو اسٹیشن کے باہر چیکنگ چل رہی تھی۔ سارے مسافر ایک ایک

کر کے باہر نکلتے اور چیک ہوتے۔ مجھے پیپر کی فکر تھی۔ میں لائن توڑ کر آگے بڑھا اور کہا کہ صاحب میرا امتحان چھوٹ جائے گا۔ میرا بریف کیس پہلے چیک کرلو، اس صاحب نے کہا بھاگو جلدی جاؤ اور مجھے اس نے آگے بڑھا دیا۔ میں کلاس میں چھوٹا دبلا پتلا معصوم سا تھا۔ میرا ساتھی کلاس فیلو لمبا تڑنگا۔ اس نے ارادتاً مجھ سے دوستی کی تھی، تا کہ اس کی معصومیت سے کام لیا جاسکتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکا اس وقت کے نامور بزنس مین کا لڑکا تھا۔

سالک صاحب دراصل ہندی زبان کے لکھنے پڑھنے والے تھے لیکن تخلیقی ذہن ہونے کے سبب وہ شاعری بھی کرتے اور کہانیاں بھی لکھتے۔ جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ اس طرح وہ ایک اچھے مترجم بھی ہوگئے اور سب سے پہلی کتاب انجم بک ڈپو کی 'محمد بن قاسم' کا ترجمہ ہندی میں کیا۔

سالک صاحب کا تصنیفی عمل کئی نوعیت کا ہے۔ ابن صفی کے ناول کا غالباً پورا سیٹ ترجمہ کیا ہے جو ہندی میں چھپا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار کتابوں کا اردو ہندی نیز ہندی اردو ترجمہ کیا لیکن سب کتابیں ترجمہ کروانے والو ں کی ملکیت ہیں انھیں صرف معاوضہ ملا۔ نام و اکرام نہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی علمی و مذہبی کتابیں ہیں۔ ناول افسانے اور شعری مجموعے ہیں۔ اخبارات سے مستقل منسلک رہے۔ مراسلے خاص کر ان اخباروں کی زینت بنتے رہے۔

سالک صاحب کی صحافتی خدمات کی ایک طویل فہرست ہے۔ آٹھ سال تک جماعت اسلامی ہند کے ہندی اخبار 'کانتی' میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر کے کام کیا۔ آٹھ سال ہفتہ وار 'بھور میل' میں مدیر کی ذمے داری ادا کی۔ 1984 میں اپنا اخبار 'جائزہ' نکالا جو قانونی گرفت میں آیا اور بند ہوگیا۔ تین سال تک اردو ماہنامہ 'دعوت و عزیمت' کی ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔ نسیم حجازی کے دس معروف تاریخی ناول، مولانا اشرف علی تھانوی کا 'ترجمۂ قرآن' نیز مولانا ابوالکلام آزاد کے 'ترجمان القرآن' کی ہندی میں تلخیص کی جو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صاحب کے رسالہ ماہنامہ 'جرائم' میں تقریباً تین سال سے مزاحیہ مضامین لکھتے رہے تا آنکہ وہ رسالہ بند ہوگیا۔

برسبیل تذکرہ یاد آیا کہ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صاحب ماہنامہ 'جرائم' کے مالک و مدیر اب بینائی سے محروم ہو چکے ہیں۔ سالک صاحب جیسے مخلصین کی وجہ سے یہ رسالہ کسمپرسی کے عالم میں بھی نکلتا رہا۔ بدرجہ مجبوری بند کرنا پڑا۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صاحب سالک صاحب کی بزم احباب کے مستقل شریک تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں، ترنم سے اپنی غزلیں سناتے ہیں۔ بینائی کھوجانے کے باوجود بزم احباب کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ یہ سبب مجبوری ایک آدمی جاتا اور ان کو اپنے ساتھ بزم میں لاتا اور اختتام پر انھیں ان کی رہائش پر پہنچا دیتا۔

سالک صاحب کے گزر جانے سے بعد ان کی دنیا بھی محدود ہوگئی۔ ورنہ بزم احباب کی بہت سی نشستیں ان کی رہائش پر منعقد ہوتی اور حاضرین کی ضیافت کا معقول نظم ہوتا تھا۔ بزم احباب کی بہت سی نشستیں سید اظہار الحسن صاحب کی رہائش پر اور احسن فیروزآبادی کے مکان پر منعقد ہوتی تھیں۔

سالک صاحب کے بڑے صاحب زادے جاوید اختر کا کام گرافک اینڈ ڈیزائن کا ہے۔ تاہم وہ پھر بھی پرعزم ہیں کہ ابا کی سرگرمیوں کو بزم احباب کی شکل میں جاری رکھا جائے گا۔ ابھی ہم ان کے بکھرے ہوئے کاموں کو سمیٹنے میں لگے ہیں۔ انھیں حسن ترتیب دینے کے بعد ان شاء اللہ بزم کی طرف توجہ دیں گے اور اس سلسلے کو جاری کریں گے۔

سارے اخباروں کے مدیران ذاتی طور پر ان سے واقف تھے۔ ان کی تحریریں شوق سے چھاپتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سانحہ ارتحال پر تمام اخباروں نے ان کی تصویر کے ساتھ بڑے رنج و غم سے خبریں قارئین تک پہنچائیں۔ خود قومی اردو کونسل نے اپنے رسالے 'اردو دنیا' میں ان کی یہ خبر وجیہ تصویر کے ساتھ خبرنامہ میں شامل کی۔

میری گفتگو غالباً طوالت اختیار کرتی جارہی ہے اور میں باتوں کو ربط بھی نہیں دے پا رہا ہوں، تاہم ان کی قائم کردہ 'بزم احباب' کے تعلق سے کچھ وضاحت کردوں، سالک صاحب کی زندگی میں بزم احباب کی غالباً 53 یا 54 نشست ہوچکی تھی۔ آئندہ نشست رمضان کے بعد ہونے والی تھی جو نہ ہوسکی۔ اب مستقبل میں بزم احباب کا کیا ہوگا، آیا قائم رہے گی یا خود بہ خود تحلیل ہوجائے گی۔ کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ ان کے ساتھ محفلوں میں شریک ہونے والے احباب کا عزم و حوصلہ ہے کہ اسے زندہ رکھیں، اسے آگے بڑھائیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کچھ دوستوں نے مجھ سے باقاعدہ اظہار کیا کہ آپ اسے آگے بڑھائیے ہم مکمل تعاون کریں گے۔ جن میں پیش پیش بزم احباب کا سب سے کم عمر رکن الفوز زیادہ پرعزم ہے ساتھ میں معاذ ہیں۔ ان کے علاوہ سینئر شرکا میں نسیم مجیدی فلاحی، چودھری شہاب الدین، سید اظہار الحسن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میں جب سے بزم احباب کا شریک رہا، میں نے دیکھا کہ عالمی شاعر حامد علی اختر یا معروف شاعر احسن فیروزآبادی نیز دلشاد اصلاحی بحیثیت شاعر و ناظم میڈیا پرسن اشرف بستوی، گلوکار و اداکار نظام شریک تھے اور اپنے کلام سناتے تھے۔ سالک صاحب کا وجود ایک مرکز و محور کی حیثیت رکھتا تھا۔

سالک صاحب کی کتاب زندگی کا آغاز 10 اپریل 1948 کو ہوا۔ اس وقت عربی کا کون سا مہینہ تھا علم نہیں لیکن جب ان کی کتاب زندگی بند ہوئی تو عربی کا ماہ رمضان تھا اور اتفاق دیکھیے کہ انگریزی تاریخ 11 اپریل 2022 ہے۔ اللہ نے رمضان کے پہلے عشرے میں ایک فعال و متحرک شاعر و ادیب، کہانی کار اور صحافی کو اپنے پاس بلا لیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

■

Dr. Abdur Rasheed Azmi
Gulmarg Apts, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

محمد مرغوب عالم

طارق جمیلی
کثیر الجہات فنکار

سیمانچل کے مشہور و معروف ادیب، دانشور، شاعر، افسانہ نگار، انشا پرداز، ڈرامہ نگار اور مضمون نگار طارق جمیلی کا اصل نام ابو اجمل محمد طارق اور والد محترم کا اسم گرامی محمد جمیل تھا۔ یکم اکتوبر 1933 کو ضلع مظفر پور کے گاؤں مہر تھا میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے اور بی ایل کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فکر معاش کی تلاش میں پورنیہ آئے اور 1959 و پورنیہ کالج پورنیہ میں بحیثیت لکچرر بحال ہوئے۔ پورنیہ کی آب و ہوا اس طرح راس آئی کہ ہمیشہ پورنیہ کے ہی ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے 34 سال تک مخلصانہ ادب کی خدمت کی۔ اس دور میں انھوں نے خود کو محض درس و تدریس تک محدود نہیں رکھا بلکہ اردو زبان کی جڑوں کی آبیاری کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ ان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ بیک وقت تدریسی، سماجی، انتظامی، لسانی مصروفیات کے ساتھ تخلیقیت کے امام نظر آتے ہیں وہ شاعر بھی تھے، ڈرامہ نگار بھی، انشا پرداز بھی اور افسانہ نگار بھی ان کی طبیعت نہایت حساس واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ فنی پختگی کی اولین شرط شاعر کا حساس ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں گرد و پیش کے مناظر، داخلی، خارجی زندگی کے واقعات، قومی مسائل، بین الاقوامی مناظر، رشتوں کی نزاکتیں، معاشرے کے تجربات، انفرادیت کی تلخیاں ذات پات کی ناہمواریاں اور اجتماعیت کے پیچ و تاب جلوہ افروز ہیں۔ پروفیسر نجم الہدیٰ لکھتے ہیں:

''طارق جمیلی ڈرامہ نگار بھی ہیں شاعر بھی اور انشا پرداز بھی ہر پیرایے اور ہر اسلوب میں ان کی تخلیقیت مسلم ہے۔ وہ کبھی موضوع کی تلاش میں نہیں رہتے بلکہ موضوع خود ان کے آگے دست بستہ خادم کی طرح حاضر ہو جاتے ہیں۔'' (بحوالہ جذب دروں، ص 11)

طارق جمیلی کی ادبی حیثیت پر خامہ فرسائی کرنے سے پہلے ان کے اصناف سخن پر مختصراً روشنی ڈالنا چاہوں گا تاکہ ان کی عالمانہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو سکے۔ طارق جمیلی نے تخلیقی سفر کا آغاز ڈرامہ نگاری سے کیا ان کا پہلا ڈرامہ 'آگ اور پانی' ہے۔ جس کی اشاعت 1967 میں ہوئی یہ ڈرامہ متعدد بار اسٹیج پر دکھایا گیا اور خوب شہرت پائی۔ اس کی ہمہ گیریت اور فنی پختگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے استاد محترم پروفیسر اختر قادری 'آگ اور پانی' کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''ان کی فطرت نیکی اور اچھائی کی تمنائی ہے۔ تمثیل نگار ماحول کی مایوس کن فضا کے باوجود انسانی فطرت پر یقین رکھتا ہے اور اپنے اس یقین کو کہ اشرف المخلوقات با لآخر پست فکری اور کم نظری سطح سے اونچا اٹھ کر رہے گا۔ فنکارانہ طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ وقت کے تقاضوں نے اسے اپنی وطن دوستی کے جذبات کی تسکین پر بھی ابھارا ہے۔ اس طرح یہ تمثیلچہ وطن پرواز عزائم کا بھی آئینہ ہے۔''

(ڈاکٹر اختر قادری: پیش لفظ آگ اور پانی، ص 3)

دوسرا ڈرامہ 'شکست کی آواز' کے روپ میں سامنے آیا۔ جو سوانحی ڈرامہ ہے اور کافی مقبول ہے۔ اس کی مقبولیت کا اعتراف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈرامہ 'شکست کی آواز' بی این منڈل اور للت نرائن متھلا یونیورسٹی کے بی اے کورس کے نصاب میں شامل ہے۔

اس طرح طارق جمیل کی فنی و فکری صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں انھیں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ 'آزاد شرارے' انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ 'قلم جاگ رہا ہے' افسانوی مجموعہ ہے جس میں بحیثیت افسانہ نگار اہل نقد نے ان کا لوہا مانا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر منظر اعجاز رقم کرتے ہیں:

''طارق جمیلی کے افسانوں کی سب سے نمایاں خوبی ان کا اختصار ہے واقعات و واردات، تہذیب و معاشرت، سیاست، معیشت کی عمومی صورت حال افسانے کے فن میں جملہ سازی اور فقرہ طرازی کی اہمیت بھی کئی لحاظ سے تسلیم کی جا سکتی ہے۔ بدرجہ اتم ان کے افسانوں میں چابک دستی اور سلیقہ شعاری دکھائی دیتی ہے۔''

(بحوالہ طارق جمیلی ایک کثیر الجہات نگار)

طارق جمیلی نے اپنی شاعری کا آغاز اس عہد میں کیا جب ترقی پسند تحریک اپنی آخری سانس لے رہی تھی اور جدیدیت کا بول بالا تھا۔ مگر طارق جمیلی کسی بھی تحریک سے وابستہ نہیں رہے اور نہ ہی کسی بڑے شاعر کی تقلید کرنا پسند کیا۔ شاعری میں ایک الگ راہ اختیار کر کے اردو شاعری میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے طارق جمیلی کم سخن مگر سنجیدہ قسم کے انسان تھے۔ طارق جمیلی کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ نظم کے بڑے شاعر تھے یا غزل کے۔

طارق جمیلی کی شاعری کسی صنف میں مقید نہیں ہے۔ بلکہ طویل نظم، غزل، مثنوی، قطعہ، گیت اور ثلاثی، حمد و نعت وغیرہ سے ان کی فنکارانہ پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزلوں کی رعنائی اور زیبائی کہنہ مشق شاعری کا پتہ دیتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی غزلوں میں فن کی باریکیاں حسین پیرائے میں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے تمام صنعتوں کو بڑے سلیقے سے اپنے اشعار میں ڈھالنے کی سعی کی ہے۔ ایک سے ایک نادر تشبیہات اور استعارات استعمال کیے جس سے ان کے قادر الکلام شاعر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

انسانی جذبات کے مختلف گوشوں کو عمدہ طریقے سے نظم کیا ہے کہ قاری کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جذباتی شاعری میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ طارق جمیلی کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ ابھر کر سامنے آیا ہے اور ان کے اشعار میں جدید

افکار و نظریات کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ طارق جمیلی کی غزلوں میں رومانی افکار و نظریات جگہ جگہ ابھر کر سامنے آتے ہیں چند اشعار بطور خاص توجہ طلب ہیں۔

چھپ کے آنا ہے تو آجاؤ خیالوں کی طرح
دور بھاگو نہ مجھے دیکھ غزالوں کی طرح
حرف اقرار ہے انکار ہے کہ کیا ہے یہ حیات
ہر نفس مجھ سے الجھتا ہے سوالوں کی طرح

جب بھی پلکوں پہ گل اشک کھلا دیتے ہیں
ہم ترے غم کو صبا کہہ کے دعا دیتے ہیں
جب بھی ہوتا ہے گذر غم کے بیابانوں میں
ہم تری یادوں کا ایک شہر بسا دیتے ہیں

طارق جمیلی کے فنی محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے ایوب بیامی اظہار خیال کرتے ہیں:

''اگر طارق جمیلی کی غزلوں کا احاطہ کریں تو اور بھی سارے فنی محاسن نظر آتے ہیں۔ طارق صاحب نے رکن، تقطیع اور بحروں کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ شعر اپنی جگہ مستحکم حیثیت رکھتا ہے۔ عام فہم تحریریں ہیں لیکن ان بحروں میں بھی اچھے اشعار کہہ جانا یہ طارق صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کی آئینہ دار ہے۔ جب بات بحر اور رکن کی آتی ہے تو یہ بھی کہتا چلوں کہ استعارے اور کنایے ان کی غزلوں میں اس طرح نمایاں ہیں کہ آنے والی نسل کو ایک سیکھ ملتی ہے۔ اردو کے بڑے بڑے معتبر شعرا کی زمین میں انھوں نے اچھے سے اچھے اشعار دیے ہیں۔''

(طارق جمیلی: دیدہ جوہر شناس، مضمون نگار ایوب بیامی، ص 86)

طارق جمیلی کے ادب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیق کو زندگی کے عمیق مطالعے کا حصہ بنایا ہے اور جو تجربات و مشاہدات حاصل کیے اس کو

صفحہ قرطاس پر اتار دیا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ طارق جمیلی کی شاعری فکری و فنی دونوں اعتبار سے قابل قدر ہے۔ طارق جمیلی کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے کبھی اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہیں تو کبھی احساس و فکر کے حسین امتزاج کے ساتھ ابھرتے ہیں کبھی انسانی رشتوں اور قربتوں کو بیان کرتے ہیں تو کبھی ان لطافتوں اور نزاکتوں کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ اسی لیے مثنوی 'ایک عورت کی کہانی' جو کافی دلچسپ ہے اور اسے کامیاب مثنوی قرار دیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اپنے بچپن کے وہ گذرے ہوئے سن یاد آئے
اپنے بچپن کی سبھی باتیں وہ دن یاد آئے
مرے بچپن کا وہ معصوم سا بھولا چہرہ
جس کی پڑتی تھی نظر چوم ہی لیتا مکھڑا
مرا بچپن مرے بیتے ہوئے دن کی خوشبو

طارق جمیلی کو منظر کشی میں دسترس حاصل ہے اور خیالات کو اس طرح شعری قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں کہ قاری اپنے بچپن کو اس میں تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ طارق جمیلی ایک روشن خیال شاعر و ادیب ہیں ساتھ ہی وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی بھی۔ ان کا ماننا ہے کہ تعلیم لڑکے اور لڑکیوں کے لیے بہت ضروری ہے تعلیم نسواں کے مخالفین پر زبردست چوٹ بھی کرتے ہیں تعلیم کے بغیر کوئی سماج ترقی نہیں کرسکتا ہے ان خیالات کو بڑے اچھے ڈھنگ سے شاعری میں پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

اہل کہنہ تھے مخالف میرے اب پڑھنے پہ
ہر کوئی کہتا تھا ابا سے میرے یہ اکثر
آگے پڑھ کر وہ کیا دفتر میں ملازم ہوگی
ڈگری پائے گی تو کیا ملک کی حاکم ہوگی
بولے ابا کہ جہالت کی یہاں حد کیا ہے
تم نہیں جانتے تعلیم کا مقصد کیا ہے
علم ہے اور جہالت کو مٹانے کے لیے
علم ہتھیار ہے دشمن کو جھکانے کے لیے
علم انسان کی دنیا کو سجا دیتا ہے
علم حیواں کو انسان بنا دیتا ہے

آخر میں طارق جمیلی کی مشہور زمانہ نظم 'پورنیہ' جو ایک طویل نظم ہے اور تقریباً 110 اشعار پر مشتمل ہے۔ طارق جمیلی نظم 'پورنیہ' لکھ کر پورنیہ کی قدر و منزلت میں اضافہ ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں شہر پورنیہ کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ عہد قدیم سے شہروں پر نظمیں لکھی جاتی رہی ہیں غالب، صفی لکھنوی اور حرمت الاکرام ایسے نام ہیں جنھوں نے مختلف شہروں پر نظمیں لکھ کر اس عہد کی تصویر کشی کی ہے۔ دلی، لکھنؤ، ممبئی، دکن، عظیم آباد اور بنارس جیسے بڑے شہروں پر بھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ 'پورنیہ' نظم کی معنوی خوبیوں کے پیش نظر شمس جمیلی لکھتے ہیں:

''پورنیہ (پورین) کنول کا دیش رہا ہے یہاں کے شعر و ادب کے دیش میں گل بوٹے کھلانا طارق جمیلی کا حصہ ہے جناب طارق نے اس نظم کی تخلیق کر کے پورنیہ کے تمام قرضے مع سود بیباق ادا کر دیا ہے یہ ادبی شہہ پارہ زعفران زار کشمیر ہے جو جنت نگاہ بھی ہے اور فردوس گوش بھی۔''

طارق جمیلی نے اس نظم میں گاؤں، ندی نالے، کھیت کھلیان اور آب و ہوا کی بہترین منظر کشی کی ہے۔ ساتھ ہی پورنیہ کی وسیع القلبی، چین و سکون، وہاں کی کھلی فضا، پھوس کے گھر کے فطری حسن کی عکاسی طلسمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ طارق جمیلی نے اپنی شاعرانہ کاوش سے خوبصورت مصرعے تراشے ہیں۔ پروفیسر احمد حسین دانش نے نظم 'پورنیہ' کو 'شہر نامہ' سے موسوم کیا ہے

نظم 'پورنیہ' جس میں پورنیہ کی خارجی شان و شوکت پر خامہ فرسائی ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور معاشی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پورنیہ ایک قدیم شہر ہے جس کی اپنی ایک تاریخ ہے اپنی ایک شناخت رہی ہے جس کو طارق جمیلی کے شاعرانہ مزاج نے رنگ بھرنے کا کام کیا ہے۔ ساتھ ہی پورنیہ کے باشندوں میں محبت، انسان دوستی اور بھائی چارگی کا پیغام دیا ہے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اجنبیت کی یہ دیوار گرادی جائے
دل میں الفت کی وہ تصویر بنادی جائے
آ وہ بھری بزم میں سینے سے لگالوں تجھ کو
تو مجھے اپنا کہے اور میں کہوں اپنا تجھ کو

وہ صاحب اسلوب ادیب بھی ہیں اور قلم کے سپاہی بھی انھوں نے جس موضوع کو اپنے ہاتھ میں لیا اسے منفرد طرز اور اصناف کے معراج تک لے گئے اس طرح طارق جمیلی اردو کا ایک خاموش خدمت گار کی حیثیت سے اردو ادب میں بالخصوص سیمانچل میں اپنی محنت و مشقت کے گل کھلاتے ہوئے 4/فروری 2019 کو ہم سب کو رلا کر چلے گئے اور معبود حقیقی سے جا ملے۔ اس طرح ان کے جانے سے اردو ادب کو کافی نقصان اٹھانا پڑا اور جس کی کمی اردو ادب ہمیشہ محسوس کرتا رہے گا۔

■

Md. Marghoob Alam
Assistant Professor, Department of Urdu
Ramkirshna College,
Madhubani - 847211
Mob.: 7463010549
Email: marghoobmd6@gmail.com

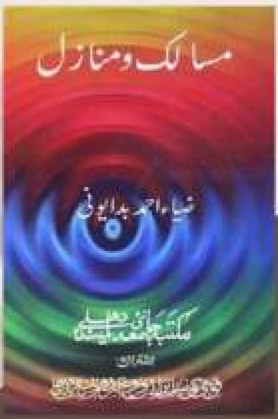

پروفیسر ضیا احمد بدایونی

محمد فرحان خان

ایک ہمہ جہت شخصیت

ضیا احمد صدیقی معروف ضیا احمد بدایونی کی پیدائش 21 ستمبر 1894 شہر بدایوں کے محلہ مولوی ٹولہ کے ایک علمی ومذہبی خاندان میں ہوئی۔ والد کا نام مولوی رفیع احمد تھا جو خود اردو فارسی وعربی کے قادر الکلام عالم وشاعر تھے اور عالی تخلص کرتے تھے اور وکالت کے پیشے سے منسلک تھے۔ ضیا احمد بدایونی اپنی پیدائش کے تعلق سے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ:

''میں بھائی عنایت حسین مرحوم کے دسویں (فاتحہ) کے روز پیدا ہوا تھا۔ واضح رہے کہ دسواں مرنے کے نویں روز ہوتا ہے۔ مرحوم کی وفات 12 ربیع الاول شریف 1312ھ کو مطابق 13 ستمبر 1894 کو جمعہ کے دن واقع ہوئی تھی۔ اس حساب سے میں 20 ربیع الاول 1312ھ مطابق 21 ستمبر 1894 کو جمعہ کے دن عالم وجود میں آیا۔ اب خدائے پاک خاتمہ بخیر کرے''۔

(بحوالہ ضیا احمد بدایونی، حیات اور کارنامے از ڈاکٹر معین فاطمہ ص 12)

ضیا احمد بدایونی کی ابتدائی تعلیم حافظ اشتیاق احمد کی سرپرستی میں ہوئی۔ بعد از مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں عربی قواعد، فقہ اور حدیث کی مزید تعلیم حاصل کی۔ آپ کی ذہانت ولیاقت کا یہ عالم تھا کہ کم عمری ہی میں بخاری شریف زبانی سنا کر حدیث کی سند حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے غالباً 1914 میں بدایوں مشن اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا۔ ضیا احمد بدایونی کو کم سنی میں ہی رشتۂ ازدواج سے منسلک کر دیا گیا باجود اس کے انھیں مطالعۂ کتب اور حصول علم سے انہماک رہا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی خانگی ذمے داریوں میں الجھ کر رہ جاتے انھوں نے جدید انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دینا مناسب سمجھا اور گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں اور بریلی کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ 1918 میں بی اے مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصے تک بدایوں مشن اسکول میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ 1924 میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے مکمل کیا اور دو سال تک یونیورسٹی سے وظیفہ حاصل کر کے عہد اکبری کے فارسی ادب پر تحقیقی خدمات انجام دینے کے بعد اینگلو عربک کالج دہلی میں لیکچرر ہو گئے۔ پھر 1929 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انٹر کالج کی نوکری قبول کر کے علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ 1930 میں یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ فارسی کے منصب پر فائز رہ کر 1959 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

سبکدوشی کے بعد یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے آپ کو حضرت امیر خسرو کے کلام پر تحقیق کرنے کے لیے وظیفہ مقرر کیا۔ ایک سال بعد دہلی یونیورسٹی میں اردو ہندی لغت کے مدیر خصوصی (چیف کمپائلر) کی حیثیت سے تدوین لغت کی ذمے داری نبھاتے رہے جو کسی سبب پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ تقریباً پانچ سال دہلی یونیورسٹی سے منسلک رہنے کے بعد مستقل علی گڑھ کے ہو کر رہ گئے اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں منہمک رہے۔ جولائی 1973 میں ضیا صاحب کو اچانک برین ہمرج ہوا اور تین دن کی شدید علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا جس کے سبب ادبی حلقوں میں ہی نہیں سیکڑوں گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ آپ کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

ضیا احمد بدایونی کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے شاگردوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے جو ہندو پاک میں مختلف عہدوں پر فائز رہے، بالخصوص سید حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور غلام مصطفیٰ خاں (پروفیسر، صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی) وغیرہ۔

پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں کہ:

''برصغیر پاک و ہند اور بیرونی ممالک میں بلا مبالغہ ان کے ہزاروں شاگرد ایسے موجود ہیں جو علم وفضل، جاہ و منصب اور مال وثروت میں بھی خصوصی امتیاز رکھتے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلنا اپنے لیے موجب افتخار و ابتہاج سمجھتے ہیں۔ موجودہ دور کے ادبا وفضلا میں بہت کم ایسے ہوں گے جو ان کے فضل وکمال کے معترف نہ ہوں اور ان سے عقیدت ومودت نہ رکھتے ہوں۔''

(مضمون: مولانا ضیا احمد بدایونی (1) از پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں مشمولہ کلیات ضیا، مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1998، ص 30)

ضیا احمد بدایونی بلا شبہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ مفکر و دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ بیک وقت وہ ایک اعلیٰ شاعر اور نثر نگار تھے، ناقد بھی تھے اور محقق بھی۔ اردو، فارسی اور عربی زبان و ادب پر یکساں قدرت رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کی گراں قدر تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ کے والد مولوی رفیع احمد عالی، بڑے بھائی مولوی رضی احمد رضی اور چھوٹے بھائی مولوی آفتاب احمد جوہر کا شمار باکمال اور صاحب دیوان شعرا میں ہوتا ہے۔

ضیا بدایونی زمانہ طالب علمی سے ہی شعر و ادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جیسے جیسے علم عروض اور بحور و اوزان گرفت میں آتے گئے شاعرانہ رغبت اور خیال کی پاکیزگی مزید دوبالا ہوتی گئی۔ شاعری میں وہ اپنے بھائی رضی بدایونی سے تلمذ تھا جو ان کے لیے استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ متعدد تحریروں میں انھوں نے خود رضی بدایونی سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے جو تھوڑا بہت سیکھا ہے وہ مرحوم ہی کے فیضان تربیت کا طفیل ہے۔'' ضیا بدایونی کی شاعری میں فکر کی بلندی، اسلوب کی شگفتگی اور موضوعات میں پختگی مسلم ہے نیز انھوں نے فارسی شاعری کے علاوہ عربی الفاظ و تراکیب کا سلیقے سے استعمال بھی کیا بالخصوص ان کی غزلیہ شاعری پاکیزہ جذبات، لطیف اشارات اور عارفانہ خیالات سے عبارت ہے۔ صفائی زبان، صحت بیان ان کی غزلوں کو انفرادیت کے درجے تک لے آتی ہے۔ تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد تخلیق کار کی ملکیت سے محروم ہو جاتی ہے کیونکہ قاری اپنی نوک زباں سے متن یا الفاظ کو کھرچ کے جو مفہوم برآمد کرتا ہے، پھر چاہے وہ منشائے مصنف ہو یا نہ ہو، قاری کی اپنی مخصوص سوجھ بوجھ کا سامان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضیا بدایونی نے اپنی غزلیہ شاعری میں ان تمام محرکات کا بخوبی خیال رکھا جو قاری کی مخصوص فکری سطح پر قاری کی سماعتوں پر عیاں ہونے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ غزل کے علاوہ انھوں نے مختلف اصناف پر غیر معمولی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلیات میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، منظومات، نعت اور متفرقات کے علاوہ کلام فارسی کو بھی شامل کیا گیا ہے جسے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے مرتب کر کے 1998 میں شائع کیا تھا۔

ضیا احمد بدایونی کا سب سے نمایاں ادبی کارنامہ ان کے مختصر قطعات پر مبنی مجموعہ 'تذکار سلف' ہے جو جنوری 1928 میں علی گڑھ سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کا تمہید یہ مولانا شبلی نعمانی کے نام ہے بعد از مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تقریظ شامل ہے اور مقدمہ مولانا عبدالسلام ندوی نے تحریر کیا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل تمام قطعات مذہبی نوعیت پر مبنی ہیں جو کسی تاریخی واقعہ اور شخصیات کے اخلاق و کردار کا آئینہ ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا شبلی مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے آج سے پندرہ سال قبل اس قسم کا سلسلہ نظم اردو میں صحیح اصول پر شروع کیا اور سرور کائنات صلی اللہ وعلیہ وسلم، صحابہ کرام اور مشاہیر اسلام کے بیسیوں واقعات دلکش انداز میں نظم کر ڈالے۔ مرحوم کے بعد ان کے تتبع میں کہنے والے متعدد پیدا ہوئے لیکن اس طرز میں اس رسالے کے مولف سے زیادہ کامیاب میں نے اب تک کسی کو نہیں پایا۔ انھوں نے نہ صرف نوعیت عنوانات میں بلکہ انداز بیان، نشست الفاظ، بحور نظم، مصرعوں کی ترکیب غرض ہر شے میں مولانا شبلی کا چربہ اتار لیا ہے اور اس کامیابی پر وہ مستحق تہنیت ہیں۔''

(بحوالہ مضمون مولانا ضیا احمد بدایونی (2) از پروفیسر غلام مصطفیٰ، مشمولہ کلیات ضیا، مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ص 63-64)

اس کے علاوہ انھوں نے مختلف سبق آموز مذہبی واقعات اور مشاہیر کے کارناموں کو بھی نظم کیا ہے۔ منظومات پر مشتمل ان کا یہ شعری مجموعہ 'تجلیات' بھی ایک معروف ادبی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو 1952 میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں انھوں نے 1928 سے 1953 تک جو نظمیں تخلیق کی تھیں انھیں اور وہ نظمیں جو مجموعہ تذکار سلف میں شائع ہو چکی تھی' ایک ساتھ مجموعہ تجلیات میں شائع کرائی تھیں۔ ان تمام نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں عربی اشعار اور قرآن کی آیتوں کو بخوبی استعمال کیا ہے۔ مذہبی نوعیت کے علاوہ اس مجموعے میں مختلف موضوعات پر نظمیں بھی شامل ہیں۔

اس مجموعے کی خاص اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ موضوعات جو فن کار کے ذہن و فکر سے حد درجہ بلکہ کوسوں دور تھے، ضیا بدایونی نے ان موضوعات و عنوانات پر غیر جانب داری سے اپنی عقیدتوں کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ بیان کی پاکیزگی کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے مذہب اسلام کے اصل موقف اور پیغمبر اسلام کی سیرت و شخصیت، صحابہ کرام اور ان کے کردار و جذبہ کو بطور فن ایسا ترتیب دیا ہے کہ حقائق اور صداقت کی آب و تاب منظر عام پر آجاتی ہے۔ مثلاً خلق عظیم، خلفائے راشدین کا خلوص و ایثار، عدل فاروقی، مساوات اسلامی، عہد سلف کا ایک زریں صفحہ، بادشاہ دو جہاں کے اہل بیت وغیرہ موضوعات کو بخوبی نظم کیا ہے۔

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جس زمانے میں میر نے اردو شاعری کو جدت پسندی اور نئے موضوعات سے روشناس کرایا تھا، میر کے بعد اردو غزل میں تخیل، تغزل اور سوز و گداز جیسے مضامین مومن خاں مومن کے مرہون منت ہیں۔ عجب اتفاق یہ ہے کہ مومن کی شاعری کے پیچیدہ اسلوب بیان اور موضوعات و تراکیب نے عام فہم زبان کی آمیزش سے کنارہ کشی اختیار کر کے عوام اور صاحب فن کو استفادے سے محروم کر دیا۔ سخن فہم اور باشعور اشخاص نے وہ توجہ ان کے شاعری پر نہیں دی جس کی وہ مستحق تھی۔ لہٰذا اس ضمن میں سب سے پہلے ضیا احمد بدایونی نے کلام مومن کو اپنی نگارشات کا موضوع منتخب کیا اور ان کے قصائد کو مرتب کر کے تصحیح و تشریح کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ ان کی یہ کوشش اس لحاظ سے بھی معیاری تسلیم کی جاتی ہے کہ کلام مومن کے متداول اور غیر مطبوعہ نسخوں میں جو اغلاط واشکال تھے، اس کی تصحیح کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

شرح قصائد مومن کے تعلق سے ڈاکٹر سید محمد حفیظ لکھتے ہیں کہ:

''کلام مومن سے آپ کو ابتدا سے خاص شغف رہا ہے، چنانچہ 1925 میں آپ نے قصائد مومن کی شرح شائع کی تھی۔ موجودہ دور میں مومن پر سب سے پہلا مضمون آپ ہی کے قلم سے نکلا اور رسالہ اردو میں مومن کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا اس کے بعد ملک کے مختلف رسالوں میں مومن پر دیگر اہل قلم کے مضامین شائع ہوئے۔ اس لیے کلام مومن کی احیا یا نشاۃ ثانیہ کے لیے اردو زبان خاص طور پر آپ ہی کی مرہون و ممنون ہے''۔

(بحوالہ مضمون مولانا ضیا احمد بدایونی (1) از پروفیسر غلام مصطفیٰ، مشمولہ کلیات ضیا مرتبہ ظہیر احمد صدیقی، ص 32-31)

ضیا بدایونی نے مومن کے قصائد کی شرح کے بعد 1934 میں ان کا دیوان بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا جس کی تصحیح مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے کر کے شرح بھی تحریر کی تھی۔ مشکل الفاظ و اشعار کی تشریح اور مومن کے ذاتی حالات کے لیے تذکروں سے زیادہ سید ناصر حبیب نبیرہ مومن اور ان کی صاحبزادی کے بیانات کو ترجیح دی ہے۔ اس دیوان کی قدر و قیمت اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں مومن کے حالات اور ان کے مختلف اصناف سخن پر مدلل جامع بحث اور تغزل کی خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔ مومن کے کلام کی تشریح اور خصوصیات پر جس انداز سے ضیا بدایونی نے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے واضح طور پر دیگر ناقدین اس ضمن میں کوئی مزید اضافہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ یہاں واردات عشق و محبت، نازک خیالی اور مضمون آفرینی، ندرت اسلوب و شوخی ادا، فکر شاعرانہ،

معاملہ بندی، طنز اور تراکیب جدیدہ پر تفصیلی گفتگو اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ اس مجموعے کی قدر مشترک بات یہ ہے کہ متعدد خصوصیات کے علاوہ ضیا بدایونی نے مومن کی خامیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ علمی و ادبی تناظر میں ضیا بدایونی کی انفرادیت یہ ہے کہ جس موضوع کو انھوں نے سپرد قلم کیا ہے غیر جانب داری کے ساتھ اسے فن کی معراج عطا کی ہے، خواہ وہ ادبی موضوعات ہوں یا علمی و مذہبی۔

ترتیب و تدوین میں ضیا احمد بدایونی کا نام سر فہرست ہے۔ انھوں نے اپنے والد مولانا رفیع احمد عالی کی تصانیف تصحیح اللغات اور یادگار عالی اور اپنے بھائی مولانا رضی احمد رضی کے انتخاب کلام لمعات کو بھی ترتیب و تدوین کر کے شائع کیا تھا۔

ضیا احمد بدایونی کی ایک اور غیر معمولی تصنیف مسالک و منازل ہے جو فارسی شعر و ادب پر مشتمل تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں فارسی ادب کے ارتقا، فارسی شاعری اور ہجویات، فارسی شاعری کے رجحانات، عہد خاقانی کی جھلک وغیرہ موضوعات کا مدلل تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ بلا تفریق یہ چند مضامین پر مبنی کتاب فارسی شاعری کے عہد در عہد مختصر تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے۔ ضیا احمد بدایونی نے لکھا ہے کہ:

''فارسی ادب (نظم و نثر) ایک بے کراں سمندر کا حکم رکھتا ہے۔ راقم نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس سمندر کے چند قطرے فراہم کر دیے ہیں جن کا مقصد ایک حد تک تشنگی رفع کرنا ہے۔ اپنی یا اہل ذوق کی یاددہانی کی سمجھ لیجیے۔''

(مسالک و منازل از ضیا احمد بدایونی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی 2011، ص 10)

اس کتاب کو خود ضیا بدایونی نے ترتیب دیا تھا۔ کتاب کا نام بھی انھوں نے خود طے کیا تھا اور انتساب اس طرح تحریر کیا تھا۔ ''مدینۃ الاولیا بدایوں کے نام جس کی فضاؤں میں رہ کر راقم فارسی ادب کی قدروں سے روشناس ہوا''۔ یہ کتاب نامساعد حالات کی وجہ سے شائع نہ ہو سکی لہٰذا بعد از مرگ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) کی کوششوں سے منظر عام پر آئی۔

مجموعہ سمن زار بھی اسی ضمن میں ادبی شناخت کا ضامن ہے جو شعرائے فارسی کے کلام کا انتخاب ہے جسے ضیا احمد بدایونی نے مع ترجمہ اردو میں منتقل کر کے ساہتیہ اکادمی دہلی سے شائع کرایا تھا۔ ڈاکٹر معین فاطمہ نے اپنی کتاب 'ضیا احمد بدایونی، حیات اور کارنامے' میں اس کتاب کو سخن زار کے نام سے متعارف کرایا ہے حالانکہ اس کتاب کا اصل نام سمن زار ہے جس میں فارسی کے مستند اور برگزیدہ شعرا اور ان کی بعض اصناف سخن کا انتخاب شامل ہے۔

اس کے علاوہ پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی نہایت قابل قبول تصنیف 'قول سدید' ہے جو مذہبی حیثیت کا درجہ رکھتی ہے۔ دراصل یہ کتاب مستند اسلامی تاریخ کی تفصیل و توضیح ہے۔ بالخصوص اس کتاب میں واقعہ کربلا اور اموی دور حکومت کے تاریخی نقوش پوشیدہ ہیں۔ یہ کتاب محمود احمد عباسی کی کتاب خلافت معاویہ و یزید کی رد میں تحریر کی گئی تھی اور 1960 میں علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی مختلف مذہبی طبقوں میں اس حد تک رنجشیں پیدا ہوئیں کہ کتاب کی طباعت پر قید لگا دی گئی۔ برعکس اس کے مختلف علما اور دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ کتاب مذہبی عقائد کی تفریق نہیں بلکہ حقائق کی پاکیزہ بازیافت اور مستند تاریخی شواہد کا مدلل ثبوت ہے۔

ضیا احمد بدایونی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے متعدد مضامین اور تنقیدی مقالات تحریر کیے ہیں۔ مجموعہ مباحث و مسائل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کم و بیش 33 مضامین و مقالات پر مشتمل یہ مجموعہ 1966 میں ترتیب دیا گیا اور 1968 میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں شامل تمام مضامین بلا شبہ علم و ادب میں اپنی اہمیت اور معنویت کے مستحق ہیں۔

ضیا احمد بدایونی کی قابل قدر اور علمی و ادبی تصنیف جلوہ حقیقت ہے جس میں مذہبی مضامین قلم بند کیے گئے ہیں۔ انھوں نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ علی گڑھ کے زمانہ قیام میں احباب نے اسلامی خیال کے اساتذہ کی ایک مجلس (مجلس مصنفین) قائم کی تھی جس میں مذہب، ادب، تاریخ، سیاسیات، معاشیات، سائنس غرض کہ مختلف شعبوں کے استاد شرکت کرتے تھے اور علمی بحث ہوتی تھی اور مضامین مجلس کے آرگن (مصنف) میں شائع ہوتے تھے۔ اس مجموعے میں شامل بعض مضامین اسی مجلس مذکور ہی کی تحریک پر قلم بند کیے گئے ہیں۔ لہٰذا اس کتاب کے پہلے مضمون میں سورہ اخلاص کے ترجمہ و تشریح اور تفسیر پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اور یکے بعد دیگرے مختلف مضامین میں بعض مذہبی مسائل و معاملات، طرز عقائد اسلامی، عظمت حدیث، سیرت النبی اور واقعۂ کربلا پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

ضیا احمد بدایونی کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات 1967 میں شائع ہو چکا ہے جو اپنے آپ میں ایک ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خطوط محض ترسیل و تبصرے تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ بیشتر خطوط میں علمی و ادبی مسائل و اصناف پر تبادلۂ خیال کیا گیا ہے۔ مثلاً تصوف کی تعریف، ارتقائے ادب فارسی عہد اکبری میں، دیوان قصیدہ کے ارکان اربعہ کی تعریف پر بھی طویل بحث نظر آتی ہے۔ یہ خط اکثر سوال و جواب کی صورت میں ہیں جو مشورات و مباحث اشعار کی تشریح و تصحیح پر مبنی ہیں۔

الغرض ضیا احمد بدایونی کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ از حد وسیع ہے۔ ان کی تخلیقات میں اسلوب کی شگفتگی، موضوعات میں برجستگی اور طرز فکر کی بے باکی انھیں اوروں سے جدا کرتی ہے۔ انھوں نے مشکل موضوعات کو اپنے گہرے مطالعے اور تحقیقی توانائی سے آسان اور عام فہم بنا دیا ہے۔ یہ بات افسوس سے خالی نہیں کہ ضیا احمد بدایونی جیسی ادب نواز شخصیت گمنام رہی، یہ ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہے کیونکہ ادب اور ادیب و شاعر کی نہ کوئی ذات ہوتی ہے نہ مذہب۔ وہ محض احساسات و خیالات کا غلام ہوتا ہے اور انسان کی سوچ و فکر پر بادشاہت کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ پروفیسر سید عابد حسین کی حق گوئی کی تائید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ:

''مسلمانوں کی بدقسمتی کو کیا کیجیے کہ علم و عرفان کی رہی سہی شمعیں ایک ایک کر کے بجھتی چلی جاتی ہیں اور نئے چراغ روشن نہیں ہوتے۔ بہر حال مرحوم کے علمی کارنامے دنیا میں باقی رہیں گے اور جب بھی ہماری نئی نسل کو علم و تحقیق کی راہ میں قدم بڑھانے کی توفیق ہوگی تو اس کی رہنمائی کریں گے۔''

(خط بنام ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی 14 جولائی 1973، بحوالہ ضیا احمد بدایونی حیات اور کارنامے از ڈاکٹر معین فاطمہ ص 345)

■

Dr. Mohd Farhan Khan
Jamia Market, Ward No 22, Kakrala
Badaun - 243637 (UP)
Mob.:9152759858
Email.: farhankhan0889@gmail.com

انگریزی شاعری کے منظوم اردو تراجم

محمد ریاض

اردو ادب میں انگریزی کے منظوم تراجم کی روایت نہایت مضبوط اور دلچسپ رہی ہے۔ تقریباً دو سو برسوں کو محیط یہ تاریخ نہ صرف دو زبانوں کے درمیان ایک مضبوط اور مربوط تعلق کا آئینہ ہے بلکہ اردو میں ایک نئے انداز کی شاعری کے وجود میں آنے کا سبب بھی ہے۔ دراصل اردو ادب کا انگریزی زبان و مغربی تہذیب کے ساتھ رشتہ بہت ہی واضح ہے۔ اس رشتے کا آغاز 1800 میں اس وقت ہوا جب ہندوستان میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام نے جہاں اردو زبان و ادب کو متاثر کیا وہیں دو ایسی تہذیبوں کو قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع بھی دیا جو ایک دوسرے کے لیے بالکل انجان تھیں۔ حالانکہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے 19 ویں صدی کے اواخر سے ہی انگریزی زبان کے ادبی سرمائے سے استفادہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جبکہ یہ لوگ اس زبان کے اصول و آداب سے پوری طرح واقف نہ تھے شاید انھیں آنے والے وقت میں اس زبان کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے ہمارے ادبا اور شعرا نے انگریزی ادب کا بغائر مطالعہ کیا اور اس کی نادر تخلیقات کو ترجمے کے ذریعے اردو میں پیش کیا۔ یہی ترجمہ شدہ تخلیقات آج اردو ادب کا قیمتی ادبی سرمایہ تصور کی جاتی ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب نے اپنی مختصر زندگی میں جو کچھ حاصل کیا ہے اس میں دوسری زبانوں کے علاوہ انگریزی زبان کا بھی اہم رول رہا ہے۔ پچھلے دو سو برسوں میں انگریزی زبان کی بہت سی اہم تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ جن میں منثور ترجموں کے ساتھ ساتھ منظوم ترجمے بھی شامل ہیں۔ اردو ادب میں جہاں دوسری زبانوں کی شعری تخلیقات کے منظوم ترجموں کی ایک تاریخ ہے، وہیں انگریزی سے کیے گئے منظوم ترجموں کی تاریخ بھی وسیع و عریض ہے۔

> **1857 کا زمانہ اردو زبان و ادب کے لیے بڑی خوشحالی اور ترقی کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کے خلاف لڑی گئی آزادی کی پہلی جنگ اپنی ناکامی کے ساتھ ساتھ اپنی کامیابی کے لیے بھی پہچانی جاتی ہے۔ وہ کامیابی یہ تھی کہ اہل مشرق مغربی ادب ومعاشرت سے قریب تر ہو گئے، اسی جذبے اور شوق نے اردو ادب میں نہ صرف انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کے لیے راستہ ہموار کیا، بلکہ آگے چل کر منظوم ترجموں کی اس روش نے ادب میں باقاعدہ ایک جہت کی صورت اختیار کرلی۔**

انگریزی زبان سے کیے گئے اردو منظوم ترجموں کے معیار اور ان کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ان ترجموں کو ارتقائی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1 ابتدائی دور (19 ویں صدی میں کیے گئے منظوم تراجم)
2 ارتقائی دور (20 ویں صدی کے نصف اول میں کیے گئے منظوم تراجم)
3 جدید دور (20 ویں صدی کے نصف آخر سے 21 ویں صدی کی پہلی دہائی تک کیے گئے منظوم تراجم)

انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کے اس دور کو ابتدائی دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ابتدائی دور میں ہونے کے سبب یہ فن بے توجہی کا شکار رہا۔ منظوم ترجموں پر کام تو ضرور ہوا لیکن ان ترجموں میں انگریزی شاعری کے ترجمے بہت کم شامل ہیں۔ حالانکہ 1800 میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ دیگر ادبیات کی اہم نثری تخلیقات کے ترجموں کی رفتار میں تیزی ضرور آئی لیکن انگریزی ادب کے تراجم سے نسبتاً دوری برقرار رہی۔ غالباً اس کا سبب ہمارے ادبا اور شعرا کی انگریزی زبان وقواعد سے کم واقفیت اور مغربی تہذیب سے دوری رہی۔ اس کے باوجود کچھ اہل ذوق نے منظوم ترجموں کی طرف توجہ دی اور انگریزی شاعری کی کچھ تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس ابتدائی عہد میں جن حضرات نے منظوم ترجمے کیے ان کی کوششوں کو ابتدائی کوششوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی ہونے کے سبب ان منظوم تراجم کو فنی اور لسانی اعتبار سے کامیاب اور اعلیٰ درجے کے ترجمے قرار نہیں دے سکتے بلکہ اس قبیل کے بیشتر تراجم میں اصل سے مطابقت کی کوشش فضول ہے۔ ہاں، مترجمین نے ترجمہ کرتے وقت صرف اپنی ترجمہ شدہ تخلیقات میں خوبیاں پیدا کرنے کی کوششیں تو ضرور کیں لیکن ترجمہ کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے جس کی وجہ سے زیادہ تر ترجموں میں اصل شاعری کی روح برقرار نہیں رہ سکی۔

وثوق کے ساتھ یہ کہہ پانا ممکن نہیں کہ 19 ویں صدی کے نصف اول میں انگریزی شاعری کے کتنے ترجمے ہوئے اور ان کے مترجمین کون تھے کیونکہ اس دور کی زیادہ تر منظوم تخلیقات کی بازیافت نہیں ہو سکی ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس عہد کے کچھ

منظوم ترجمے براہ راست انگریزی سے نہیں کیے گئے بلکہ ان ترجموں کے لیے اصل تخلیق کے فارسی ترجموں سے استفادہ کیا گیا۔اس سلسلے میں معروف شاعروادیب انشاء اللہ خاں انشا کی ترجمہ شدہ مثنوی 'فیل نامہ' کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو ایک انگریزی قصے سے ماخوذ ہے۔انشا نے یہ مثنوی 1792 میں اصل قصے کے فارسی ترجمے کی مدد سے اردو میں پیش کی۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''مثنوی فیل جس کا دوسرا نام فیل نامہ بھی ہے، ایک مختلف مثنوی ہے۔اس مثنوی کی وجہ تالیف یہ ہے کہ 'جان کارش' نے انگریزی میں ایک قصہ لکھا۔نواب سعادت علی خاں کے ایک مصاحب کلارک صاحب نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔نواب نے انشا سے اسے اردو میں منظوم ترجمے کے لیے کہا''[1]

'فیل نامہ' کے علاوہ انگریزی شاعری کے بہت سے منظوم ترجمے ہوئے لیکن زیادہ تر تراجم آج بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہیں،ان کے متعلق وثوق سے فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا۔فارسی کے علاوہ اس عہد میں بہت سی انگریزی حکایتوں،کہاوتوں اور وعظوں کے منظوم ترجمے کیے گئے لیکن زیادہ تر تخلیقات کی بازیافت نہیں ہو سکی ہے۔

1857 کا زمانہ اردو زبان و ادب کے لیے بڑی خوشحالی اور ترقی کا زمانہ تھا۔انگریزوں کے خلاف لڑی گئی آزادی کی پہلی جنگ اپنی ناکامی کے ساتھ ساتھ اپنی کامیابی کے لیے بھی پہچانی جاتی ہے۔وہ کامیابی یہ تھی کہ اہل مشرق مغربی ادب و معاشرت سے قریب تر ہو گئے، اسی جذبے اور شوق نے اردو ادب میں نہ صرف انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کے لیے راستہ ہموار کیا، بلکہ آگے چل کر منظوم ترجموں کی اس روش نے ادب میں باقاعدہ ایک جہت کی صورت اختیار کرلی۔اس سلسلے میں پروفیسر حامدی کاشمیری ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''مغربی تعلیم کے رواج کے ساتھ اسکولوں،کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مغربی ادب اور شاعری عام ہونے لگی،لوگ انگریزی نظموں کے موضوع اور اسلوب سے آگاہ ہوئے اور انھیں اردو شاعری کی کم مائیگی اور سطحیت کا احساس ہونے لگا،خاص کر اردو غزل کے عام انداز کی فرسودگی کا انھیں احساس ہونے لگا۔بعض شعرا نے مغربی تصور سے اردو خوانوں کو روشناس کرانے کے لیے انگریزی نظموں کے اردو میں منظوم ترجمے بھی کیے''[2]

چنانچہ 1860 کے بعد ادب میں انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں پر باضابطہ طور پر کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انگریزی شاعری کی نادر تخلیقات کے منظوم ترجموں پر توجہ دی جانے لگی اس سلسلے میں مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کو اولیت حاصل ہے،جنھوں نے انگریزی شاعری کی بہت سی اہم تخلیقات کے منظوم ترجمے کیے۔

19ویں صدی کے نصف آخر میں ہی سرسید کی تحریک کے زیر اثر مسلمانوں کی علمی،ادبی اور ثقافتی زندگی پر انقلابی اثرات مرتب ہوئے۔جس کا اثر اردو شاعری پر بھی پڑا۔اس کے بعد اہل اردو کو یہ خیال آیا کہ اردو ادب میں انگریزی شاعری کے منظوم ترجمے ہونے چاہیے چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے کرنل ہالرائیڈ کے ایما پر آزاد اور حالی نے 1867 میں انجمن پنجاب قائم کی جو ایک تحریکی شکل اختیار کر گئی۔اس تحریک کے ذریعے نہ صرف اردو شاعری کی اصلاح کی بلکہ اسے نئے خیالات اور اسالیب سے روشناس بھی کرایا۔انھوں نے اہل ملک کو انگریزی شعر و ادب کی عظمت اور وسعت کی جانب متوجہ کیا۔اس سلسلے میں دونوں ادیبوں نے خود بھی بہت سی انگریزی تخلیقات کے منظوم ترجمے کیے۔حالی نے 'دوست' اور 'قدر و منزلت کس جگہ ہوتی ہے' جیسے منظوم ترجمے کیے وہیں آزاد نے اولوالعزمی کے لیے سدراہ نہیں،معرفت الٰہی، بڈھا باپ اور 'بلا عنوان' جیسی منظوم تخلیقات پیش کیں۔حالانکہ آزاد اور حالی کے ان منظوم ترجموں کو معیاری اور مثالی تراجم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان کے منظوم ترجموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے فن ترجمہ نگاری کے اصول وضوابط کی پیروی نہیں کی۔یہاں یہ بات واضح رہے کہ منظوم ترجموں کے سلسلے میں ان حضرات کے سامنے کوئی جامع نمونہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ خود اس فن سے پوری طرح واقف تھے بلکہ یہ ان کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔گرچہ یہ حضرات انگریزی کم جانتے تھے لیکن انگریز پروفیسروں و انگریزی جاننے والوں کے مکمل رابطے میں رہتے تھے،ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔لیکن ان کی اس نئے اور مشکل میدان میں کی گئی کوششوں کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ اردو ادب میں آگے چل کر بہت سے معیاری اور بلند منظوم ترجمے کیے گئے۔

انگریزی - اردو منظوم تراجم کے میدان میں منشی غلام مولیٰ قلق میرٹھی کی 'جواہر منظوم' سب سے پہلے منظر عام پر آئی یعنی قلق میرٹھی کی 'جواہر منظوم' کو انگریزی شاعری کے اردو منظوم ترجموں کا پہلا مجموعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اس مجموعے میں کل 14 انگریزی نظموں کے منظوم تراجم شامل ہیں۔پروفیسر توقیر احمد خاں نے قلق میرٹھی کے ان منظوم تراجم کو اس صنف خاص کا نقطہ آغاز قرار دیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''یہاں ایک بات یہ قابل غور ہے کہ قلق کی یہ نظمیں اگرچہ ترجمہ تھیں لیکن اُس نوع کی نظموں کی داغ بیل تھی جس کو آزاد اور حالی نے مروج کیا۔اس طرح قلق میرٹھی انگریزی شعرا کی نظموں کو اردو میں متعارف کرانے والے اولین شخص تھے۔''[3]

وہیں 1880 میں اسماعیل میرٹھی کی پینتالیس نظموں کا مجموعہ 'ریزہ جواہر' کے نام سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں چھ انگریزی نظموں کے منظوم تراجم شامل تھے۔جن میں کیڑا،موت کی گھڑی،حب وطن،انسان کی خام خیالی، فادر ولیم اور 'سر جان مور کا جنازہ' جیسی نظمیں قابل ذکر ہیں۔19ویں صدی کی آخری دہائی میں اکبر الہ آبادی نے انگریزی شاعر رابرٹ ساؤدے (Robert Southey) کی نظم 'The Cataract Of Lodore' کا ایک کامیاب منظوم ترجمہ 'آب لوڈور' کے نام سے کیا۔وہیں نظم طباطبائی نے معروف انگریزی شاعر تھامس گرے (Thomas Gray) کی نظم 'Elegy Written In A Churchyard' کا اردو منظوم ترجمہ 'گور غریباں' کے نام سے،عبدالحلیم شرر کی فرمائش پر کیا جو 1897 کے رسالے 'دلگداز' میں شائع ہوا۔طباطبائی کا یہ ترجمہ اب تک بہترین ترجموں میں شمار ہوتا ہے۔یہیں سے نہ صرف نئی نظم کی شناخت مستحکم ہوتی ہے بلکہ کامیاب نظم معرّا کا آغاز ہوتا ہے۔

19ویں صدی کے آخر تک انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں میں باقاعدہ دلچسپی لی گئی اور ان کے معیار و فنی ضروریات پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔اب منظوم ترجموں کا یہ عمل ایک دائرے میں نہ رہ کر بڑے پیمانے پر کیا جانے لگا اور اس فن کے تئیں اہل اردو میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ابتدائی دور میں نئی نظم کی تحریک کے زیر اثر جن شعرا نے انگریزی زبان کی شعری تخلیقات کو اردو میں پیش کیا ان میں قلق میرٹھی (لڑکپن کی پہلی مصیبت،داستان اندھے لڑکے کی،بیان جنت)، بانکے بہاری لال (حکایت بلبل اور شب تاب،لال اور تتلی کا بیان،محنت کے بیان میں)، رحیم اللہ (بلبل اور جگنو کی حکایت،جلا وطن،خوش اخلاقی)، نادر کاکوروی (گھنٹہ نہیں بجے گا،گزرے زمانہ کی یاد میں،شاعر کا دل)،عبدالغفور شہباز (جوگی،آب رواں،طائر الفردوس)،نظم طباطبائی (نغمہ زندگی،رحم،نوع بشر سے محبت) اور سرور جہاں آبادی (موسم بہار کا آخری پھول،اندھی پھول والی کا گیت،کوکل) جیسے فنکار شامل ہیں۔مختصر یہ کہ انجمن پنجاب کی تحریک نے انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کے لیے جو پلیٹ فارم تیار کیا وہ بہت

کامیاب رہا۔ 19 ویں صدی کے نصف آخر میں آتے آتے انگریزی منظوم ترجموں نے ادب میں نہ صرف اپنی پہچان قائم کی بلکہ معیاری اعتبار سے بھی بہت سے ترجمے خوب کامیاب رہے۔

20 ویں صدی کے آغاز سے منظوم ترجموں نے ایک نئے دور انقلاب میں قدم رکھا جہاں اس کے مزاج میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ انگریزی اور یورپی ادب سے اہل ہند قریب ہوئے اور انگریزی نظموں کے معیاری تراجم منظر عام پر آنے لگے تھے۔ یہ تراجم نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ ان سے منظوم ترجموں کی تحریک کو زبردست تقویت پہنچی۔ انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کی ترقی میں ادبی رسالوں نے بہت اہم رول ادا کیا جن میں شرر کے رسالہ دلگداز، نگار، مخزن، دکن ریویو، ادیب، زمانہ، ہمایوں، تمدن تجلی، افادہ اور ادبی دنیا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

'مخزن' کے پہلے شمارے میں جس مقصد کا اعلان کیا گیا تھا وہ چند سال کے عرصے ہی میں بہت حد تک پورا ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس کے بعد تو معیاری منظوم ترجموں کی رفتار میں تیزی آنے لگی۔ مخزن کے پہلے ہی شمارے میں مولانا ظفر علی خاں نے لارڈ ٹینی سن کی معروف نظم The Brook کا منظوم ترجمہ 'ندی کا راگ' کے نام سے پیش کیا۔ اسی زمانے میں ظفر علی خاں نے معروف ہندوستانی انگریزی شاعرہ سروجنی نائیڈو کی معرکتہ الآرا انگریزی نظم Ode To H.H. The Nizam Of Hyderabad کو 'تاجدار دکن' کے نام سے اردو کے سانچے میں پیش کیا جسے خوب پسند کیا گیا۔ دراصل سروجنی نائیڈو نے یہ نظم شاہ دکن 'نواب میر محبوب علی خاں' کی تعریف میں رقم کی تھی۔

اردو ادب میں انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کی کامیاب کوششوں میں ڈاکٹر علامہ اقبال کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انگریزی ادب، فلسفہ اور مغربی تاریخ وتہذیب سے آگہی کے سبب اقبال نے انگریزی شاعری کے جو تراجم کیے وہ اردو میں بلند اور معیاری ترجموں کی فہرست میں شامل ہیں۔ یورپ میں اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی کے دوران اقبال کی انگریزی ادب سے دلچسپی نے ہی انھیں اس فن خاص کے لیے منتخب کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے مطابق:

''اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعرا جیسے ٹینی سن، ایمرسن، گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ یہ درحقیقت اقبال کی موضوعی نظموں کا اولین نقش ہیں۔''[4]

اقبال نے جب انگریزی شاعری کے ترجمے کا آغاز کیا تو انھوں نے مغربی شعرا کے کلام سے خوب استفادہ کیا۔ جس کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں:

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈزورتھ سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ غالب اور بیدل نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ مغربی شاعری کے اقدار سمو لینے کے باوجود اپنے جذبہ اور اظہار میں مشرقیت کی روح کو کیسے زندہ رکھوں اور ورڈزورتھ نے طالب علمی کے زمانہ میں مجھے دہریت سے بچالیا۔''[5]

رسالہ 'مخزن' کے جنوری 1904 کے شمارے میں اقبال نے انگریزی شاعر ہیزی ڈائک (Henry Dyke) کے تین اشعار کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمے انھوں نے عبدالغفار خاں کی فرمائش پر کیے تھے۔ اور یہیں سے اقبال کی منظوم ترجمہ نگاری کا سفر شروع ہوا اور یہ سفر ایسا رہا کہ جس نے اردو ادب میں عمدہ منظوم تراجم کے سرمائے میں اضافہ کردیا۔ اقبال کے اہم منظوم تراجم میں پیام صبح، ماں کا خواب، بچے کی دعا، ایک مکڑا اور مکھی، ایک پرندہ اور جگنو اور 'ایک پہاڑ اور گلہری' جیسی نظمیں قابل ذکر ہیں۔

نظم طباطبائی اور اقبال سے قطع نظر 20 ویں صدی کی پہلی دہائی کے آس پاس بہت سے شعرا نے انگریزی شاعری کی نادر تخلیقات کے عمدہ منظوم ترجمے کیے ان میں احسن لکھنوی، حسرت موہانی، منشی ارتضیٰ علی شرر، منشی نوبت رائے نظر، محمد یعقوب اوج گیاوی، طالب بنارسی، غلام بھیک نیرنگ، سفیر کاکوروی، سید محمد ضامن کنتوری، محمد سیف الدین شباب اور مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو ادب میں 1920 سے تقریباً 1935 تک کا دور انگریزی ترجموں، گیتوں، تجربوں اور ہندی آمیز نظموں کا دور رہا ہے۔ اس عہد میں بہت سی انگریزی نظموں کے اردو میں معیاری منظوم ترجمے کیے گئے۔ 1914 کے ہی آس پاس عیسیٰ چرن صدا نے معروف انگریزی شاعر جان ملٹن (John Milton) کی شہرہ آفاق نظم 'Paradise lost' کا 'فردوس گم شدہ' کے نام سے ایک کامیاب منظوم ترجمہ کیا، جو 1914 میں رسالہ 'دلگداز' کے ایک شمارے کی زینت بنا۔ یقیناً ایسی طویل نظم کو منظوم شکل میں پیش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن پھر بھی صدا نے اس کام کو بخوبی انجام دیا۔ صدا کی اس کامیاب کوشش کو عبدالحلیم شرر سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس وقت تک کسی کو ملٹن شاعری کی معرکہ آرا مثنویوں کی طرف توجہ کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ ملٹن کے خیالات اور محاسن شاعری کو اردو لباس پہنانا اتنا مشکل کام ہے کہ جس کے ترجمہ کا حوصلہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔''[6]

20 ویں صدی کے نصف اول میں منظوم تراجم کے لیے شعرا کی ایک ایسی جماعت اٹھ کھڑی ہوئی جس نے اردو ادب میں انگریزی کی معیاری تخلیقات کے منظوم تراجم پر بڑی دلچسپی لی اور عرق ریزی سے کام کیا۔ نتیجتاً 1950 تک اردو ادب میں منظوم تراجم کا ایک معتدبہ سرمایہ اکٹھا ہوگیا جس کو بنیاد بنا کر بعد کے شعرا نے آگے کی مسافت طے کی۔ مذکورہ جماعت میں ان فنکاروں کے علاوہ بہت سے دیگر شعرا ایسے بھی ہوئے جن کی ادبی خدمات نے منظوم ترجموں کی ترقی وترویج کے لیے ایک مضبوط ومربوط سیڑھی کا کام کیا جن میں میراجی، میر جعفر علی خاں اثر، محمد حسین آزاد حیدرآبادی، باسط بسوانی، منور لکھنوی، حامد اللہ افسر، تسکین قریشی اور اندرجیت شرما کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس طرح 20 ویں صدی کے نصف آخر تک انگریزی شاعری کے ہونے والے زیادہ تر منظوم ترجموں کے معیار اور صحت میں زبردست تبدیلی آئی اور ادب میں ان کی علیحدہ شناخت مستحکم ہوگئی۔

20 ویں صدی کے نصف آخر میں جن شعرا کا نام منظوم ترجموں کے سلسلے میں بڑے ادب سے لیا جاتا ہے ان میں محمد فضل الرحمٰن اور ارشد صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ارشد صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن وہ شعر گوئی پر مکمل دست گاہ رکھنے کے سبب مختلف اصناف سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ منظوم ترجموں کے سلسلے میں 1957 میں ان کی پہلی کتاب 'عکس خیال' شائع ہوئی جس میں 15 نظموں کے ترجمے شامل تھے۔ 2000 میں ان کی اسی کتاب کا ترمیم واضافہ شدہ مجموعہ کلام 'پس عکس خیال' کے نام سے شائع ہوا جس میں مزید دس نئی نظموں کا اضافہ کیا گیا۔ اس مجموعہ کلام کو اہل اردو نے خوب پسند کیا۔ ارشد صاحب نے اس مجموعے میں مغربی شعرا کے علاوہ کچھ ہندوستانی انگریزی شعرا کے کلام کو بھی اردو منظوم کی شکل میں پیش کیا ہے جن میں رابندرناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو اور اربندو گھوش جیسے فنکاروں کے نام شامل ہیں۔

محمد فضل الرحمٰن اردو کے ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے منظوم مترجم بھی ہیں۔ ان کے منظوم ترجمے اردو کے کامیاب شعری تراجم میں اضافے کا حکم رکھتے ہیں۔ منظوم ترجموں کے بارے میں ان کا ہمیشہ یہ اصول رہا کہ ترجموں میں اصل فن پارے کی خوبیوں کی

کچھ جھلکیاں ضرور نظر آئیں۔ اپنے انھیں اصولوں کی بنیاد پر انھوں نے بہت سی انگریزی شعری تخلیقات کے معیاری اور کامیاب منظوم ترجمے کیے۔ 1961 میں ان کی چھپیس منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم English Urdu Poems کے عنوان سے Orient Longman سے شائع ہوئے۔ جن میں معروف انگریزی شاعر الیگزنڈر پوپ (Alexander Pope) کی مشہور نظم Ode on Solitude کا منظوم ترجمہ 'خانہ نشین' کے نام سے شامل ہے۔ حالانکہ اردو میں پوپ کی اس نظم کے اب تک چھ منظوم ترجمے ہو چکے ہیں جن میں گوشہ تنہائی تصویر قناعت، عشرت خلوص، خانہ نشین، راحت تنہائی اور 'سکون قلب' شامل ہیں۔

انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کے سلسلے میں فراق گورکھپوری کی ایک الگ پہچان ہے۔ انھوں نے بہت سی انگریزی تخلیقات کے اردو میں ترجمے کیے لیکن ان کا منفرد کارنامہ معروف ہندوستانی انگریزی شاعر 'رابندر ناتھ ٹیگور' کی انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ ہے۔ فراق کے یہ تراجم ان کے مجموعہ کلام ''ایک سو ایک نظمیں'' میں شامل ہیں، جو 1962 میں شائع ہوا۔ ترجمہ کی گئی نظموں میں 'ہمدرد' (Sympathy)، خاکی عبادت گاہ (From Geetanjali)، نقاد (Authorship)، بہادر مرد (The Hero)، جنم دن (My Birthday)، دعا (From Geetanjali)، 'روز رخصت (From Geetanjali)، انصاف (The Judge) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر امیر چند بہار اردو ادب کے نامور ادیبوں میں سے ہیں۔ ان کی شخصیت ادبی حلقے میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے منظوم تراجم معیاری اور بلند ترجموں کی فہرست میں شامل ہیں۔ ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ انگریزی شاعری کے ان 26 منظوم ترجموں کی شکل میں موجود ہے جو 'نسیم مغرب' کے عنوان سے 1963 میں شائع ہوئیں۔ جس میں انھوں نے انیسویں صدی کے آخر تک انگریزی کے نامور شعرا کی اہم شعری تخلیقات کا اردو زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ 'نسیم مغرب' میں زیادہ تر مغربی شعرا کی نظموں کے ترجمے شامل ہیں۔ کتاب میں شامل ہر نظم کا ترجمہ فنی اور لسانی اعتبار سے کامل اور مکمل محسوس ہوتا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین 'نسیم مغرب' کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''بہار صاحب نے انگریزی نظموں کی روح کو اپنے اندر جذب کر کے انھیں اردو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اسی وجہ سے ان میں تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے۔''7

اسی عہد میں معروف انگریزی شاعر جان ملٹن (John Milton) کی نظم 'Ode on His Blindness' کے بہت سے منظوم ترجمے ہوئے۔ ملٹن کی یہ نظم اس کی شاعرانہ صلاحیت کا ایک خوبصورت نمونہ ہے جس کی مقبولیت آج، 350 سال بعد بھی نہ صرف انگریزی ادب بلکہ دنیا کی دوسری ادبیات میں بھی قائم ہے۔ اس نظم کو جہاں فضل الرحمٰن نے 'اندھا شاعر' کے عنوان سے ترجمہ کی شکل میں پیش کیا تو وہیں عثمان عارف نقشبندی نے اسے 'نابینا شاعر' کے نام سے تخلیقی پیرایہ عطا کیا۔ امیر چند بہار نے اپنی منظوم تخلیق کا نام 'اندھا ہوجانے پر' رکھا تو صابر ابوہری ہریانوی نے بھی اس نظم کو 'نابینا شاعر' کے نام سے اردو میں پیش کیا۔ غرضیکہ اس دور میں انگریزی شاعری کی کسی ایک تخلیق کے بہت سے معیاری تراجم منظر عام پر آنے لگے تھے۔

جان ملٹن کی طرح معروف امریکی شاعر لانگ فیلو (H.W. LongFellow) کی نظم 'A Psalm Of Life" کے بھی متعدد تراجم منظر عام پر آچکے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اب تک اس کے 17 سے زائد تراجم ہو چکے ہیں جن میں نظم طباطبائی کا منظوم ترجمہ 'نغمہ زندگی' اور سید احمد کبیر کا ترجمہ 'سرود زندگی' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ معروف انگریزی شاعر پی بی شیلی (P.B.Shelley) کی نظم 'To A SkyLark' کے بھی متعدد معیاری تراجم ہو چکے ہیں۔ سید شاکر علی جعفری نے اس نظم کو 'پپیہا' کے نام سے اردو میں پیش کیا۔ جعفری کے علاوہ اس کا منظوم ترجمہ امیر چند بہار، سہیل بدایونی اور شبنم گورکھپوری بھی کر چکے ہیں۔ بہرحال انگریزی شاعری کے اردو کثیر التراجم تخلیقات کی تعداد صرف مذکورہ تراجم کو محیط نہیں بلکہ یہ تعداد اتنی ہیں کہ انھیں انگلیوں پر با آسانی نہیں گنا جا سکتا۔ 1979 میں عزیز احمد جلیلی کا مجموعہ کلام 'سوز و ساز' منظر عام پر آیا، جس میں انگریزی شاعری کے ان کے تیس منظوم ترجمے شامل تھے۔ ان ترجموں میں انگریزی کی معروف شاعرہ 'کرسٹینا جارجینا راسیٹی' (Christina Georgina Rossetti) کی مشہور نظم 'When I Am Dead' کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے جسے جلیلی نے 'آخری التجا' کے عنوان سے اردو کے سانچے میں پیش کیا ہے۔ جلیلی کے علاوہ اس نظم کو بشیر احمد طاہر نے 'میرے بعد' اور تلوک چند محروم نے 'بقائے محبت' کے عنوان سے منظوم شکل دی۔ جلیلی کے منظوم ترجمے اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے ترجموں میں زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ اور اس کی خوبیوں کو قائم رکھنے پر بھی زیادہ توجہ دی ہے۔

انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کی اس فہرست میں دھرم سروپ کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ دھرم سروپ اردو کے ان چنندہ شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ انگریزی کلام کو اردو کے منظوم سانچے میں پیش کیا۔ 1983 میں سروپ کے انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کا مجموعہ 'صدائے بازگشت' کے نام سے شائع ہوا، جس میں ان کے 40 سے زائد منظوم ترجمے شامل تھے۔ اس مجموعہ کلام میں پہلی دفعہ 'سوامی وویکانند' کی انگریزی تخلیقات کے منظوم ترجموں کو شامل کیا گیا۔ سروپ پہلے ایسے فنکار ہیں جنھوں نے ترجمے کے ذریعے اردو دنیا کو 'سوامی وویکانند' کے انگریزی کلام سے متعارف کرایا۔ سروپ کے یہ تمام منظوم تراجم ان کی کتاب 'ترانہ حق' میں شامل ہیں۔ اپریل 2002 میں دھرم سروپ نے اپنے منتخب منظوم ترجموں کا ایک دوسرا خوبصورت مجموعہ 'ایک حال دو گیت' کے عنوان سے شائع کیا جس میں 57 انگریزی نظموں کے منظوم تراجم شامل ہیں۔ اسی مجموعہ میں اردو کی تین نظموں کا انگریزی منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ جنھیں دھرم سروپ نے بڑے خوبصورت انداز میں انگریزی کے قالب میں پیش کیا ہے۔ سید شاکر علی جعفری جن کا ذکر گذشتہ سطروں میں کیا جا چکا ہے، نے بھی اس میدان میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ 1980 میں 'جام بجام' کے عنوان سے ان کے منظوم ترجموں کا گلدستہ منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں 35 انگریزی شعرا کی چھتیس انگریزی شعری تخلیقات کے منظوم تراجم شامل ہیں۔ جعفری نے اپنے مجموعے میں پہلی مرتبہ انگریزی شعرا کو ان ہی کے اسلوب میں تاریخی تسلسل کے ساتھ اردو میں پیش کیا ہے۔

ہندوستانی انگریزی شعرا کی فہرست میں سروجنی نائیڈو کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ 20 ویں صدی کے آغاز کی بڑی ہنگامہ خیز شخصیت ہیں۔ وہ ہندوستان کے ان شعرا میں سرفہرست ہیں جنھوں نے 20 ویں صدی کے آغاز میں اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے انگریزی زبان کو منتخب کیا اور اس زبان میں ایسی شاعری کی کہ انھیں 'بلبل ہند' کے خطاب سے نوازا گیا۔ اردو ادب میں سروجنی نائیڈو کی بہت سی نظموں کے ترجمے ہو چکے ہیں لیکن اس سلسلے میں سب سے نمایاں اور معیاری کام معروف شاعر ثاقب رزمی نے انجام دیا ہے۔ 1988 میں ثاقب رزمی کے منظوم ترجموں کا مجموعہ 'بلبل ہند سروجنی نائیڈو کی نمائندہ نظمیں' کے عنوان سے شائع ہوا

جس میں ثاقب نے سروجنی نائیڈو کی 100 نمائندہ نظموں کو اردو میں پیش کیا۔

شبنم گورکھپوری کا نام منظوم ترجموں کی فہرست میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔انھوں نے مغربی ادبیات کے بہت سے شعرا کے کلام کو منظوم ترجموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔جن میں جان گوئٹے،ایچ سی آرٹ مین، رابرٹ فراسٹ، ایچ ڈبلیو لانگ فیلو اور ایملی ڈکنسن جیسے شعرا شامل ہیں لیکن اس سلسلے میں ان کا سب سے منفرد کارنامہ انگریزی زبان کے تین معروف رومانی شعرا کے کلام کو اردو زبان میں پیش کرنا ہے۔ جسے انھوں نے پورے ذوق و شوق اور ذمے داری کے ساتھ انجام دیا۔ ان شعرا میں جان کیٹس (John Keats)، پی بی شیلی (P.B. Coleridge) اور ایس ٹی کالرج (S.T.Coleridge) کے نام شامل ہیں۔ 1988 میں 'پھول کانٹوں کی سیج پر' کے عنوان سے ان کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا جس میں جان کیٹس کی نظموں کے تراجم شامل تھے۔ان کی اس کوشش کو اہل اردو نے خوب پسند کیا۔اس کے بعد 1990 میں انھوں نے اپنا دوسرا مجموعہ کلام 'بادِ مغرب' کے عنوان سے ترجمہ کی شکل میں پیش کیا۔ جس میں شیلی کی پانچ خوبصورت نظموں کے علاوہ کچھ اشعار کے ترجموں کو شامل کیا گیا۔ 2004 میں شبنم صاحب نے انگریزی کے معروف شاعر ایس ٹی کالرج کی چار طویل نظموں کے منظوم ترجموں کو 'بوڑھا جہاز راں' کے عنوان سے شائع کیا۔شبنم صاحب کے منظوم تراجم اعلیٰ شاعری کے معیاری نمونے ہیں۔

20ویں صدی کے آخر میں جن مترجمین نے ہندوستانی انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں پر بڑی دلچسپی اور ذمے داری کے ساتھ کام انجام دیا ان میں راجندر سنگھ ورما، عبدالستار دلوی، علی اصغر اور اسلم مرزا کے نام قابل ذکر ہیں۔ 1991 میں راجندر سنگھ ورما کے منظوم ترجموں کا مجموعہ 'جمال ہم نشیں' کے نام سے شائع ہوا جس میں ورما صاحب نے جدید ہندوستانی انگریزی شعرا کے کلام کو اردو میں پیش کیا۔ورما صاحب پہلے ایسے مترجم ہیں جنھوں نے 20 سے زائد ہندوستانی شعرا کے انگریزی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ان شعرا میں نسیم ایزیکل (Nissim Ezekiel)، کملا داس (Kamala Das)، جینت مہاپاترا (Jayanta Mahapatra)، پرتیش نندی (Pritish Nandy)، منموہن سنگھ (Manmohan Singh)، جگناتھ پرساد داس (J.P. Das) اور گیو پٹیل (Gieve Patel) جیسے فنکار شامل ہیں۔

1991 میں راجندر سنگھ ورما کے منظوم ترجموں کا مجموعہ 'جمال ہم نشیں' کے نام سے شائع ہوا جس میں ورما صاحب نے جدید ہندوستانی انگریزی شعرا کے کلام کو اردو میں پیش کیا۔ورما صاحب پہلے ایسے مترجم ہیں جنھوں نے 20 سے زائد ہندوستانی شعرا کے انگریزی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

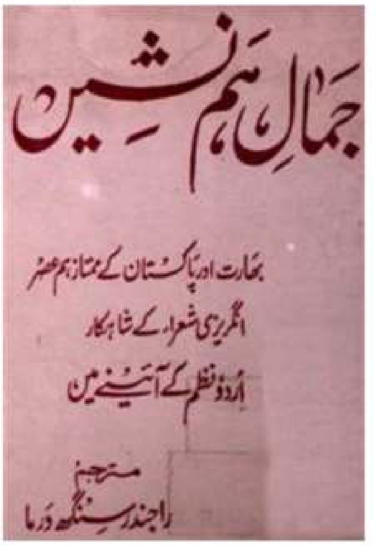

انگریزی زبان و ادب پر دلوی صاحب کو بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ انھیں انگریزی کے معروف ہندوستانی شاعر نسیم ایزیکل (Nissim EzeKiel) کی ان 30 مسلسل نظموں کے منظوم ترجموں کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی جو 'ذکر اڈنبرا' کے نام سے 1998 میں شائع ہوئیں۔ 'ذکر ایڈنبرا' انگریزی شاعری کا غالبًا پہلا ترجمہ ہے جسے ایک کتابی حیثیت حاصل ہے۔اس کتاب میں شامل چند نظمیں 'خانقاہ بریڈ'، 'آج اک اور غیر ملکی سفر'، 'میں یہاں پہ آیا ہوں' اور 'اک گندی بستی کے رستے میں' وغیرہ ہیں۔ پروفیسر دلوی کے یہ منظوم ترجمے لسانی اور فنی اعتبار سے مکمل ہیں۔ جن کے پڑھنے کے بعد پروفیسر دلوی کی ادبی و مترجمانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یقیناً پروفیسر دلوی کا میدان تحقیق و تنقید کا ہے لیکن اردو ادب میں ان کی یہ کوشش انگریزی شاعری کے معیاری اور بلند منظوم ترجموں کی فہرست میں ایک اضافہ ہے۔

علی اصغر ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ایک مشاق مترجم بھی ہیں جنھوں نے نہ صرف انگریزی سے اردو میں قابل لحاظ ترجمے کیے ہیں بلکہ تیلگو شاعری کی بہت سی تخلیقات کو اردو کا جامہ بھی پہنایا ہے۔ 2003 میں انھوں نے معروف ہندوستانی انگریزی شاعرہ کملا داس، ثریا (Kamala Das) کی 100 منتخب نظموں کا منظوم ترجمہ کیا جو 'روح کے نغمے' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ 2007 میں اسلم مرزا نے معروف ہندوستانی انگریزی شاعر پروفیسر کے۔سچیدانندن (Prof. K. Satchidanandan) کی 62 نظموں کو بڑی خوبصورتی اور مہارت سے اردو کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ اسلم مرزا کا ایک منفرد کارنامہ ہے جو ان کی شاعرانہ اور مترجمانہ صلاحیت کی گواہ ہے۔

انگریزی شاعری کے ان منظوم ترجموں کے علاوہ بھی بہت سے ترجمے کیے گئے۔منظوم ترجموں کے اس سفر میں اردو زبان نے انگریزی شاعری سے بہت کچھ حاصل کیا۔جس طرح آزادی کے بعد منظوم ترجمہ نگاری کی ضرورت اور اہمیت میں کمی نہیں آئی اور بہت سے شعرا نے انگریزی شاعری کے نادر اور بلند ترجمے کیے۔اسی طرح 21ویں صدی میں بھی اس صنف خاص کو ترقی دینے کے لیے شعرا کی ایک پوری جماعت تیار ہو چکی ہے اور آج انگریزی ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ کی دوسری ادبیات کی شعری تخلیقات کے معیاری منظوم تراجم منظر عام پر آرہے ہیں۔جو اردو ادب کی کامیابی و کامرانی کی ضامن ہے۔مختصر ہم کہہ سکتے ہیں کہ گذشتہ دوسو سالوں میں اردو ادب نے انگریزی شاعری کی نادر تخلیقات کے ترجموں کے ذریعے اپنے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

حواشی

1 تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص 144، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2015

2 جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، پروفیسر حامدی کاشمیری، ص 106، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 2010

3 (تبصرہ) قلق میرٹھی: حیات و خدمات، ڈاکٹر جلال انجم، ص 266، نامی بک ڈپو، میرٹھ، 1987

4 جدید اردو شاعری، عبدالقادر سروری، ص 225، انجمن ترقی اردو ہند، حیدرآباد، 1932

5 انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر حسن الدین احمد، ص 140، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2013

6 دیباچہ (عبدالحلیم شرر)، فردوس گم شدہ، عیسیٰ چرن صدا، ص 01، مظہر العجائب پریس، مشک گنج، 1924

7 انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر حسن الدین احمد، ص 187، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2013

Mohd. Riyaz
2968, First Floor, Shri Shiv Mandir
Kucha Neel Kanth, Behind Golcha Cinema
Darya Ganj,
New Delhi - 110002
Mob: 9958161814
Email: riyazmohdgr@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم ’زبان اور زمینی صورت حال‘ کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

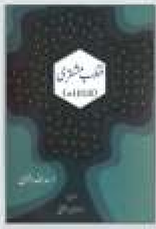

قطب مشتری

مرتبہ: ڈاکٹر حمیرا جلیلی

صفحات: 247، قیمت: 130 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مبصر: راحت علی صدیقی، موضع: محمد پور معافی، پوسٹ آفس: بھٹولی ضلع: مظفر پور، یوپی

قطب مشتری ملا وجہی کی مشہور مثنوی ہے، جس کو جنوبی ہند کی پہلی طبع زاد مثنوی ہونے کا شرف حاصل ہے، اس کو ڈاکٹر حمیرا جلیلی نے مرتب کیا ہے۔ چاروں نسخوں کے اختلافات کو بھی علامات کے ذریعے حاشیے میں واضح کیا گیا ہے، مولوی عبدالحق کا شامل کردہ ضمیمہ انھوں نے اپنی ترتیب میں شامل نہیں کیا ہے، اور اس کے لیے انھوں نے مضبوط دلائل بھی پیش کیے ہیں، جن کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ یہ اشعار قطب مشتری کا حصہ نہیں ہیں۔

کتاب کے شروع میں وقیع اور علمی مقدمہ شامل ہے، جس میں قطب مشتری کی خصوصیات وامتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے، قطب مشتری کے مرتب اول مولوی عبدالحق اس مثنوی کی اہمیت اور بلند مقام کے قائل نہیں ہیں، ان کے دعوے کو مدلل انداز میں مسترد کیا گیا ہے، اور مثنوی قطب مشتری کی خوبیاں مثالوں کی روشنی میں واضح کی گئی ہیں، 'در شرح شعر گوید' کے حوالے سے ملا وجہی کے تنقیدی افکار ونظریات اور ان کی معنویت کو بخوبی بیان کیا گیا ہے، مشہور ناقدین کے افکار اور وجہی کے نظریات کی مماثلت کو بھی عیاں کیا گیا ہے، جس سے وجہی کی فکری بلندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، وجہی اشعار پر نقد کے سلسلے کی ابتدا کرنے والے ہیں، اس لیے بھی ان کی اہمیت مسلم ہے، جس کو بخوبی واضح کیا گیا ہے، مثنوی قطب مشتری کی زبان وبیان کی دلکشی وخوبصورتی کو واضح کیا گیا ہے، تشبیہات وتمثیلات اور استعارات ومحاورات کے دلکش استعمال پر گفتگو کی گئی ہے، منظر نگاری کردار نگاری واقعہ نگاری سراپا نگاری وغیرہ مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور دلائل کی روشنی میں ان کا معیار ومقام بھی واضح کیا گیا ہے، منظر نگاری اور معنی آفرینی میں غواصی سے تقابل بھی کیا گیا ہے، اور غواصی کے مقابلے میں وجہی کے کلام میں فکر، تخیل اور پیکر کی خوبصورتی کو واضح کیا گیا ہے، قطب مشتری کی کمزوریاں بھی مقدمہ میں بخوبی واضح کی گئی ہیں، تلمیحات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، جس میں اسلامی اور ہندوستانی تلمیحات شامل ہیں، پلاٹ کی سطحیت کرداروں کی تعریف میں مبالغہ آرائی وغیرہ کو استدلالی انداز میں بیان کیا گیا ہے، کرداروں کے حوالے سے دلچسپ گفتگو کی گئی ہے، کرداروں کے اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ البتہ تمام اوصاف پر دلائل پیش نہیں کیے گئے، اس حقیقت کو بخوبی واضح کیا گیا ہے جس کی روشنی میں وجہی کے مرکزی کردار عطارد سے معمولی نظر آتے ہیں۔

لسانی تجزیہ کیا گیا ہے، استعمال شدہ اسما افعال حروف اور تراکیب وغیرہ کے استعمال کے طریقوں کو واضح کیا گیا ہے، سب رس سے تقابل بھی کیا گیا ہے، جس کی روشنی میں قطب مشتری اور سب رس کی لسانی خصوصیات واضح ہوجاتی ہیں، اور قطب مشتری سے سب رس تک ملا وجہی کے زبان وبیان کی ارتقائی کیفیت بھی واضح ہوجاتی ہے، اس حصے نے کتاب کے معیار اور ترتیب کے وقار کو مزید بلند کردیا ہے لسانیات کے جس ضابطے اور قاعدہ کو بیان کیا گیا ہے، قطب مشتری سے اس کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں، مثلاً قطب مشتری میں اسمائے کیفیت کیسے بنائے گئے ہیں، قاعدہ ذکر کیا گیا ہے، اور سب رس میں اسمائے کیفیت بنانے کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کو بھی بیان کیا گیا ہے، اشعار بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد قطب مشتری کا متن پیش کیا گیا ہے، جس میں قطب اور مشتری کے قصہ سے پہلے مختلف ذیلی عناوین کے تحت اشعار پیش کیے گئے ہیں، جس کی ابتدا حمد، مناجات، نعت اور منقبت سے کی گئی ہے، جس کی روشنی میں ملا وجہی کے مذہبی افکار بخوبی عیاں ہوتے ہیں، درصفت عشق گوید کے عنوان سے عشق کی عظمت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ در شرح شعر گوید جس میں اشعار کے محاسن اور خوبیوں کو عیاں کیا گیا ہے، مختصر سلیس اور مربوط کلام کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، شاعری کی عظمت کے لیے الفاظ اور معانی کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے، کلام کے وقیع اور اہم ہونے کے اصول وضوابط پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ باب 70 سے زائد اشعار پر مشتمل ہے، جس سے وجہی کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد باضابطہ قصے کا آغاز بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کی تعریف وستائش سے کیا گیا ہے، بیٹے کی ولادت کی حسرت وخواہش کا اظہار کیا گیا ہے، بیٹے کی ولادت اور اس کے

حسن و جمال کی تعریف کی گئی ہے، مشتری کے حسن وخوبصورتی کو دلکش پیرائے اور تشبیہات میں پیش کیا گیا ہے، جس سے مثنوی کی دلکشی اور خوبصورتی عیاں ہوتی ہے، مشتری سے عشق کا سبب ہی حسن کو قرار دیا گیا ہے، قطب شاہ عشق میں بے چین اور پراگندہ حال ہوتا ہے، اس کی کیفیت کو بخوبی بیان کیا گیا ہے، بادشاہ کو اس صورت حال کی خبر ہوتی ہے تو وہ دنیا کی حسیناؤں کے ذریعے شہزادے کے دل مضطر کا علاج کرنا چاہتا ہے، لیکن ناکامی اس کے ہاتھ لگتی ہے، اور حسینائیں شہزادے کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں، اس کے بعد شہزادے کے درد دل کا مداوا تلاش کیا جاتا ہے، اور اس مثنوی کے سب سے اہم کردار عطارد کو متعارف کرایا جاتا ہے، اس کی ذہانت وذکاوت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اس کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں، بادشاہ اس سے مشورہ کرتا ہے اور قطب شاہ کے مرض عشق کی دوا تجویز کی جاتی ہے۔

اس کے بعد قطب شاہ کا مشتری تک پہنچنے اور اس کو حاصل کرنے کا سفر شروع ہوتا ہے، جس میں تکالیف و پریشانیاں ہیں، جن سے عطارد شہزادے کو آگاہ کرتا ہے، لیکن عشق میں ڈوبا ہوا شہزادہ تمام پریشانیوں سے نبرد آزما ہونے پر آمادہ ہوجاتا ہے، مثنوی اس روداد کو بخوبی پیش کرتی ہے، عشق کی راہ میں پیش آمدہ پریشانیوں کا تذکرہ کرتی ہے، جن کے حل کے لیے قطب شاہ قرآنی آیات کا سہارا لیتا ہے، عطارد کے مشورے کام آتے ہیں، یہاں عطارد کی خصوصیات اور اس کی عظمت کے نمونے بخوبی ملتے ہیں، اور عطارد کا کردار قطب مشتری کے تمام کرداروں پر اپنی برتری ثابت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مختلف مواقع پر کرداروں کی زبانی غزلیں کہلوائی گئی ہیں، جس سے مثنوی کی دلکشی میں مزید اضافہ ہوگیا ہے، اور وجہی کا تخلیقی جوہر مزید نکھر آیا ہے۔ مثنوی کی زبان دکنی ہے، جس کو سمجھنے میں جا بجا دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ڈاکٹر حمیرا جلیلی نے اس دشواری کو کسی حد تک حل کردیا ہے۔ اس کے لیے مرتبہ نے آخر میں فرہنگ پیش کی ہے، جس میں مشکل الفاظ کے معانی حروف تہجی کی ترتیب سے درج کیے گئے ہیں، آخر میں ان کتابوں اور رسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن سے مرتبہ نے استفادہ کیا ہے۔

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

صفحات: 262، قیمت: 135 روپے

مبصر: عبدالباری قاسمی، C-145/1 گراؤنڈ فلور، طیب لین شاہین باغ، نئی دہلی-25

انسانی زندگی کا تصور کرتے ہی صحت وتندرستی اور بیماری کا بھی خیال ساتھ میں آہی جاتا ہے، صحت وتندرستی بہت ہی اہم چیز ہے، مشہور مقولہ ہے 'تندرستی ہزار نعمت ہے' یہ سو فیصد درست ہے، انسان ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہوتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کے اپنے سوچنے اور کام کرنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے بلکہ وہ پوری قوم اور سماج کے لیے بھی مفید اور معاون ہوتا ہے۔

'تیمار داری' کا بھی تعلق صحت اور تندرستی سے ہے، تیمار داری انگریزی کے Nursing کا ترجمہ ہے، نرسنگ یعنی تیمارداری کے بغیر علاج ومعالجے کا تصور ناقص اور نامکمل ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب مرض کو قہر خداوندی کا حصہ گردانا جاتا تھا اور بیماروں کو قابل عتاب وسزا قرار دے کر اس کی گردنوں کو تن سے جدا کردیا جاتا تھا مگر ظلم و بربریت کا خاتمہ ضرور ہوتا ہے، مصری تہذیب کی شکل میں انسانیت اور ہمدردی کا ظہور ہوا اور عبادت گاہوں کے پجاریوں نے تیمارداری کے فرائض انجام دینے شروع کیے، اس طرح نرسنگ اور تیمارداری کی ابتدا ہوئی۔

تیمارداری کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے، جب ہم اس کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے قدیم ہندوستان، چین، مصر اور یونان وغیرہ میں اس کی روایت بے حد قدیم رہی ہے۔

'تیمارداری' حسین فاروقی کی بہت قیمتی اور معلومات سے پر تصنیف ہے، کتاب میں انھوں نے جس انداز سے طب، امور طب، مرض، مریض اور طریقۂ علاج پر روشنی ڈالی ہے بے حد اہم ہے۔

اس کتاب میں حسین فاروقی نے تیمارداری، تیماردار، مریض، حرارت بدنیہ، نبض، بلڈ پریشر، عمل تنفس، قے، قبض، درد، ادویات کا استعمال، غسل، جلدی امراض، نظام ہضم، غذائی مادے، پیچش، نظام بولی، جنسی امراض، ملیریا، برانکائیٹس، دق، ٹیوبرکلوسس، ہیضہ، میعادی بخار، خسرہ، انفلوئنزا، اپنڈیکس وغیرہ موضوعات پر سہل انداز میں عمدہ گفتگو کی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے طبی اصطلاحات پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس میں انھوں نے ہر جگہ اردو اصطلاح کے ساتھ ساتھ انگریزی اصطلاح بھی درج کی ہے، اس سے بیماری کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ حرارت وغیرہ ناپنے کا طریقہ جدول بنا کر سمجھانے کی کوشش کی ہے، اس جدول کی مدد سے ہم فارن ہائیٹ اور سینٹی گریڈ کو آسانی سے سمجھنے کے ساتھ فارن ہائیٹ سے سینٹی گریڈ اور سینٹی گریڈ سے فارن ہائیٹ میں تبدیل کرنے کا طریقہ بھی سیکھتے ہیں۔

حسین فاروقی کا مطالعہ بے حد وسیع ہے، اس کا اندازہ مذکورہ کتاب پڑھ کر ہوتا ہے، اس کتاب میں تیمارداری (Nursing) کی ابتدا، ارتقا اور اس کے خدوخال کا بہت اچھے انداز میں جائزہ پیش کیا ہے، مصنف نے ارتقا کو بیان کرنے کے بعد تیمارداری کا جو ماحصل بیان کیا ہے اس میں چند امور بہت اہم ہیں۔ جیسے ''نرسنگ اور مذہب کا تعلق'' بہت ہی گہرا ہے، اسی کی بنیاد پر مذہبی رہنما انسانیت دوست کہے جاتے ہیں، دوسری چیز نرسنگ کی ابتدا کا موجب عورتوں میں پایا جانے والا 'جذبہ ہمدردی' ہے، لفظ نرسنگ کے معنی بھی پرورش کے آتے ہیں۔

تیمارداری (نرسنگ) بہت اہم اور جدوجہد والا فن ہے، عام طور پر طبیب کا کام صرف ہدایت دینا ہوتا ہے باقی دیگر مراحل تیماردار یعنی نرس کو ہی کرنے ہوتے ہیں۔ یہ کتاب اردو جاننے والے طبیب، معالج اور نرس کے لیے جہاں بہت اہم ہے وہیں معلومات حاصل کرنے اور طب کی بنیادی اصطلاحات اور عام بیماریوں کو سمجھنے کے لیے بھی کافی اہم ہے۔

حسین فاروقی نے بہت محنت اور عرق ریزی سے اس کتاب کی تصنیف کی ہے اس کا اندازہ اس کتاب کو پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ مصنف نے عملی انداز میں پوری کتاب تحریر کی ہے، جس مرض کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اس کے تمام خدوخال کو بیان کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ تدابیر علاج پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

امید ہے کہ کتاب سے اردوداں طبقے کو فائدہ ہوگا، اس کتاب کو پڑھ کر بیماریوں سے کیسے بچا جائے، سماج میں بیماری کو پھیلنے سے کیسے روکیں اور بیماروں کی کیسے مدد کریں یہ سب اہم چیزیں اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

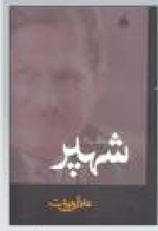

رنگ رنگ شہپر

مرتب: ڈاکٹر عادل حیات

صفحات: 576، قیمت: 334، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: سفیر صدیقی، مکان نمبر 561، گلی نمبر 22، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

موجودہ عہد میں اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کرنے والوں میں پروفیسر شہپر رسول کا نام سرِ فہرست رکھا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کا سحر تو ہر صاحبِ ذوق پر طاری ہے، لیکن ان کی نظمیہ شاعری بھی داد طلب کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہپر رسول کا شمار عہدِ حاضر کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے شعری اور ادبی کارناموں کا ایک زمانہ معترف ہے، لیکن اب تک ایسی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی تھی جس میں ان کی شخصیت اور ان کے کارہائے نمایاں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو دستاویزی شکل بھی دی گئی ہو۔ زیرِ نظر کتاب 'رنگ رنگ شہپر' ان کی شخصیت اور فن پر مشتمل ایسے خاکوں، مضامین، انٹرویوز اور تصاویر کا مرقع ہے جو اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر عادل حیات نے اس کی ترتیب میں برسوں محنت کی ہے اور اسے معیاری بنانے میں ہر ممکنہ کوشش کی ہے۔ اس کتاب کو 6 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

آئینۂ شہپر، غزل رنگ، افہام و تفہیم، بساطِ نظم، آہنگِ تکلم، عکس عکس ماضی

پہلا حصہ 'آئینۂ شہپر' شہپر رسول کی شخصیت سے متعلق خاکوں اور مضامین پر مشتمل ہے، جن میں 'عکس عکس شہپر' از تبسم حیات، 'قصہ شہپر رسول کا' از خالد محمود، 'شہپر رسول: شخص و عکس' از عظیم الشان صدیقی، 'سیلاب کو ناؤ بنانے والا شخص' از غضنفر، 'ریختہ کا اک نیا مجذوب: شہپر رسول' از شہزاد انجم، 'مرقع شہپر رسول' از عادل حیات اور 'شکل بھی بھلی پائی دل بھی آئینہ پایا' از جاوید نسیمی شامل ہیں۔ ان تمام تحریروں میں شہپر رسول کی شخصیت مختلف زاویوں سے روشن ہوتی ہے۔ تبسم حیات نے 'عکس عکس شہپر' کے عنوان سے شہپر رسول کے سوانحی کوائف اور کارناموں کو معروضی انداز میں جمع کر دیا ہے۔ خالد محمود کا خاکہ 'قصہ شہپر رسول کا' ایک دلچسپ اور شگفتہ خاکہ ہے۔

غضنفر صاحب کا خاکہ بھی شہپر رسول کی شخصیت اور ان کے مزاج کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ علاوہ ازیں عظیم الشان صدیقی، شہزاد انجم اور جاوید نسیمی کے مضامین بھی موصوف کی شخصیت کو مختلف زاویوں سے پیش کرتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'غزل رنگ' 39 مضامین پر مشتمل ہے جن میں شہپر رسول کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کیا گیا ہے۔ اس حصے کی خاص بات یہ ہے کہ مضمون نگاروں میں شہپر رسول کے اساتذہ اور ہم عصر ادبا کے ساتھ ساتھ ان کے شاگرد بھی شامل ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ اپنے مضمون 'غزل شہپر کی گہری ساخت' میں لکھتے ہیں:

''شہپر کی غزل کا تاثر اگر اپنے عہد کے حاوی رجحان سے مختلف ہونے کا احساس دلاتا ہے تو اس کی کچھ وجوہ بھی ہیں۔ سب سے پہلا تاثر تو یہی ہے کہ وہ کبھی اونچی آواز میں ہم سے کلام نہیں کرتی اور پہلی قرأت پر ہی ہم سے رسم و راہ پیدا کر لیتی ہے۔ دوسری، تیسری قرأت پر اس کے معنی کی گرہیں اور کھلتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ وہ ہمیں جتنا شریک بناتی ہے اتنی ہی اجنبی ہوتی چلی جاتی ہے۔''

اس کے علاوہ علیم اللہ حالی، قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، خالد محمود، علی احمد فاطمی، حسین الحق، کوثر مظہری، قیصر زماں، سہیل انجم اور نجمہ رحمانی کے ساتھ ساتھ عمیر منظر، فوزیہ رباب، مقیم احمد، شہواز فیاض اور خان محمد رضوان جیسے نئی نسل کے ادبا کے مضامین بھی شہپر رسول کی غزل گوئی کی مختلف جہات کو پیش کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ 'افہام و تفہیم' کے عنوان سے ہے جس میں شہپر رسول کی کچھ غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ حصہ اس لیے بھی نہایت اہم کہ دوسرے حصے میں شامل مضامین میں کیے گئے کچھ دعووں کی دلیل یہاں واضح طور پر نظر آتی ہے اور دوسرے یہ کہ تجزیہ نگاروں میں سہیل احمد فاروقی، کوثر مظہری، خالد جاوید، عادل حیات، ثاقب عمران اور صدف پرویز جیسے معتبر نام شامل ہیں۔

'بساطِ نظم' کے عنوان سے کتاب کے چوتھے حصے میں شہپر رسول کی نظموں پر فنی و فکری گفتگو کی گئی ہے۔ اس حصے میں سات مضامین شامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر خالد مبشر:

''عہدِ رواں میں قرطاسِ غزل پر شہپر رسول کا نام جلی قلم سے مرتسم ہو چکا ہے، لیکن میری نظر میں شہپر رسول نظم کے بھی اہم شاعر ہیں۔ لوحِ نظم پہ شہپر رسول کا اسم اس قدر روشن ہے کہ اس کی تابانیاں غزل کی ضیا پاشیوں سے کسی طرح کم نہیں۔''

عادل حیات کا مضمون 'نظم کا غزل گو شاعر: شہپر رسول' بھی نہایت اہم ہے۔ اس کے علاوہ مناظر عاشق ہرگانوی، مشیر احمد، شاداب تبسم، امتیاز احمد علیمی اور سعدیہ صدف نے شہپر رسول کی نظمیہ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔

پانچواں حصہ 'آہنگِ تکلم' کے عنوان سے ہے جس میں دو انٹرویو شامل ہیں، ایک شہپر رسول کا اور دوسرا ان کی اہلیہ رضوانہ شہپر کا۔ دونوں انٹرویو مرتب کتاب نے لیے ہیں۔ شہپر رسول کا انٹرویو جہاں انھیں کی زبانی ان کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھاتا ہے وہیں ان کے تعلق سے ان کی اہلیہ رضوانہ شہپر سے لیا گیا انٹرویو اس نوعیت سے اہم ہے کہ شہپر رسول کو جس طرح انھوں نے دیکھا ہے، کسی نے نہیں دیکھا۔ مزید یہ کہ اس انٹرویو سے شہپر رسول کی شخصیت کے وہ پہلو بھی نمایاں ہو جاتے ہیں جو عام طور پر ان کے مصاحب سے بھی پوشیدہ رہے ہیں۔

'عکس عکس ماضی' کے عنوان سے کتاب کے آخری حصے میں شہپر رسول کی کہانی تصویروں کی زبانی بیان کی گئی ہے، جو اس کتاب کو دستاویزی حیثیت عطا کر دیتی ہے۔

کتاب کی طباعت نہایت عمدہ اور تزئین دیدہ زیب ہے۔

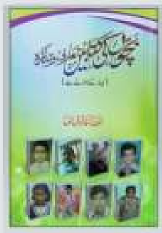

بچوں کی کتابیں: تعارف و تذکرہ

مصنف: عطا عابدی

صفحات: 160، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: عطا عابدی، محلّہ فقیرا خاں، اردو بازار، دربھنگہ

مبصر: ڈاکٹر اویناش امن، کالی مندر روڈ، ہنومان نگر، پٹنہ

اردو میں بچوں کے ادب کو ہمیشہ دوسرے درجے کا ہی تصور کیا جاتا رہا ہے لہٰذا بڑے قلم کاروں خصوصاً نقادوں نے بچوں کے لیے تحریر کردہ کتابوں یا ادب کو اپنی تنقید و تحقیق کا موضوع اکثر و بیشتر نہیں بنایا۔ اردو میں بچوں کے ادب کے بہت محدود مضامین رہے اور کہانیوں کا سرمایہ عربی اور فارسی کی قدیم داستانوں سے مستعار لینے کی روش عام رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بچوں کے لیے کچھ لکھا نہیں گیا، کئی سینئر رائٹروں نے مثلاً عبدالغفور شہباز، علامہ اقبال، کرشن چندر، سدرشن، جمیل مظہری، اوپیندر ناتھ اشک، شکیل الرحمٰن وغیرہ نے اس حوالے سے خوب خامہ فرسائی کی۔ جہاں تک بہار کا تعلق ہے چونکہ زیرِ نظر کتاب بہار کے حوالے سے ہے تو بہار میں بھی سینئر قلم کاروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے کل وقتی یا جز وقتی طور پر ادبِ اطفال کی تخلیق کی ہے۔ اول الذکر

کچھ ناموں کے علاوہ ناوک حمزہ پوری، رضوان احمد، علقمہ شبلی، احمد جمال پاشا، تمنا مظفر پوری، نادم بلخی، شبنم کمالی، ذکیہ مشہدی، قیصر زاہدی، سلطان آزاد جیسے ادب اطفال کے کئی اور بھی نمایاں نام ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی کو تو ادب اطفال کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی ملا۔ نئی نسل میں بھی خان محمد رضوان، منصور خوشتر، جمیل اختر شفیق، ثناء اللہ ثنا جیسے اور بھی کئی نام ہیں جو اس سلسلے میں متحرک ہیں مگر ان سب کے باوجود مجموعی طور پر اب بھی اردو میں ادب اطفال کے حوالے سے حوصلہ افزا صورت نہیں ملتی۔ تاہم حال کے برسوں میں بچوں کے ادب کی تخلیق پر توجہ بڑھی ہے۔

جس طرح بچوں کے ادب کی کیفیت اردو میں اطمینان بخش نہیں ہے اسی طرح بچوں کے ادبا اور ان کے سرمایوں پر بھی بحث اردو میں کم کم ہی ملتی ہے۔

اس افسوسناک صورت حال کی کچھ حد تک تلافی کی سمت میں اردو کے مشہور شاعر، ادیب اور دانشور عطا عابدی کی نئی کاوش بچوں کی کتابیں تعارف اور تذکرہ ایک مثبت قدم ہے۔

عطا عابدی اردو ادب کے ایک خاموش خدمت گار ہیں جو نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا کو زندگی کا آئیڈیل بنا کر ادب کی خدمت میں ہمیشہ پورے انہماک سے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ انھوں نے خود بھی ادب اطفال کی تخلیق کی ہے اور اس کے نشیب و فراز پر پوری نظر رکھتے ہیں۔

خوشبو خوشبو نظمیں اپنی اور مذاکرے مذکر و مونث کے بچوں کے لیے ان کی وہ کتابیں ہیں جو زیور اشاعت سے آراستہ ہو کر کافی مقبول ہو چکی ہیں۔

یہ کتاب خاص طور سے بہار کے حوالے سے ہے جس میں قدیم سے لے کر موجودہ کل 96 بچوں کے ادبا کے تذکرے مع ان کی خدمات کے موجود ہیں۔ ان کی فہرست تیار کرنے میں کتاب کے سال اشاعت کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی کتاب جو تذکرے میں آئی ہے وہ سنہ 1878 میں حکیم سید عالی قدر عبداللہ کی تصنیف کردہ ترکیب درست ہے۔ اسی نہج پر یہ ترتیب مختلف ادوار سے ہوتی ہوئی حال تک پہنچتی ہے۔ کتابوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت ان کے مصنفین کے احوال اور دیگر کتابوں کے نام بھی درج کیے گیے ہیں جس سے یہ کتاب اور بھی مفید ہو گئی ہے۔ یہ کام بنیادی نوعیت کا ہے اور اسے مکمل کرنے میں عطا عابدی تحقیق کے کئی صبر آزما منازل سے گزرے ہیں اور اس مشکل کام کو انجام دیا ہے۔ کتاب کی شروعات میں عطا عابدی نے ادب اطفال سے متعلق اپنے چار مضامین بھی بہ عنوان ادب اطفال: ایک تاثر، بچوں کی تربیت میں ادب کا وسیلہ، انسانی اقدار اور نصابی ادب اطفال اور بچوں کی کتابیں: چند اور باتیں بھی شامل کی ہیں۔ یہ تمام مضامین فکر انگیز اور معلوماتی ہیں۔ ان سے نہ صرف متعلقہ موضوعات کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں بلکہ ہمارے سامنے سوالات بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں عطا عابدی رقم طراز ہیں:

''ادب اطفال کی تخلیق آسان عمل نہیں ہے۔ جو لوگ اسے دوئم درجے کا ادب کہتے ہیں یا تنگ بندیوں سے تعبیر کرتے ہیں وہ یا تو بچوں کے ذہنی استعداد اور اس کے تقاضوں سے واقف نہیں ہوتے یا پھر ایک قلم کار ہونے کے ناطے ان پر بچوں کے لیے جو اضافی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، انھیں تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ بچوں یعنی کم عمر طلبا و طالبات کے لیے لکھتے وقت شاعر و ادیب کو اپنی توجہ بچے کی ذہنی سطح پر مرکوز کرنی پڑتی ہے تاکہ بچے کو نہ صرف ادب سے دلچسپی پیدا ہو بلکہ اس ادب میں پنہاں نصیحتوں سے بھی وہ فیضیاب ہو سکیں۔''

آج الیکٹرانک میڈیا کے دور میں بچوں کی کتب اور رسائل کے سامنے مزید نئے چیلنج درپیش ہیں لہٰذا قلم کاروں کو خود کی نئی ترجیحات کے مد نظر ادب اطفال کو اور بھی دلچسپ اور سود مند بنانے کی ضرورت ہے۔

ادب اطفال میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ کتاب حوالے کا کام کرے گی اس ناطے اسے ضرور پڑھا جانا چاہیے۔

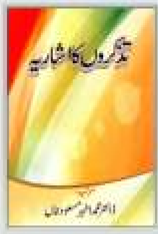

تذکروں کا اشاریہ

مرتب: ڈاکٹر اطہر مسعود خاں

صفحات: 302، قیمت: 500 روپے

مطبع: پرنٹو لوجی انک، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر ثمرین، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

اردو ادب کے خدمت گزاروں میں ڈاکٹر محمد اطہر مسعود کا نام بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے معاصرین میں نہ افسانہ نویسی، ادب اطفال، تحقیقی و تنقیدی کاوشوں اور مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کر کے اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔ اشاریہ ماہنامہ نیا دور، اشاریہ رضا لائبریری جرنل، اشاریہ میر انیس اور اردو مرثیہ، اشاریہ اردو افسانہ، اشاریہ اردو غزل وغیرہ بے شمار اشاریوں کے ذریعے اشاریہ سازی میں جو قابل قدر خدمات آپ نے انجام دی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

پیش نظر کتاب کے سبھی اشاریوں میں شاعروں کے نام کے کالم میں پہلے تخلص کو رکھا گیا ہے اس کے بعد ان کا پورا نام درج کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ تخلص اور اپنے نام کے پہلے حصے کو مشترک طور پر استعمال کرتے ہیں اس لیے ڈاکٹر اطہر مسعود نے اشاریے میں اس کا پورا خیال رکھا ہے اور اس طرح کے ناموں کو تخلص اور پورے نام کے بعد بریکٹ میں درج کر دیا ہے۔ کچھ لوگ اپنے تخلص اور نام کے بجائے کسی اور نام یا خطاب سے بھی مشہور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اطہر مسعود نے ان کے قلمی نام یا خطاب کو بریکٹ میں رکھ دیا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کچھ لوگ صرف تخلص سے مشہور ہوتے ہیں اور عام لوگ برسوں تک ان کے اصلی نام سے واقف نہیں ہوتے اور کچھ لوگ اپنے تخلص و نام دونوں سے مشہور ہوتے ہیں اس لیے اس اشاریے میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جو ادیب و شاعر عوام و خواص میں جس نام سے زیادہ مشہور ہیں اسی نام کو اشاریے میں درج کیا جائے۔

'تذکروں کا اشاریہ' جیسا کہ کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے اس کتاب میں مختلف تذکروں کے اشاریے موجود ہیں۔ زیر نظر اشاریہ بھی بنیادی طور پر تو ڈاکٹر عرفان عباسی صاحب کے تذکروں کا ہی بنایا تھا لیکن جب اس کام کا آغاز کیا تو محققین کی سہولت کے پیش نظر کچھ اور تذکرے بھی اس میں شامل کر لیے، اس طرح اس میں 'تذکرہ ارباب اردو: تحریر و تصویر کے آئینے میں' کے اشاریے کو بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا یہ تذکرہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے اور اسے ڈاکٹر عرفان عباسی کی بیٹی اسما رفعت نے ترتیب دیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں اول نمبر پر مالک رام صاحب کے 'تذکرۂ معاصرین' کو رکھا گیا ہے۔ تذکرۂ معاصرین کا یہ اشاریہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کے سہ ماہی رسالہ 'فکر و تحقیق' میں جولائی ستمبر 2018 میں شائع ہو چکا ہے۔ جس میں قلم کاروں کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے ساتھ ساتھ مقامات بھی درج ہیں۔

اس کتاب میں 'تذکرہ ارباب اردو' کی خصوصیت یہ ہے کہ اسما رفعت حسین نے بیشتر ان قلم کاروں کا تعارف و تذکرہ لکھا ہے جو ابھی بقید حیات ہیں اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادیب و شاعر دونوں شامل ہیں اور ادیبوں میں بھی ناول نگار، افسانہ نگار، تنقید نگار، مترجمین، محققین اور صحافی، غرض ادب کے تعلق سے سبھی لوگوں کو شامل کیا گیا

ہے۔ایک اور خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس میں سبھی ادیبوں اور شاعروں کے سوانحی وادبی تعارف کے ساتھ ہی ان کی تحریر کے نمونے یعنی عکس تحریر اور تصاویر کو بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اطہر مسعود نے 2017 میں 'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' ترتیب دیا تھا تو عباسی صاحب کے تذکرہ 'آپ ہیں' کی 6 جلدوں کی تفصیل، ان کی کتابوں کے ساتھ پیش کی تھی لیکن اب 'آپ ہیں' کا اشاریہ بناتے وقت معلوم ہوا کہ اس کی جلد نمبر 7 اور 8 بھی شائع ہو چکی ہیں اس طرح اس کتاب میں آٹھوں جلدوں کا اشاریہ موجود ہے۔

ڈاکٹر عرفان عباسی کا ایک اور تذکرہ 'آپ تھے' کے نام سے ترتیب دیا تھا، یہ تذکرہ تین جلدوں پر مشتمل ہے، مذکورہ تبصرے کی تین جلدیں ہیں لیکن بار ہا کوشش کے باوجود تیسری جلد نہیں مل سکی جس کا اعتراف کتاب میں کیا گیا ہے اس لیے دو جلدوں کا اشاریہ ہی شامل کیا گیا ہے۔ عباسی صاحب کا ایک اور تذکرہ 'آپ' کے نام سے بھی ہے اور یہ صرف ایک ہی جلد پر مشتمل ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کو بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

اسما رفعت حسین نے ایک اور تذکرہ 'تذکرہ شعرائے سیتاپور' کے عنوان سے مرتب کیا ہے اس میں بھی بہت سے شعرا شامل ہیں اس تذکرے کی اہمیت اور اسکالرز کی سہولت کے پیش نظر ڈاکٹر اطہر مسعود نے اسے بھی اس اشاریے میں شامل کرلیا ہے۔ عرفان عباسی نے ایک تذکرہ 'نثر نگاران اردو' بھی ترتیب دیا تھا۔ یہ تذکرہ بھی نہایت جامع اور بہترین تذکرہ ہے اور کئی سو قلم کاروں کے سوانحی حالات اور ان کی ادبی خدمات پر مشتمل ہے۔

وصی سیتاپوری نے بھی تحقیق اور تذکرہ نگاری میں اچھا کام کیا ہے ان کا تذکرہ کئی سو شعرا کے احوال و آثار اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے اور اس کا نام 'تذکرہ غیر مسلم شعرائے اردو سیتاپور' ہے۔ یہ تذکرہ اختصار اور جامعیت کے فن کا ایک خوب صورت نمونہ ہے اور اس کا اشاریہ بھی کتاب میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ اہمیت کا حامل ہے۔ 'دبستان امیر مینائی' کے نام سے عرفان عباسی نے امیر مینائی کے تلامذہ کا ایک جامع اور دستاویزی تذکرہ مرتب کیا ہے۔ یہ کافی ضخیم ہے اور اس میں کئی سو شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔ اس تذکرے میں عباسی صاحب نے امیر مینائی کی سوانح بھی تحریر کی ہے اور ان کی شاعری کے حوالے سے اور نجی زندگی کے تعلق سے بھی بہت سی ضروری باتیں تحریر کی ہیں۔ 'دبستان امیر مینائی' میں امیر مینائی کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب امیر مینائی اور ان کے تلامذہ کے تعلق سے ایک بے مثال دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اشاریہ سازی پر مشتمل ڈاکٹر اطہر مسعود کی یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ اشاریہ سازی پر نہ یہ پہلی کتاب ہے اور نہ آخری لیکن کسی تذکرے کو اشاریے کی شکل میں پیش کرنے کے لحاظ سے یہ کتاب منفرد ضرور ہے جس کی ترتیب میں کئی سال صرف کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب قارئین کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسکالرز کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی اور اس کتاب کے وسیلے سے اسکالرز کم وقت میں زیادہ مواد تک رسائی حاصل کرسکیں گے۔

ارباب ادب

مصنف وشاعر: امیر نہٹوری

صفحات: 368، قیمت: 221 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: جے این کے پبلی کیشنز، بڈگام، جموں کشمیر

مبصر: مرغوب علی 49 دھرم داس، نجیب آباد 246763، بجنور (یوپی)

امیر نہٹوری کا پہلا شعری مجموعہ 'جاگتے منظر' اردو اور ہندی میں 2013 میں شائع ہوا تھا۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ 'یہ جہاں وہ نہیں' 2017 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے شائع ہوا۔

زیر تبصرہ 'ارباب ادب' ان کی نثری کاوشوں کا مجموعہ ہے جو فروغ اردو کے جزوی مالی تعاون سے 2021 میں GNK Publications Budgham Jpeg&K کے ذریعے شائع ہوا۔

امیر نہٹوری نے 15 سال کی عمر میں 1983 میں شاعری شروع کی تھی آنے والے وقت میں ان کے چار مجموعے ان کے پڑھنے والوں کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ زیر تبصرہ کتاب بہت سے ابواب پر مشتمل ہے جن میں کچھ یہ ہیں۔

اعزازات: سلسلۂ نشر و اشاعت، شائع افسانے مضامین، غزلیں۔

میری مطبوعہ و غیر مطبوعہ کاوشیں، اپنی کہانی اپنی زبانی، نہٹور کی تاریخی حیثیت، دانشوران نہٹور کی شہرت یافتہ شخصیتیں اور نہٹور سے وابستہ عہد نو کے شعرا۔ اس کے بعد مختلف مضامین 'ادب میں عشق کی اہمیت افادیت و معنویت'، 'خدائے سخن میر تقی میر' کی شاعرانہ عظمت' غالب کے کلام کی اصل روح استفہامیہ انداز' ڈپٹی نذیر احمد، اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال، قمر مراد آبادی، اختر الایمان، انقلابی شاعر حبیب جالب، نشتر خانقاہی، دشینت کمار تیاگی، وشال کھلر، ضلع بجنور کا تاریخی جغرافیائی پس منظر، ضلع بجنور سے شائع ہونے والے قدیم وجدید جرائد وخبر نامے، وہ سخنوران جن سے نسبتیں رہیں، مجتبیٰ حسین شخصیت وفن' اور 'ہندوستان میں اردو زبان کا عروج، زوال اور مستقبل۔

یہ اتنا بہت سا مواد اس کتاب میں سمایا ہوا پڑھنے والے کو یہ آزادی دیتا ہے کہ اس کا جب جی چاہے علامہ اقبال، غالب، میر، اسماعیل میرٹھی، اختر الایمان، نشتر خانقاہی، اور دشینت کمار، یا کہیں سے بھی صفحہ پلٹے اور معلومات کی وادیوں کی سیر کرلے۔ علامہ اقبال پر دونوں مضامین گہری سوچ اور فکر کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں۔ غالب کے استفہامیہ انداز، اسماعیل میرٹھی، قمر مراد آبادی اور وشال کھلر پر امیر نہٹوری کا نقطۂ نظر تنقیدی ہونے کے ساتھ تحقیقی بھی ہے۔

اپنی کہانی اپنی زبانی نہٹور کی تاریخی حیثیت، دانشوران نہٹور کی شہرت یافتہ شخصیتیں اور نہٹور سے وابستہ عہد نو کے شعرا و ادبا یہ کئی حصوں میں بٹا ہوا مضمون ہر چند کہ نہٹور کی روح کو ہی اجاگر کر رہا ہے مگر اس کے بہانے سے کئی واقعات اور اشخاص کے بارے میں کچھ نہ کچھ نیا بھی مل جاتا ہے۔ نہٹور کی ایک طرحی نشست'' اپنے اندر بہت سے شعرا کے قد و قامت کو اکابر کے درجے تک لے جانے کی کوشش ضرور ہے لیکن کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔

ادب میں عشق' کتاب کا بہت بامعنی مضمون ہے اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کے نظریات کو سمیٹے ہوئے۔ ''عشق کی اہمیت، افادیت اور معنویت'' کو ذہن پر ایسے پھیلا دیتا ہے جیسے زمین پر ہری ہری گھاس، جس سے ٹھنڈک اور سکون کا احساس جاگتا ہے۔

اس مضمون میں بہت سے فلاسفروں نے عشق کے بارے میں اپنے اپنے بیان جاری کیے ہیں 'اردو زبان کا المیہ' ایک دردمند اور حساس اردو داں کے قلم سے نکلی ہوئی ایسی تحریر ہے جسے ایک سے زیادہ بار پڑھا جانا چاہیے اور اس مضمون میں کئی نکتے ایسے ہیں جو دیر تک سوچنے اور عمل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

'اردو ادب میں خواتین کا کردار' مضمون میں لکھنے والے نے زیادہ محنت نہیں کی اور فارسی شاعرات سے کام چلانے کی کوشش کی ہے۔

میر تقی میر پر لکھتے ہوئے امیر نہٹوری لکھتے ہیں:

میر کا انداز سخن اس لیے بھی مقبول اور پسندیدہ ہے کہ میر کے یہاں صداقت اور خلوص بے تکلفانہ استعمال ہوا ہے''۔ یعنی میر نے جو کچھ کہا خلوص، صداقت اور بے تکلفی کے انداز میں کہا۔

ابتدا ہی میں مرگئے سب یار
عشق کی کون انتہا........لایا

اس مضمون میں بہت سے شعرا کے مضمون بھی درج کیے ہیں جن میں میر کی استادی کا اعتراف ہے اور اس اعتراف نامہ میں بہت سے عمدہ عمدہ شعر اور ایسے بھی شعر درج ہو گئے ہیں جو عام لوگوں کی نظر سے نہیں گزرتے یا گزرے ہوں گے۔

اختر الایمان پر مضمون عام مضامین سے بچ کر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا مگر نہیں لکھا گیا۔ جبکہ نشتر خانقاہی، حبیب جالب اور دشینت کمار پر نئے پڑھنے والوں کے لیے خاصا مواد ہے۔ ضلع بجنور کے حوالے سے کچھ شعرا و ادبا کے مختصر فن اور شخصی خاکے بھی کتاب میں ہیں۔ بجنور سے نکلنے والے اخبارات وغیرہ اور بجنور کی تاریخ اس بہانے محفوظ ہو گئی۔ یہ کام بہت لائق داد ہے اور امید ہے کہ اس کتاب سے بہت سے لوگوں کو اپنے قریب کے مناظر، شاعروں اور قصبوں کو جاننے کی خوشی ملے گی۔ امیر نہٹوری میں تحقیق کا مادہ ہے ممکن ہے آئندہ وہ کوئی بڑا تحقیقی کام کر کے تبصرہ نگار کی امید کو سچ ثابت کر دیں۔ کتاب اچھے کاغذ اور بہترین گیٹ اپ کے ساتھ 221 روپے میں امیر احمد خان امیر نہٹوری رحمت کالونی (بی/ 13) کھتریان بجنور، (یوپی) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

تاریخ

تاریخ کے دریچے سے

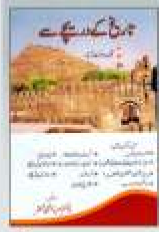

امیر خسرو سے ساوتری بائی پھلے تک

مصنف: ڈاکٹر مرزا محمد خضر

صفحات: 164، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: مرزا فیضان علی

ڈاکٹر شہاب افسر خان، ڈائریکٹر و نجسٹر انٹرنیشنل انگلش اسکول

تاریخ کے دریچے سے' ڈاکٹر مرزا محمد خضر کی چھٹی کتاب ہے جو 2021 میں شائع ہوئی ہے اس سے قبل ان کی جدید بھارت و چین، اورنگ آباد کی فصیلیں اور دروازے، اورنگ آباد تاریخ کے آئینے میں، تاریخ کے جھروکے سے اور سلطانہ چاند بی بی جیسی تاریخی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور کافی مقبول ہوئی ہیں۔ پیش لفظ ڈاکٹر مجید بیدار نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں 18 مضامین ہیں۔ کتاب کے تمام مضامین یا تو ہندوستان کے موقر رسالوں یا اخبارات کے ادبی صفحوں میں شائع ہو چکے ہیں یا آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں نشر ہو چکے ہیں۔

پہلا مضمون قلعہ دولت آباد ہے جس میں مصنف نے اس قلعے کو 'مرکز سیاست ہی نہیں بلکہ تہذیب و تمدن و علوم و فنون کا گہوارہ' کہا ہے۔ اس قلعے کی تعمیر 1187 میں راجہ بھلم نے کروائی تھی اور اس کا نام قلعہ دیوگری رکھا تھا۔ راجہ رام دیو کے زمانے میں علاء الدین خلجی کے اس پر حملے اور فتح مال و دولت کی دہلی منتقلی، اسے اپنی سلطنت میں ضم کرنے کی تاریخ نہایت ہی دلچسپ انداز میں درج کی گئی ہے۔ علاء الدین خلجی کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے قطب الدین مبارک شاہ کے ہرپال دیو کی بغاوت کو کچلنے اور دیوگری کا نام بدل کر شہر قطب آباد رکھنے کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ امیر خسرو اسی زمانے میں یہاں آئے تھے۔ اس مضمون میں محمد تغلق کی آمد اور اس کا دہلی سے دیوگری آ کر اپنا دارالسلطنت یہاں منتقل کر کے اس کا نام دولت آباد رکھنا درج ہے۔ اس کی تاریخ آگے بڑھاتے ہوئے علاء الدین حسن بہمنی کا دولت آباد کا نام بدل کر فتح آباد رکھنا، بعد اس کے دولت آباد احمد نگر کی نظام شاہی کا حصہ بنا، اسے مغلوں کو سونپنا اور آخر میں آصف جاہی ریاست کا حصہ بننا آپ کو تفصیل سے ملتا ہے۔

دوسرا: امیر خسرو کی قلعہ دولت آباد پر مثنوی 'صحیفۃ الاوصاف' حضرت امیر خسرو پر یہ ایک جامع مضمون ہے۔ مصنف رقم طراز ہے کہ ''ایک عظیم قصیدہ گو، ایک عظیم مثنوی نگار، ایک عظیم نثر نگار، ایک عظیم ماہر فن موسیقی، اور حضرت نظام الدین اولیا کے ترک اللہ تھے'' انھوں نے سات بادشاہوں بلبن، کیقباد، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، مبارک قطب الدین خلجی، غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق کے دور حکومت دیکھے اور پانچ بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ امیر خسرو کے پانچ دیوان، پانچ تاریخی مثنویاں، پانچ مثنیات، پنج گنج لکھی اور دیوان غزلیات فارسی ادب کا بے نظیر حصہ ہے۔

تیسرا: امیر حسن سنجری کی قلعہ دولت آباد پر مثنوی: امیر حسن سنجری حضرت نظام الدین اولیاء کے پسندیدہ مرید تھے۔ وہ امیر خسرو کے ساتھ جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کے دربار سے وابستہ تھے۔ حضرت امیر حسن سنجری کو ان کے کلام بلاغت، کلام کی نزاکت، شوخی اور تغزل کی بنا پر سعدی ہند کہا گیا۔

ان کی دولت آباد پر مثنوی امیر خسرو کی مثنوی کی طرح دل آویز ہے۔ کہتے ہیں۔

زہے خرم بنائے دولت آباد   کہ ہم بر پائے دولت یافت بنیاد

چوتھا: محمد جان قدسی عرف مولانا جامی کی مثنوی قلعہ دولت آباد پر: محمد جان قدسی عرف مولانا جامی مشہد ایران سے شاہجہان کے دور حکومت میں چلے آئے تھے۔ انھوں نے دولت آباد قلعہ پر 120 اشعار کی خوبصورت مثنوی کہی تھی۔ اس کا پہلا شعر حسب ذیل ہے۔

در ایام خورداد و اردی بہشت   زند دولت آباد دم و ز بہشت

(فروری اور مارچ یعنی موسم بہار میں، بہشت کے ایام میں دولت آباد کی زمین بہشت کا نمونہ معلوم ہوتی ہے)

پانچواں: بابر کی مثنوی: رسالہ والدیہ نقشبندی تصوف پر عظیم تحقیق: بابر کی مثنوی، جو 243 اشعار پر مشتمل ہے مثنوی کے تمام محاسن و شرائط پر بہت احسن انداز پر مکمل اترتی ہے۔

چھٹا: بابر: عظیم شاعر و ادیب، سوانح نگار، وقائع نگار و، مورخ، نقشبندی متصوف: 'ظہیر الدین محمد بابر' کے عنوان سے ہے۔

ساتواں: ''دکن میں خانقاہی نظام: دکن میں صوفیائے عظام کا سب سے بڑا پہلا مرکز دیوگیر دولت آباد (آج کا خلد آباد) دوسرا گلبرگہ، پھر بیجاپور، حیدرآباد و غیرہ مراکز بنے جہاں بزرگان دین نے علم و ادب سے ارشاد و تلقین اور رشد و ہدایت سے دین کی انسان دوستی اور انسانیت نوازی اور محبت کی شمع فروزاں کی تھی۔''

آٹھواں: دور جدید کے ماہر تعلیم صوفی تقدس مآب حضرت سید محمد محمد الحسنی کی خدمات: دور جدید میں اس زمرہ میں ماہر تعلیم صوفی تقدس مآب حضرت سید محمد محمد الحسنی کا نام پہلے آتا ہے۔

نواں: سلطانہ چاند بی بی: سلطانہ چاند بی بی پر مصنف نے ایک الگ سے کتاب شائع کی ہے۔ وہ دلیر شہزادی جس نے مغلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اس کی وفات پر کوئی مورخ قطعی بات نہیں کر سکا کہ اس کی موت کیسے ہوئی تھی؟

دسواں: اورنگ زیب کی معاشی اصلاحات۔

گیارہواں: غالب کا انداز بیاں اور ہمارے نوجوان: دنیائے ادب میں یہ اعزاز صرف غالب کو حاصل ہے کہ ان کا شعر جتنی بار پڑھا جائے، معنی کی اتنی گرہیں کھلتی جاتی ہیں کہ بقول غالب صد فیصد سچ ہے کہ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے   جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

بارہواں: مولانا غلام علی آزاد بلگرامی: مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے عربی و فارسی میں نظم و نثر، وقائع و تاریخ نگاری، تذکرہ نویسی، سیاست اور مختلف النوع اصناف سخن

میں اپنے افکار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

تیرہواں: چھترپتی شیواجی مہاراج: صحیح تصویر: چھترپتی شیواجی مہاراج نے کم عمری میں پونے کی اپنی چھوٹی سی جاگیر کو آزاد و فلاحی ریاست میں بدل دیا تھا۔ پینتالیس سال کی عمر میں 1674 میں قلعہ رائے گڑھ میں ان کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ چھترپتی شیواجی مہاراج مسلم مخالف نہیں تھے بلکہ ان کی فوج، انتظامیہ، اور محافظ دستوں میں کافی تعداد میں مسلمان شریک تھے۔ شیواجی کو ان کی جاں نثاری اور ایمانداری پر مکمل اعتماد تھا۔

چودہواں: مہاتما جیوتی راو پھلے: مہاتما جیوتی راو پھلے نے ہندو سماج کے ذات پات کے تفرقے کے خلاف آواز اٹھائی اور ستی کی رسم کو قانونی طور پر بند کروایا اور لڑکیوں کے لیے اسکول کھلوائے۔ ان کے ان سماجی کاموں میں ان کی شریک حیات ساوتری بائی پھلے شانہ باشانہ ان کے ساتھ کھڑی رہی اور مہاراشٹرا کی پہلی خاتون ٹیچر بنی۔

پندرہواں: ساوتری بائی پھلے: دیار ہند کے جدید دور کی وہ عظیم خاتون تھیں جو اپنی انقلابی تعلیمی سرگرمیوں اور سماجی اصلاحات کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

سولہواں: نورا مادن نور: آزادی ہند کے لیے انگریزوں سے لڑتے ہوئے ٹیپو سلطان نے جام شہادت نوش کیا تھا، اسی کی نسل سے تعلق رکھنے والی 'نور' انگریزوں اور فرانسیسیوں کے لیے دوسری عالمگیر جنگ میں ناقابل یقین جاسوسی کی خدمت انجام دیتے ہوئے قتل کی گئی۔

سترہواں: قربان حسین —— بھولا ہوا شہید وطن: آزادی ہند کی خاطر جن نوجوانوں نے اپنے آپ کو قربان کیا ان میں ایک 22 سالہ نوجوان عبدالرسول قربان حسین تھا۔ وہ شولا پور میں 1910 میں پیدا ہوا تھا اور انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے اس کو 22 سال کی عمر میں پھانسی دی گئی۔

اٹھارہواں: راج رشی شاہو راج مہاراج: ہندوستان کی تاریخ میں مہاراشٹر کی ایک چھوٹی سی ریاست کولہا پور کے حکمران شاہو مہاراج نے اپنی زندگی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردی تھی جس کی مثال و نظیر کہیں نظر نہیں آتی۔ ان کا قائم کردہ مسلم ہاسٹل دسہرہ چوک، کولہاپور میں آج بھی موجود ہے جہاں رہنے کے لیے معمولی رقم لی جاتی ہے۔

مختصراً یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ یہ تاریخ پر لکھی ہوئی جامع کتاب ہے جسے ایک عام قاری بالیقین اپنی لائبریری کی زینت بنانا پسند کرے گا۔

شاعری

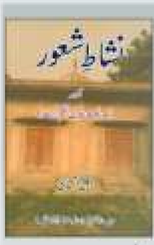

نشاط شعور

شاعر: بیکل اتساہی،

ناشر: ڈاکٹر رضوان الرضا

صفحات: 264، قیمت: 230 روپے

مبصر: محمد یوسف رضا، B-276، گلی نمبر 6، سبھاش محلّہ، نارتھ گھونڈہ، دہلی۔ 53

زیر نظر شعری مجموعہ ایک ایسے شاعر کا فکری نتیجہ ہے، جس کے مزاج میں انکساری اور مہمان نوازی تھی۔ ہندوستان و پاکستان کے تمام رسائل میں، جس کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ حسان الہند محمد شفیع خاں لودھی المعروف بیکل اتساہی کے اس مجموعے میں، جس کا نام 'نشاط شعور' ہے حمد، نعت، غزل، نظم اور گیتوں کے علاوہ قطعات، منقبت، دوہے، اور متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں شامل زیادہ تر کلام غیر مطبوعہ ہے۔ 'نشاط شعور' سے قبل بیکل اتساہی کا کلیات جناب فاروق ارگلی صاحب نے مرتب کرکے فرید بک ڈپو نئی دہلی سے شائع کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی کچھ کلام رہ گیا تھا جو غیر مطبوعہ تھا۔ اس کلام کو ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان (علیگ) نے نشاط شعور کی شکل میں شائع کرکے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔

حکومت ہند نے بیکل اتساہی کو 'پدم شری' کے اعزاز سے نوازا۔ بیکل اتساہی ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف اور سیاستداں بھی تھے۔ ہندی لب و لہجہ ان کی شناخت بنا رہا۔ بیکل اتساہی نے اپنے شعری سفر کا آغاز 1944 میں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بیکل اتساہی نے اپنی پہلی غزل اصغر گونڈوی کے ایک مصرع پر کہی تھی۔ بقول ڈاکٹر مشاہد رضوی، بیکل اتساہی کی نعتوں، سلام، مناجات، قصائد، نظموں، غزلوں، اور گیتوں میں فطری مناظر سے والہانہ شیفتگی اور لگاؤ پایا جاتا ہے۔ بیکل اتساہی عہد حاضر کے اس مہان بھارتیہ شاعر کا نام ہے، جن کے نطق سے بیک وقت خسرو، جائسی، تلسی، کبیر، میر اور رسکھان کی سرلہری سنائی دیتی ہے۔ بیکل اتساہی کا طرز بیان دیس کی مٹی سے عقیدت، دیس واسیوں سے محبت، پاکیزہ انسانی جذبوں، اور محسوسات کی مرقع آفرینی اور سماج میں پھیلی ناانصافی، نابرابری اور ظلم و استحصال کے خلاف صدائے حق بن کر رسیلے نغموں میں ڈھل جاتا ہے۔"

گیتوں کو ادب کے دائرے میں نہیں رکھا جاتا لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ گیتوں کا کوئی مقام نہیں۔ مجروح، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر جیسے شعرا نے گیت لکھ کر یہ ثابت کردیا کہ اگر گیت ادب میں شامل نہیں ہیں تو ادب سے باہر بھی نہیں۔ بیکل اتساہی نے گیت لکھ کر اچھی شاعری کی مثال پیش کی۔ بیکل اتساہی مذہبی لباس میں نظر آتے تھے۔ ان کی شخصیت میں مذہبی رنگ غالب رہا۔ اس کتاب کی ابتدا میں شامل حمد کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اے خدا تیرا کرم راہ کو منزل کردے   ڈوبتی ناؤ کے منجدھار کو ساحل کردے
تیرے مخصوص جو بندے ہیں زمانے بھر میں   مجھ کو بس ان کے غلاموں ہی میں شامل کردے
آخری دم ترے محبوب کی چوکھٹ پہ کٹے   اپنے بیکل کو یہی زیست کا حاصل کردے

اس کے علاوہ اس مجموعے میں بچوں کے لیے بھی مناجات شامل ہے۔ اس مناجات میں خدا سے بچوں کو دعا کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس میں اخلاقیات کا درس شامل ہے۔ ماں باپ کی خدمت کرنے کا جذبہ، اپنے وطن سے محبت کا جذبہ اور برے لوگوں سے دور رہنے کا جذبہ جو بچوں کے دلوں میں ہے وہ بچے رب کے حضور پیش کررہے ہیں۔ کچھ اشعار اس مناجات سے ملاحظہ ہوں۔

کتاب زندگی یارب پڑھا دے   دیا چھوٹا ہوں میری لو بڑھا دے
خدایا میں کروں خدمت جہاں کی   کروں عزت ہمیشہ باپ ماں کی

اس قبیل کے اور بھی اشعار اس میں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ایک نظم جس کا عنوان 'کلکتہ' ہے میں انھوں نے کلکتہ سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک شعر کہتے ہیں۔

پہلی جہاں سے اردو وہ ہے یہی کلکتہ   دل کو لبھائے گیسو وہ ہے یہی کلکتہ

اس مجموعے میں کل 28 قطعات شامل ہیں جن میں اکثر غیر مطبوعہ ہیں۔

دوہوں سے متعلق بات کی جائے تو سب سے پہلے امیر خسرو نے دوہے لکھے۔ جدید شعرا میں سب سے پہلے سرشار نے دوہے لکھے (بقول ڈاکٹر شاہد میر)۔ اس کے بعد بہت سے شعرا نے دوہے لکھے۔ لیکن اردو دوہے کے حوالے سے جن کا نام معتبر ہے وہ جمیل الدین عالی ہیں۔ انھوں نے اردو میں دوہوں کو استحکام بخشا اور بہت سے دوہے لکھ کر اس فن کو آگے بڑھایا۔ جمیل الدین عالی کے بعد ایک معتبر نام بیکل اتساہی کا ہے جنھوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

بیکل اتساہی نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ دوہوں میں بھی اپنے منفرد اسلوب نگارش

سے ایک نئی راہ تلاش کی۔ انھوں نے دوہوں میں اپنے مزاج کے اعتبار سے رنگ آمیزی کی ہے۔ چند دوہے پیش ہیں۔

پیغمبر کا قول ہے جگت ہے اک پریوار   پیار پڑوسی سے کرو سکھی رہے سنسار
جیت نہ پائی من کبھی برچھی اور کٹار   سب کا سیس جھکائے ہے اخلاق و کردار

میں اس مجموعے کی اشاعت پر جناب ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان (علیگ) کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بہر طور یہ مجموعہ 'نشاطِ شعور' قابل قدر ہے اور امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے پذیرائی ملے گی۔

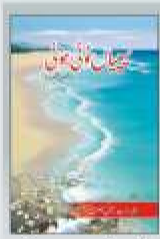

سیپیاں ٹوٹی ہوئی

شاعرہ و ناشر: ایم اے کنول جعفری
صفحات: 256، قیمت: 158 روپے، سنہ اشاعت: 2021
مبصر: محمد احمد دانش رودانوی، کاشانۂ گلزار، تاج کالونی نزد تاج پیلس پوسٹ راجہ کا تاجپور، ضلع بجنور (یوپی) 246735

ایم اے کنول جعفری کا زیر تبصرہ شعری مجموعہ بعنوان 'سیپیاں ٹوٹی ہوئی' موصوف کی غزل کا مطلع

رقص کرتی ہیں جہاں دلچسپیاں ٹوٹی ہوئی   آؤ اس ساحل پہ ڈھونڈیں سیپیاں ٹوٹی ہوئی

کے مصرع ثانی سے مستعار ہے، اس میں زندگی بطور استعارہ بہ شکل 'سیپی' برتتے ہوئے زندگی کے مختلف مراحل خوشیاں، غم، رنج و راحت، شکست و ریخت اور عزم و حوصلے کے ساتھ بار بار شخصی وجود کے ٹوٹنے، بکھرنے، سمٹنے اور سنورنے کے عمل کی کارفرمائی دکھانے کی کوشش کی ہے، جس میں موصوف کامیاب و کامران بھی رہے ہیں کہ زندگی مانند 'سیپی' ایسی قیمتی شے ہے، جس میں گوہر و موتی جیسی نایاب اور بیش قیمت جنس نشوونما پاتی ہے۔ زندگی کے قالب میں امداد باہمی، ہمدردی، غمگساری، ایثار و رواداری، اُنس و اخوت اور پیار و محبت جیسے قیمتی گوہر پلتے ہیں۔ انھیں قدروں کی آبیاری کے محور میں ہماری زندگی سیپیوں کی مانند ٹوٹتی بکھرتی رہتی ہے۔

کھینچ دیں قسمت نے دیواریں گھروں کے درمیاں
ڈھونڈتا رہتا ہوں آنگن سرحدوں کے درمیاں
خون سے ہر روز ہو جاتی ہیں کتنی سڑکیں سرخ
روز آجاتا ہے کوئی حادثوں کے درمیاں
پاس دینے کو نہیں کچھ بھی تو پھر اتنا کریں
آؤ کچھ وعدے ہی بانٹیں مفلسوں کے درمیاں

کنول جعفری کی شاعری میں بادِ نسیم کی وہ سرسراہٹ بھی ہے جو غنچوں کو چٹکا کر کھلا دیتی ہے۔ یہی بادِ نسیم سبزہ و گل سے ٹکرا کر وقت سحر موسم میں بھینی بھینی خوشبو سے عطر بیزی کر موسم کو خوش گوار بناتی ہے، تو دوسری طرف خزاں رسیدگی کا عمل گلچیں بن کر پیڑ پودوں سے برگ و بار اور گلوں کی پنکھڑیاں نوچ کر باغ کو ویران بنا دیتا ہے۔ تلاطم کشتی کو دوشِ ساحل سے ہمکنار کرتا ہے تو کشتی فطرتاً اپنے عزم و حوصلے کے سبب پھر طوفان سے الجھ پڑتی ہے۔

دھکیل دیتا ہے طوفان اس کو ساحل تک   وہ کشتی خود کو تلاطم کے پاس کرتی ہے

ظاہر اور باطن کے تضاد کی جانچ پرکھ کا عمل بھی اُن کے تجربات و مشاہدات میں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جسے وہ رہبر و قاضی کی ریاکاری اور عملی تفاوت میں دیکھنے کی کامیاب سعی و کاوش کرتے ہیں۔

وہ قاضی جس کو وفاداریاں نبھانی ہوں   اسی کے چہرے سے نامنصفی جھلکتی ہے

بیان و اظہار کا ندرت و بانکپن اور حسن نہ صرف اُن کے ذوق جمالیات اور اظہار جمالیات کا ضامن ہے، بلکہ اُن کے فن میں تغزل کے رنگ و آہنگ کا آئینہ دار بھی ہے۔ اُن کے یہاں رنگ تغزل، اظہار جمالیات، ندرت و اظہار کے ساتھ سہل ممتنع میں جو رمز و ایمائیت ہے، وہ اُن کی شاعری کو اظہار جمالیات سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ اُن کے یہاں تشبیہ و استعارے میں جو لطیف اشاریت و ایمائیت دیکھنے کو ملتی ہے وہ معنوی گیرائی و گہرائی کے باوصف اتنی فصیح ہے جس کے سبب اُن کے فکر و اظہار میں حسن و دلآویزی پیدا کر دیتی ہے اور اتنی سہل اور سلیس بھی ہے کہ ہر خاص و عام کے لیے لائق فہم ہے۔

اُن کے یہاں فکر میں تعمیری ثبات اور مقصدیت دیکھی جا سکتی ہے۔ کہیں اخلاقی مضامین کی تضمین و بندش میں تو کہیں مذہبی تعلیمات و افکار کے ناصحانہ ابلاغ و اظہار۔ مذکورہ عمل کے ذریعے موصوف قاری و عوام کی تربیت سازی و کردار سازی کچھ اس طرز پر کرتے ہیں، جس سے معاشرے میں روبہ زوال صالح اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا احساس دلا کر اقدار کی بازیافت پر اُبھارنے کے عمل کو بخوبی انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ موصوف نے اپنی شاعری میں جو پیغام دیا ہے اُس میں بکھرے و منتشر سماجی تانے بانے کی یکجائی و سمیٹنے کی بھرپور کوشش دیکھنے کو ملتی ہے۔ موصوف کی تخلیقات میں اُن کے مشاہدے و تجربات کو بڑا دخل ہے۔ انھوں نے جو دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا ہے اس کا اظہار انھوں نے بلا تامل اپنے فن میں انتہائی فنکارانہ طرز و اسلوب میں کیا ہے۔

دیر سے جاگے تو نقصان یقینی ہوگا   ہاتھ سے قیمتی لمحات پھسل جائیں گے
ہر طرف پھیلتی بستی پہ نہیں کچھ قدغن   اب تو انسان ہی جنگل کو نگل جائیں گے

اُن کی نظمیں جن میں اللہ پر یقیں ہے، قائم سدا ہے رکھنی ہندوستاں کی عظمت، چھبیس جنوری، رُوح کی پکار، دیوالی، روشن چراغ، بھکارن، محبوبہ، آہٹ، لاش، پیٹ کی آگ اور 'جمہوریت' وغیرہ عوامی موضوعات رکھتی ہیں، نہ صرف اُن کے فکر و عقائد بلکہ اُن کے محسوسات کے ساتھ فکر و شعور کی بھی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

'تضمین بر غزل شکیل بدایونی' میں موصوف نے خود کی زبان و قلم سے شکیل بدایونی کے فکر و فن کی موثر ترجمانی کی ہے۔ نظم 'پیٹ کی آگ' میں حصول رزق کے لیے بھکارن کے کردار کو جو بھوک مٹانے کی خاطر اپنا سب کچھ یعنی اپنا وجود تک گنوا چکی ہے، ہمارے فکر و شعور کو جھنجھوڑتی چلی جاتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اچھی و کامیاب شاعری کے لیے جن عناصر تفحص الفاظ، 'مطالعۂ کائنات' اور 'جوش' کو ناگزیر قرار دیا ہے، کنول جعفری کی شاعری میں 'مطالعۂ کائنات' کے طور پر خود کے تجربات و مشاہدات اور بندش لفظیات کے امتزاج نے جو مجموعی کیفیت پیدا کی ہے، اُس نے بلا شبہ ان کی شاعری کو بڑا موثر بنا دیا ہے۔

'سیپیاں ٹوٹی ہوئی' ہر ذوق کے قاری کے لیے لائق مطالعہ اور انتخاب کتب میں شامل ہونے کے لائق ہے۔

فکشن

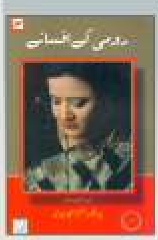

رومی کے افسانے

مرتب: پروفیسر اسلم جمشید پوری
صفحات: 192، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر نشاں زیدی، B-63/S-2، ڈی ایل ایف کالونی صاحب آباد، ضلع غازی آباد۔ 201005 (یوپی)

آیوسا اور عرشیہ پبلی کیشنز 'اردو کے عالمی ادب' پر اہم کتابیں شائع کر رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 'رومی کے افسانے' پاکستانی ادیبہ رومانہ رومی کے بیس افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ مرتب پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کتاب کے مقدمہ میں پاکستانی افسانہ نگار رومانہ رومی کی شہرت و مقبولیت، ان کا افسانوی آہنگ، مصنفہ سے ملاقات اور شناسائی، افسانوں کے موضوعات اور اس سے متعلق چند اہم معلومات کا بھی ذکر کیا ہے اور پاکستانی افسانوں کے موضوعات پر بھی بات کی ہے۔ افسانوں سے پہلے چالیس صفحات کا 'مضمون 'صدائے احتجاج بلند کرنے والی افسانہ نگار: رومانہ رومی" ہے، جس میں اسلم جمشید پوری نے رومانہ رومی کے افسانوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر ظاہر ہوتا ہے کہ اسلم جمشید پوری نے رومانہ کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

مجموعے میں بیس افسانے شامل ہیں، جن کے عنوان اس طرح ہیں: وزیٹنگ کارڈ، آٹھواں دروازہ، کرارا نوٹ، یہاں کوے بہت ہیں، تہذیب کا دروازہ، فطرت، خواہش نا تمام، نمک، بالکونی میں کھڑی عورت، برانڈ شرٹ، گڈبائی، اپنوں کے درمیاں، بلا عنوان، طوائف کون؟ برمودا ٹرائی اینگل، بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے، آدھی عورت آدھا خواب، سنہرے دائرے میں سیاہ لکیریں، آگ کا گولہ اور اوری چھوری!۔ عنوان سے زیادہ تر افسانے اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن کچھ افسانے ایسے ہیں جنھیں پڑھنے پر مایوسی ہوتی ہے محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے کچھ زیادہ ہی اختصار سے کام لیا ہے یا افسانے کی ابتدا کرنے سے پہلے ہی افسانے کو ختم کرنے کی فکر ہے۔ آٹھواں دروازہ، بالکونی میں کھڑی عورت، طوائف کون؟ اور افسانہ 'فطرت' مجموعے کے بہترین افسانے ہیں جو قاری کو تا دیر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

مجموعے کا پہلا افسانہ 'وزیٹنگ کارڈ ہے'۔ پورا افسانہ ٹرین کے سفر سے شروع ہو کر ٹرین میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ٹرین میں ایک مرد کی ایک خاتون سے ملاقات ہوتی ہے خاتون بہت خوبصورت ہے لیکن اس کے بزنس مین شوہر کے پاس اس کے لیے وقت نہیں ہے، جب ٹرین میں ایک اجنبی شخص سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور اپنے شوہر کے وزیٹنگ کارڈ پر اپنے گھر کا پتہ لکھ دیتی ہے اور اسے گھر آنے کی دعوت دیتی ہے لیکن سفر کے آخر میں اس کو پتہ چلتا ہے کہ وہ اجنبی شادی شدہ ہے تو وہ اس سے وزیٹنگ کارڈ لے کر پھاڑ دیتی ہے، یعنی اس کی امید پر پانی پھر جاتا ہے۔ یہاں پر افسانہ ختم تو ہو جاتا ہے لیکن قاری کے ذہن میں ایک سوال چھوڑ جاتا ہے کہ کیا واقعی کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ایک اجنبی کو شوہر کی غیر موجودگی میں گھر آنے کی دعوت دے سکتی ہے۔ افسانہ 'آٹھواں دروازہ' قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے آٹھ دروازوں کا ذکر کیا ہے پہلا دروازہ ایسا ہے جہاں ان کا سامنا ایسی معصوم بچیوں سے ہوتا ہے جو ایک وسیع و عریض قبرستان میں اپنی اپنی قبروں میں سسک رہی ہیں ان کے سسکنے کا سبب دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب قبروں میں قید ہیں اور اولادِ نرینہ کی امید میں ماؤوں کی کوکھ میں انھیں مار دیا گیا ہے۔ یہاں پر قاری کو حیرت ہوتی ہے کہ جہاں سماج نے اتنی ترقی کی منازل طے کر لیے اور آج کا ترقی یافتہ انسان سورج اور چاند پر کمندیں ڈالنے کی بات کرتا ہے وہیں وہ فرسودہ نظام سے باہر نکالنے میں خود کو کامیاب نہیں کر پایا ہے۔

رومی نے آٹھوں دروازوں کو علامت کے طور پر استعمال کر کے سماج کی تلخ حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ سماجی مسائل خصوصاً عورتوں کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ 'بالکونی میں کھڑی عورت' میں رومی نے بے حس لوگوں کو نشانہ بنایا ہے۔ اس کہانی میں مصنفہ نے یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ ہر اندھیری رات کے بعد روشن صبح نمودار ہوتی ہے ہر صبح چمکتا ہوا سورج روشنی کا پیغام لے کر آتا ہے یعنی ہر تکلیف کے بعد راحت کا انتظار ہوتا ہے، ہر ظلم کے بعد انصاف کا انتظار ہوتا ہے۔

افسانے کی ابتدا خوبصورت منظر سے کرنے کے بعد رومی سماج کی بدعنوانیوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جو بالکونی میں کھڑی ہو کر اپنے اطراف کا جائزہ لیتی ہے۔ جہاں حسین مناظر دلچسپی کا باعث بنتے ہیں وہیں تلخ حقیقت سے دل میں چبھن محسوس ہوتی ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے یہ بات بھی ذہن نشین کرائی ہے کہ عورت کو سب سے پیارا اپنا بچہ لگتا ہے چاہے وہ بدصورت ہی کیوں نہ ہو اور عوام کی بے حسی پر بھی وار کیا ہے۔ ایک گھنا اور سایہ دار پرانا درخت تیز آندھی میں گر جاتا ہے اس سے لوگوں کا راستہ رک جاتا ہے لیکن بے حس لوگوں کو کسی کی فکر نہیں ہوتی اور وہ اس درخت پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ راہگیر چلتے رہتے ہیں۔ ادھر سے ایک پاگل شخص کا گزر ہوتا ہے وہ اس پیڑ کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہے تو لوگ اس کی مدد کرنے کے بجائے اس کا مذاق بناتے ہیں اور اس پر پتھر اچھالتے ہیں۔ بالکونی میں کھڑی عورت یہ نظارہ دیکھ رہی ہوتی ہے وہ یہ سب دیکھ کر تلملا جاتی ہے اس کا دل بے چین ہو جاتا ہے اور وہ چاہتی کہ وہ پیڑ ہٹانے میں اس پاگل کی مدد کرے لیکن اس کو عورت کی بے بسی پر رونا آتا ہے۔ افسانے کا اختتام ایک سوال پر ہوتا ہے:

''میں یہ دیکھ کر تلملا اٹھی دل چاہا کہ میں اپنے فلیٹ سے نیچے اتروں، لڑکوں اور سامنے کاروبار کرتے مرد حضرات کو برا بھلا کہہ کر اس پاگل کی مدد کروں مگر مردوں کے اس معاشرے میں ایک بے بس عورت سوائے تلملانے کے اور کر ہی کیا سکتی ہے...
میں ایک سوال آپ سے کرنا چاہتی ہوں...
''لڑکوں اور پاگل شخص میں درحقیقت پاگل کون ہے؟'...
آپ کے جواب کا انتظار رہے گا!...'' (افسانہ۔ بالکونی میں کھڑی عورت)

افسانہ 'برانڈیڈ شرٹ' میں مصنفہ نے ایک انا پرست مرد کی فطرت پر وار کیا ہے۔ اس مجموعے کے زیادہ تر افسانوں میں عورت کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلم جمشید پوری نے رومانہ رومی کو صدائے احتجاج بلند کرنے والی افسانہ نگار کا نام دیا ہے کیونکہ ان کے افسانے سماج میں پھیلی بدعنوانی کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ رومانہ رومی اکیسویں صدی میں ابھرنے والی افسانہ نگار ہیں۔ امید ہے کہ ان کے افسانے موضوعات اور اسلوب کی وجہ سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

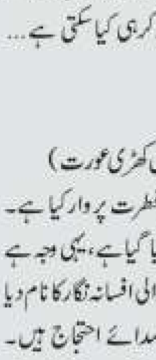

جوهی کی کلی

مصنفہ: نیلوفر پروین
صفحات: 144، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر احسان تابش، نیو کریم گنج، گیا

'جوہی کی کلی' نیلوفر پروین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں 25 افسانے شامل ہیں۔ عصر حاضر میں بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں محترمہ نیلوفر پروین ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے 1980 سے افسانہ نگاری کی ابتدا کی۔ ان کا پہلا افسانہ 'شمع جلتی رہے گی' فلم 'ویکلی' کولکاتا میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے وہ متواتر لکھتی رہی ہیں اور اکثر و بیشتر اردو کے ادبی و نیم ادبی رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ مصنفہ میرے ہم عصروں میں شامل ہیں جو بے لوث رشتوں کی پاسدار ہیں۔ ان کی اس بیحد اہم خوبی کی جھلک ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے

ان کے افسانوں مثلاً دائروں کے بیچ، جنم جنم کے ساتھی اور تشنگی کے موڑ پر کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ نیلوفر پروین کی کہانیاں روح کو سیراب اور دروں ذات میں جگہ بنا لیتی ہیں۔ افسانہ 'جب چڑیاں...' کے درج ذیل اقتباس میں اس بات کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

''اس نے خود اپنے ہاتھوں سے یاسمین کو کھو دیا تھا۔ کاش وہ یاسمین سے شادی کے لیے رضامند ہو جاتا، لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ اس نے یاسمین کی تمناؤں کا خون کیا تھا۔ اس کی قدر نہیں کی۔ اس کی خاموش محبت کو ٹھکرا دیا، جس کے لیے وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ فراز خود کو مجرم سمجھنے لگا اور اپنے جرم پر خود بھی تڑپ رہا تھا۔ وہ نڈھال سا اپنے بستر پر گر گیا۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح جس نے زندگی کی سب سے بڑی بازی ہاری ہو۔''

نیلوفر پروین افسانوی موسم کے مزاج و تیور سے آشنا ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں اس کے تمام جزئیات کو قرینے اور سلیقے سے فنی تقاضوں کے عین مطابق پیش کر دیتی ہیں۔ اردو کی نامور ادیبہ ڈاکٹر نگار عظیم رقم طراز ہیں کہ ''نیلوفر صاحبہ ہاؤس وائف ہیں۔ گریجویٹ ہیں، افسانہ نگاری سے شغف رکھتی ہیں، نظمیں بھی لکھتی ہیں اور افسانے بھی۔ نیلوفر کا پہلا افسانہ 1979 میں شائع ہوا تھا۔ اس طویل وقت میں آپ نے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ کم لکھا لیکن بہتر لکھنے کی کوشش کی۔ یہ افسانے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بیشتر افسانے سماجی ہیں اور زندگی سے عبارت ہیں۔'' (ص 7)

'جوہی کی کلی' کے تمام افسانوں پر ڈاکٹر احمد علی جوہر (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی) نے تفصیلی تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''نیلوفر پروین کا انفراد و امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ٹھہر ٹھہر کر اور سنبھل سنبھل کر لکھا ہے۔ انھوں نے بیجا طوالت نگاری اور غیر ضروری مکالمہ نگاری وغیرہ سے گریز کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ٹھہراؤ، ارتکاز، ایجاز و اختصار تاثر کی وحدت، عصری حسیت، دروں بینی اور ژرف نگاہی، یہ تمام چیزیں موجود ہیں۔'' (ص 27)

گھریلو زندگی کے مسائل، ذات پات کی رسہ کشی، جہیز کی لعنت، احساس محرومی و امیروں کی تنگ نظری جیسے بہت سارے موضوعات ہیں جنھیں افسانوی پیرائے میں مصنفہ نے عمدگی سے افسانوی پیراہن میں پیش کیا ہے۔ اپنے آس پاس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو انھوں نے بخوبی اجاگر کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کی نفسیاتی الجھنوں کا اشارہ بھی ملتا ہے جس سے ان کے گہرے مشاہدے اور وسیع تجربے کا پتہ چلتا ہے۔ میرے خیال میں وہ اپنے تجربے اور مشاہدے ہی سے افسانوی عمارت تعمیر کرتی ہیں۔ ان کے کرداروں کی زبان ان کی شخصیت کی شہادت دیتی ہے۔ نسائی جذبات کی ترجمانی ان کے افسانوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ افسانے کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اسلوب نگارش میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ رواں بیانیہ انداز قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

کتاب کے پہلے فلیپ پر ڈاکٹر احمد حسن دانش، سابق صدر، شعبۂ اردو، بی این منڈل یونیورسٹی، مدھے پورہ، بہار کے عمدہ تاثرات اور دعائیہ کلمات درج ہیں۔ دوسرے فلیپ پر معروف افسانہ نگار احسان قاسمی نے مصنفہ کی فنی خوبیوں اور موضوعات کے تنوع پر اظہار خیال پیش کیا ہے۔ بیک کور پر معروف و مشہور ادیب ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری نے مصنفہ کی افسانہ نگاری کی اہم خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو کے افسانوی حلقے میں 'جوہی کی کلی' کی خاطر خواہ پزیرائی ہوگی اور نیلوفر پروین صاحبہ اسی طرح اپنا افسانوی سفر جاری رکھیں گی۔

رسائل و جرائد

سہ ماہی 'سہیل' (شارب ردولوی نمبر)

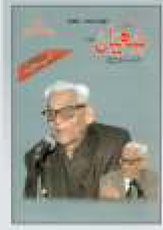

صفحات: 220، قیمت: 100 روپے، جنوری تا مارچ 2022

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر، مینیجنگ ایڈیٹر: جمیل منظر

مدیر اعزازی: ڈاکٹر شاہد ساز

رابطہ: چھایا گھیرا، 3/2A، اوربنت رو، کولکاتا۔ 700017

مبصر: مظفر نازنین، 36، سر سید احمد روڈ، کولکاتا۔ 700014

موقر رسالہ 'سہ ماہی سہیل' کولکاتا کی اشاعت کا 83 واں سال ہے۔ یہ رسالہ پوری شان، بان سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ بیاد ادریس سنبھاروی شائع ہوتا ہے۔ جس کے سرپرست قمرالدین ملک اور مینیجنگ ایڈیٹر جناب جمیل منظر ہیں۔ چیف ایڈیٹر مسعود منظر اور مدیر اعزازی ڈاکٹر شاہد ساز ہیں۔ اس شہر سے گزشتہ کئی سالوں میں کئی اخبارات اور رسالے نکالے گئے لیکن بس ایک یا دو سال کے بعد بند کر دیے گئے۔ اس طرح مسلسل 83 سالوں سے شائع ہونے والا رسالہ 'سہ ماہی سہیل' کولکاتا اس حقیقت کا غماز ہے کہ آج بھی یہاں یعنی شہر کولکاتا میں اردو ادب کے قدر داں اور قدر شناس باقی ہیں۔ گرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ 'سہ ماہی سہیل، کولکاتا' (جنوری-مارچ 2022) کا شمارہ ایک خاص گوشے پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل شارب ردولوی نمبر ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی اردو ادب کی نابغہ روزگار شخصیت ہیں جو ادیب، محقق، ناقد، شاعر، مترجم، استاد ہیں۔ اردو ادب کی باغ و بہار شخصیت ہیں۔

رسالے کا سرورق خوب صورت، دیدہ زیب، پُرکشش اور جاذب نظر ہے، جس پر پروفیسر شارب ردولوی کی تصویر ہے۔ اس رسالے میں 39 مضامین ہیں۔ یہ تمام مضامین علمی و ادبی شخصیات کی نگارشات پر مشتمل ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں شارب صاحب کی نگارشات جن میں غزلیں، قصیدہ، نظمیں شامل ہیں۔

صفحہ 5 پر مینیجنگ ایڈیٹر جناب جمیل منظر کا اداریہ بعنوان 'نمود' ہے۔ موصوف یوں رقم طراز ہیں ''اردو ادب کی نابغۂ روزگار شخصیات کا ذکر آئے گا تو اس فہرست میں شارب ردولوی کا نام احترام سے لیا جائے گا۔ پروفیسر شارب ردولوی صاحب اسلوب ادیب، محقق، ناقد، شاعر، مترجم، استاد اور ان تمام باتوں کے ماسوا ایک نہایت منکسر المزاج اور مرنجاں مرنج انسان ہیں۔''

پروفیسر عاصم شہنواز شبلی، صفحہ 10 پر شارب نامہ میں یہ اشعار شارب ردولوی کی نذر کرتے ہیں۔

ہیں قلزمِ تنقید کے گوہر شارب — تحقیق کے دریا کے شناور شارب
اقلیم ادب میں ہیں ضوگر شارب — ہیں راہ محبت کے بھی رہبر شارب

شاہد ساز نے 'شارب ردولوی-حیات نامہ' ترتیب دیا ہے، جس میں شارب صاحب کے کوائف، انعامات و اعزازات بشمول شارب ردولوی بحیثیت نگراں پی ایچ ڈی اسکالرس اور ایم فل کے ریسرچ اسکالر کے نام اور جامعہ کے نام درج کیے ہیں۔ ان تمام پی ایچ ڈی اور ایم فل اسکالرز کے نام درج کیے ہیں جنہوں نے پروفیسر شارب ردولوی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی اور ایم فل مکمل کی۔

شارب ردولوی کی علمی و ادبی خدمات پر کتابوں کے نام اور ان کی بیرون ملک کانفرنس میں شرکت کا سنہ اشاعت درج کیا ہے۔ بلاشبہ شاہد ساز صاحب نے ادارتی فرائض بخوبی انجام دیے ہیں۔

صفحہ 23 پر ڈاکٹر احمد معراج کا شارب ردولوی سے ایک انٹرویو شامل ہے۔ حفیظ نعمانی کا مضمون 'یادیں: لہو میں ڈوبی ہوئی یادیں' درد سے لبریز ہے۔ نعمانی صاحب کے اس مضمون کو پڑھ کر آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور یہ شعر یاد آ گیا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب　　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

آخری جملے میں اپنے پاؤں کی مجبوری بیان کرتے ہوئے ان درخشاں ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کہاں سے لاؤں ان دنوں کو جب ہم دونوں نے ''انجمن سامعین کرام و داد و دہندگان عظام'' بنائی تھی تو لکھنؤ کی ادبی دنیا اس نام سے کانپ اٹھتی۔''

عارف نقوی کا مضمون 'شارب ردولوی: بہترین انسان، فاروق ارگلی کا مضمون 'شارب ردولوی: خم خانۂ علم و ہنر'، صغیر افراہیم کا مضمون 'شارب ردولوی: ایک عہد ساز شخصیت' بہت شاندار ہیں۔ عرشیہ جبیں نے اپنے مضمون بعنوان 'شارب ردولوی کی رپوتاژ نگاری' اور محمد اسلام نے اپنے مضمون بعنوان 'شارب ردولوی کی خاکہ نگاری' بالترتیب شارب صاحب کو بحیثیت رپوتاژ نگار اور بحیثیت خاکہ نگار پیش کیا ہے۔ صفحہ 97 پر پروفیسر اسلم جمشید پوری یوں رقم طراز ہیں:

''شارب ردولوی کا شمار اردو کے جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔ بحیثیت ناقد و محقق ان کی شناخت مستحکم ہے۔ شارب ردولوی اور اردو تنقید کے حوالے سے مشاہیر اہل قلم کے گراں قدر مضامین ہیں جن میں انھوں نے شارب صاحب کی ناقدانہ بصیرت کا بھر پور جائزہ لیا ہے۔ ان مشاہیر میں وہاب اشرفی، علیم اللہ حالی، ظہیر انور، مناظر عاشق ہرگانوی، سراج اجملی، زیبا محمود اور عمر غزالی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ڈاکٹر اطہر مسعود نے رضا لائبریری میں بہت سے رسالوں کے ساتھ مختلف اشاریے بھی تلاش کیے ہے اور جو مضامین دستیاب ہوئے اسے اشاریہ میں شامل کیا ہے۔ شاہد ساز نے ایک مضمون صفحہ 205 پر لکھا ہے، جس کا عنوان ہے 'شارب ردولوی مشاہیر ادب کی نظر میں' جس میں شارب صاحب کے حوالے سے مشاہیر ادب کے تاثرات پیش کیے ہیں۔ ان مشاہیر اہل قلم کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: شمس الرحمن فاروقی، سیدہ جعفر، محمد حسن، قمر رئیس، نور الحسن ہاشمی، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، تنویر احمد علوی، نیر مسعود، شمیم حنفی، عابد سہیل، شہزاد انجم، خواجہ احمد فاروقی، ندیم احمد۔ شارب ردولوی کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

لہو سے اپنے بخشی ہے گل لالہ کو رنگینی　　　جلایا ہے بڑا خونِ جگر گلشن سجائے ہیں

وہی شارب جو کل تک رونقِ بزمِ غزالاں تھا　　　بہت بدنام ہے وہ آجکل سارے زمانے میں

المختصر یہ رسالہ شارب شناسی کے لیے بہت اہم ہے جس میں پروفیسر شارب ردولوی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے جو شارب فہمی کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے آنے والی نسلیں، ریسرچ اسکالر مستفیض ہوں گے۔ میں 'سہ ماہی سہیل' کولکاتا کے 'شارب ردولوی نمبر' شائع کرنے پر رسالے کے سرپرست عالی جناب قمر الدین ملک صاحب، چیف ایڈیٹر مسعود منظر، مینیجنگ ایڈیٹر جمیل منظر، مدیر اعزازی ڈاکٹر شاہد ساز صاحب کے علاوہ ان تمام باوقار قلم کاروں کو تہ دل سے پُرخلوص مبارک باد پیش کرتی ہوں جن کی نگارشات 'شارب ردولوی نمبر' کی زینت ہیں۔ 'شارب ردولوی نمبر' شائع کر کے بلاشبہ ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔ صاحبانِ ذوقِ کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے

ساحر شیوی: ایک ہشت پہلو فنکار

رتناگری: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور شعبۂ اردو، گوگٹے جوگلے کر کالج رتناگری کے باہمی اشتراک سے 'ساحر شیوی: ایک ہشت پہلو فنکار' کے عنوان پر رادھا بائی شیٹے سبھاگرہ، کالج کیمپس میں ایک روزہ قومی سمینار 30 مارچ کو منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر پی پی کلکرنی (پرنسپل، گوگٹے جوگلے کر کالج رتناگری) کی صدارت میں منعقدہ

سمینار میں خطۂ کوکن کے اردو پروانوں کی بڑی تعداد موجود رہی۔

سمینار کا افتتاح رتناگری ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری جناب ستیش شیوڑے نے کیا۔ انھوں نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ جب سے ڈاکٹر محمد دانش غنی نے شعبۂ اردو کی کمان سنبھالی ہے تب سے اخبارات کے ذریعے ہم شعبۂ اردو کی کارکردگی دیکھتے آئے ہیں جس سے ہمیں خوشی بھی ہوتی ہے۔

معروف افسانہ نگار، محقق اور نقاد ڈاکٹر نورالامین (شعبۂ اردو، شاردا کالج، پربھنی) نے کلیدی خطبے میں ساحر شیوی اور ان کی فعال شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ وہ ادبی، سماجی اور ذاتی ذمے داریوں کو پورا کرنے کے لیے پچیسواں گھنٹہ کہاں سے لاتے تھے۔

مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد نے شرکت کی اور ساحر شیوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ساحر شیوی نے اپنی قابلِ قدر اور شائستہ تخلیقات کے ذریعے نہ صرف اپنی پہچان بنائی بلکہ اردو ادب کے بہی خواہوں، ادیبوں اور شاعروں کی شناخت بنانے کے لیے بھی ایک ادبی ادارے 'کوکن اردو رائٹرس گلڈ' کی بنیاد بھی ڈالی جس کے زیر اہتمام اردو کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر پی پی کلکرنی (پرنسپل، گوگٹے جوگلے کر کالج رتناگری) نے اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر محمد دانش غنی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ آج صورتِ حال یہ ہے کہ پچھلے آٹھ سال کے دوران ڈاکٹر محمد دانش غنی نے گوگٹے جوگلے کر کالج میں اردو کے متعدد پروگرام کیے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا جس کے نتیجے میں ملک اور بیرون ملک کی بیشتر ادبی ہستیاں ہمارے کالج میں تشریف لائیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر محمد دانش غنی نے اہم موضوعات پر کانفرس اور سمینار منعقد کیے ہیں۔ 'ساحر شیوی: ایک ہشت پہلو فنکار' بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر محمد دانش غنی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور سمینار کی غرض و غایت بھی بیان کی۔ محترمہ شاذیہ بڑھیے (معلمہ، مستری ہائی اسکول، رتناگری) نے نظامت کے فرائض انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیے۔ ڈاکٹر سریندر ٹھاکور دیسائی (وائس پرنسپل، آرٹس فیکلٹی) نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

اس سمینار میں جناب سعید کنول (ممبئی)، جناب منظر خیامی (باغ مانڈلہ)، ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ)، ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری (برہانپور)، ڈاکٹر تابش خان (ممبئی)، ڈاکٹر شیخ احرار احمد (ممبئی)، ڈاکٹر ظہیر دانش عمری (حیدر آباد)، ڈاکٹر جاوید رانا (برہانپور)، ڈاکٹر ابرار احمد (پونے)، ڈاکٹر ارشاد احمد خان (ناندیڑ) ڈاکٹر سید تاج الہدا خطیب (بیلگام)، ڈاکٹر محسن احمد (گلبرگہ)، شعیب ایجی (ممبئی) اور کئی دوسرے شہروں سے اردو کے اہلِ قلم اور ریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔ جناب نظام الدین سعد (مہاڈ) عبدالروف محی الدین خطیب (کھیڈ)، جناب رفیق مقادم (مجگاؤں)، عبدالکریم محمد شریف منیار (رتناگری)، سیدہ تبسم ناڈکر (ممبئی) اور جناب منظور ناڈکر (ممبئی) مہمانان کی حیثیت سے شریک تھے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پی پی کلکرنی نے سمینار کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر محمد دانش غنی کے اظہارِ تشکر پر سمینار کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: محمد دانش غنی، رتناگری، 6 اپریل 2022

اردو ناول کا ادبی تہذیبی اور سیاسی پس منظر

مظفر نگر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے ہولی لینڈ پبلک اسکول کمیٹی کے زیر اہتمام مظفر نگر کے ہوٹل گولڈن ان میں 'اردو ناول کا ادبی تہذیبی اور سیاسی پس منظر' پر ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی جناب راجیش کمار ضلع پروگرام آفیسر تھے۔ سیمینار کے عنوان پر اظہار خیال کرتے ہوئے اردو روزنامہ سہارا اخبار کے نامہ نگار عزیز الرحمٰن خان نے کہا کہ اردو ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں زندگی کے کرداروں کو مختلف زاویوں سے دکھایا گیا ہے۔ تنویر گوہر نے کہا کہ ناول ایسی صنف ہے جس میں حقیقی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے، اردو میں ناول کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ سیمینار میں شاد حسینی نے کہا کہ اردو ناول نگار صرف تخلیق میں پرواز نہیں کرتا، اس کی کہانی کی بنیاد روزمرہ کی زندگی ہے، جو ناول شائع ہوئے ان کے لکھنے کے پیچھے ناول نگاروں کا کیا رجحان تھا ان تمام زاویوں کی روشنی میں ہم اردو ناولوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر شریک مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا سیمینار کی صدارت جناب مولانا محفوظ الرحمٰن قاسمی نے کی جب کہ نظامت الطاف مشعل نے کی۔ آخر میں تنظیم کے سکریٹری رضوان نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 1 مئی 2022

اقبال حسین حسرت جے پوری لیکچر

جے پور: 28 مارچ 2022 بروز سنیچر شعبہ اردو و فارسی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے حسرت جے پوری کی یاد میں لیکچر منعقد ہوا۔ حسرت جے پوری پر خصوصی لیکچر کے لیے دہلی یونیورسٹی کی ڈین پروفیسر نجمہ رحمانی تشریف لائیں۔ انھوں نے بتایا کہ حسرت جے پوری بحیثیت شاعر و گیت کار مشہور تھے لیکن اس کے ساتھ وہ اچھے انسان بھی تھے۔ انھوں نے گھر میں کہہ رکھا تھا کہ اگر کوئی سوالی گھر آئے تو اسے دے دو بغیر وجہ جانے، عزیز و اقارب، دوست احباب کا انھیں پاس تھا۔ وہ سب کی دل جوئی کرتے اور بلا تفریق مذہب و ملت سب سے بھائی چارہ رکھتے۔ حضور اکرم سے آپ کو بے پناہ عقیدت تھی۔ آپ کے کلام میں قومی یکجہتی کا پیام بھی ملتا ہے۔ لیکچر کے دوران انھوں نے فلمی گیتوں اور غزلوں کے اشعار بھی سنائے۔ راجستھان کے تعلق سے شاعر مخمور سعیدی ٹونکی کا بھی ذکر کیا۔ اردو شعبے کی ایک طالب علم مسرت پروین نے حسرت کا سوانحی خاکہ پیش کیا اور دوسری طالب علم عرشی خان نے ترنم سے حسرت کی غزلیں سنائیں۔ شکریہ ادا کرنے کی ذمے داری سنسکرت کے پروفیسر راجیش کمار نے نبھائی۔

رپورٹ: ناصرہ بصری، صدر شعبۂ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور، 28 مارچ 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:magazines@ncpul.in

اردو صحافت کی دو صدیاں

اردو صحافت کا دو سو سالہ جشن

نئی دھلی: اردو قارئین کی کم ہوتی تعداد پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے سابق نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے کہا کہ ہر دس سال میں آبادی تو بڑھ رہی ہے لیکن اردو پڑھنے اور بولنے والوں کی آبادی کم ہو رہی ہے۔ یہ بات انھوں نے اردو صحافت کا دو سو سالہ جشن میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے کہی۔ اس کا اہتمام 'اردو صحافت دو سو سالہ تقریبات کمیٹی' نے کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کی ذمہ داری ان کی ہے جن کی زبان ہے، لہٰذا اردو کے تئیں ذمے داری نبھانے کی ضرورت ہے۔ سابق مرکزی وزیر اور سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر غلام نبی آزاد نے اردو صحافت کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کے آغاز کے بارے میں متضاد دعوے کیے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پہلا شخص جسے کالا پانی بھیجا گیا تھا وہ ایک مسلم صحافی تھا۔ یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ شخص کون تھا۔ سابق رکن پارلیمنٹ اور سفارت کار میم افضل نے صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو مسلمان کی زبان بنا دیا گیا ہے اور اس میں کچھ حد تک اردو والے بھی شامل ہیں۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اگر زبان کا مذہب ہوتا تو اردو کے پہلے اخبار 'جام جہاں نما' کے کرتا دھرتا سدا سکھ لعل اور ہری دت نہیں ہوتے۔ دوسرے سیشن میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے سربراہ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ بقول مولانا وحید الدین خاں اردو صحافت احتجاج کی صحافت ہے۔ مشہور صحافی قربان علی نے کہا کہ جب تک اردو کو روزی روٹی سے نہیں جوڑا جائے گا اس وقت تک نہ اردو صحافی بچیں گے اور نہ ہی اردو کے اخبارات۔ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اسلم پرویز نے کہا کہ جب تک ہم اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے اس وقت تک اردو کا بقا ممکن نہیں ہے۔ روزنامہ 'آگ' لکھنؤ کے مدیر اعلیٰ ابراہیم علوی نے اس سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو بچانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں بچوں کو اردو پڑھائیں۔ روزنامہ 'ندیم' بھوپال کے ایڈیٹر عارف عزیز نے اردو صحافت میں یو این آئی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ یو این آئی کی وجہ سے اخبارات کے بہت سارے مسئلے حل ہوئے ہیں جس میں خاص طور پر ترجمہ کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ خطاب کرنے والوں میں شاہین نظر، ڈاکٹر سید فاروق، رکن پارلیمنٹ ندیم الحق، رئیس مرزا اور دیگر شامل تھے۔ اس موقعے پر متعدد صحافیوں کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیے گئے جن میں احمد سعید ملیح آبادی، محمد وسیم الحق، زاہد علی خان، مودود صدیقی، حسن کمال، سہیل وحید، وجے کمار چوپڑہ، احمد ابراہیم علوی، عارف عزیز، اختر یونس قدوائی، ایس ایم اشرف فرید، مودود ساجد کے نام شامل ہیں۔ بہت سے صحافیوں کو مومنٹو بھی پیش کیے گئے جن میں یو این آئی اردو کے سابق سربراہ عبدالسلام عاصم، ڈاکٹر سید احمد خان، شاہین نظر، عبدالرحمٰن پاشا، ڈاکٹر ابھے کمار، سرفراز آرزو قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مرضیہ عارف نے اپنی کتاب 'جہان فکر و فن' کی کاپی سابق صدر جمہوریہ حامد انصاری کو پیش کی۔ پہلے سیشن کی نظامت پروگرام کے کنوینر اور مشہور صحافی معصوم مرادآبادی نے کی جب کہ دوسرے سیشن کی نظامت معروف صحافی سہیل انجم نے انجام دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 مارچ 2022

اردو صحافت کا دو سو (200) سالہ جشن

حیدر آباد: صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے۔ اس کی ذمہ داری بہت بڑی اور اہم ہے۔ صحافت قوم کو سنوار سکتی ہے، اسے ترقی دلا سکتی ہے۔ قوم و ملت کو صحیح راستے پر لانے کی ذمہ داری صحافیوں پر ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو صحافت کے دو سو سالہ جشن کے موقعے پر ذیمرلیس ادبی فورم حیدرآباد، آل انڈیا اردو ماس کمیونی کیشنل سوسائٹی فار پیس حیدرآباد اور نوبل میڈیا لنکس بنگلور کے زیر اہتمام منعقدہ ورلڈ اردو سمیٹ سے خطاب کرتے ہوئے ریاستی وزیر داخلہ جناب محمد محمود علی نے کیا۔ ڈاکٹر مختار فردین نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم صحافیوں کو ایوارڈ دے رہے ہیں۔ آگے بھی یونہی مختلف بزرگ صحافیوں کے نام سے ایوارڈ پیش کریں گے او راس میں نقد انعام بھی شامل کریں گے۔ اس موقعے پر مختلف صحافیوں کو ریاستی وزیر داخلہ محمد محمود علی نے ایوارڈ پیش کیے۔ ان ایوارڈ یافتگان میں خصوصی طور پر جناب کے افتخار احمد شریف کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 'شہنشاہ قلم و ادب' اور نوبل میڈیا لنکس بنگلور کے ایڈمنسٹریٹر جناب سید تاج الدین کو 'طرۂ امتیاز' ایوارڈ پیش کیا گیا۔ صحافتی خدمات کے لیے کرناٹک کے رامنگرم ضلع کے چن پٹن سے شائع ہونے والے 'آواز کرناٹک' کے سید عبدالکریم کو 'اردو انمول رتن ایوارڈ' پیش کیا گیا جسے جناب سید اکرم نے قبول کیا اور اس کے علاوہ ادبی خدمات کے لیے کائنات ادب بنگلور کے معتمد شاہ عبدالرشید سہیل نظامی کو بھی اردو انمول رتن ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر مختار احمد فردین کے شکریہ پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'تاثیر' حیدرآباد، 28 مارچ 2022

جشن اردو صحافت

ممبئی: ہندوستان میں اردو صحافت کے 200 برس مکمل ہونے کی خوشی میں شہر ممبئی کے صحافیوں کی تنظیم پترکار وکاس فاؤنڈیشن نے جشن اردو کے نام سے خلافت ہاؤس بائیکلہ میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا جس میں مقررین نے صحافتی دنیا کے دو سو سال کے مکمل ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مختلف واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے اردو صحافت کی تاریخ و اردو جرنلزم کے اثرات پر حاضرین سے سیر حاصل گفتگو کی۔ پہلے سیشن میں ریاستی صدر سرفراز آرزو نے اردو صحافت کے 200 برس مکمل ہونے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہاں تک آتے آتے اردو صحافت بہت کرب والم سے گزری ہے۔ اب اسے مزید آگے بڑھانے کی ذمہ داری نوجوان صحافی نبھائیں گے۔ مہمان خصوصی نظام الدین راعین نے کہا کہ آج بھی اردو پڑھنے والے قارئین کی تعداد کسی دوسری زبان کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ پترکار راجیو جادو، جناب وسیم خنجر نے بھی خطاب کیا۔ اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے پترکار وکاس فاؤنڈیشن کے صدر یوسف رانا نے کہا کہ تمام سینئر صحافیوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ نوجوان نسل جو اردو صحافت میں دلچسپی رکھتی ہے کا نہ صرف استقبال کیا جائے بلکہ صحافت کے تبدیل ہونے والے فارمیٹ جیسے ڈیجیٹل میڈیا اور بھی دیگر ذرائع ابلاغ کا استعمال صحافت کے لیے کس طرح کیا جائے اس کے لیے مکمل رہنمائی کی جائے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 27 مارچ 2022

اردو صحافت کی دوصدی: عظیم وراثت اور عصر حاضر کے تقاضے

حیدرآباد: 28 مارچ (یواین آئی) اردو صحافت نے اپنے دوسو سالہ تاریخ میں ملک اور قوم کی ترقی میں کلیدی رول ادا کیا ہے تاہم اس میں بعض تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئی حسیت کو اجاگر کرنے کی اشد ضرورت ہے جو وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ یہ بات یہاں بزم صدف انٹرنیشنل کی جانب سے منعقدہ ایوارڈ تقریب وجشن اردو صحافت کے

دوسرے دن 'اردو صحافت کی دوصدی: عظیم وراثت اور عصر حاضر کے تقاضے' کے موضوع پر منعقدہ بین الاقوامی سیمنار سے خطاب کرتے ہوئے کہی گئی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سروری ایسوی ایٹ پروفیسر شعبہ صحافت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے حیدرآباد میں اردو صحافت کی موجودہ تفصیلی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے شہر کے اخبارات کی خامیوں کی سمت بھی نشاندہی کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت اپنے اہداف سے ہٹ گئی ہے۔ اس طرح اس نے دیگر زبانوں کی صحافت سے خود کو الگ کرلیا ہے۔ اخبارات کی جانب سے غیر پیشہ وارانہ طریقے اختیار کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے ان کا قاری سے رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ اردو اخبارات کے ذمہ داروں کے پاس اس بات کا ڈاٹا نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ اردو اخبارات کا قاری کیا چاہتا ہے، کتنے قاری ہیں؟

مجلس صدارت سے وابستہ وائس آف امریکہ کے نمائندہ سہیل انجم نے اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اردو کی مذہبی صحافت کے گوشوں کا احاطہ کیا اور دینی مدارس سے نکلنے والے مجلات کی تفصیلات سے واقف کروایا۔ انھوں نے کہا کہ ان مجلات کی تعداد تقریبا 40 ہے۔ ڈاکٹر سہیل وحید نے صحافت کی زبان کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ مجلس صدارت میں شامل تاثیر اخبار کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر محمد گوہر نے ایک رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس سے اردو کا فروغ ہورہا ہے۔ انھوں نے اردو صحافت کے حوالے سے منفی باتوں کو پھیلانے سے گریز کا مشورہ دیا۔

معروف نقاد حقانی القاسمی نے کہا کہ اردو صحافت کو توانائی کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ صحافت کے مسائل پر بات کرنے کے ساتھ ساتھ حل پر توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ صحافت صارفیت کی مشین بن گئی ہے۔

معروف شاعر مسعود حساس (کویت) نے صحافت کے لیے مستقبل کے لائحہ عمل تیار کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اسی وقت اردو اخبارات صحافت معیار پر قائم رہیں گے جب تک ہم جب ان کے لوازمات کا خیال نہ رکھیں۔

پروفیسر ابوبکر عباد نے مقالوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا اور مقالہ نگاروں کو اہم مشورے دیے کہ اس طرح کے مقالہ لکھنے کے دوران کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ مجلس صدارت میں شامل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاذ اور فکشن نگار پروفیسر غضنفر علی نے صحافت کے اہم نکات کی طرف اشارہ کیا۔

یواین آئی اردو کے سرکردہ صحافی عابد انور دہلی نے کہا کہ اردو صحافت کا 200 سال کی تاریخ اردو یواین آئی سروس کے حوالہ کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ یواین آئی کی اردو سروس سے ہندوستان کے اردو اخبارات میں ایک نیا انقلاب آیا اور یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں اردو صحافت کی نقیب اردو یواین آئی ہے۔

مسٹر عابد انور نے کہا کہ ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ اردو اخبارات کے معیار میں کمی آئی ہے۔ نیوز اور ویوز کا فرق بہت تیزی سے مٹ رہا ہے۔

کولکاتا کے بھیرب کالج کے استاذ طیب نعمانی نے اپنے مقالہ میں کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں اردو صحافت کے آغاز، ارتقا اور اس کی ترقی کے مختلف منازل کی سمت نشاندہی کرتے ہوئے اس کی تفصیلات سے واقف کروایا۔ ڈاکٹر ریشما قمر نے اردو صحافت کا رنگ وآہنگ کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے بعض اخبارات کی زرد صحافت کی طرف نشاندہی کی۔ محترمہ رفیعہ نوشین سماجی جہد کار نے اپنے مقالہ میں صحافت میں خواتین کی صورت حال اور ان کو درپیش مسائل کا تفصیلی جائزہ لیا۔ انھوں نے خاتون صحافیوں کے مسائل بھی اٹھائے۔ پرویز عالم ریسرچ اسکالر (پٹنہ) نے اپنے مقالہ میں ماقبل آزادی پریس سنسر شپ پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ محمد مرجان علی ریسرچ اسکالر، ریسرچ اسکالر شبنم پروین، حیدرآباد کے سینئر صحافی سجاد الحسنین نے بھی مقالے پڑھے۔ صفدر امام قادری ڈائرکٹر بزم صدف انٹرنیشنل اور شہاب الدین احمد چیرمین بزم صدف انٹرنیشنل نے معاونین کو توصیفی سند سے نوازا۔ مسٹر صفدر امام قادری نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سیمنار کے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

یواین آئی، ورخ، رح، ا، 13 مئی 2022

اردو صحافت: زبان کے بدلتے پس منظر کے حوالے سے

علی گڑھ: ہندوستان لسانی تنوع کے معاملہ میں ایک منفرد ملک ہے، جہاں بے شمار زبانیں اور بولیاں رائج ہیں، جو ملک کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ اردو زبان سبھی کمیونٹیز کی زبان ہے اور اسے کسی ایک کمیونٹی کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں۔ شمالی ہند

میں اردو کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے اور محبان اردو کو چاہیے کہ اپنی مادری زبان کے تحفظ و فروغ کے لیے وہ بچوں کو رسم الخط کے ساتھ اردو سکھائیں۔'' ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کیا۔ وہ اے ایم یو کے شعبہ لسانیات کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے تعاون سے منعقدہ دو روزہ سیمینار بعنوان 'اردو صحافت: زبان کے بدلتے پس منظر کے حوالے سے' کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔

قبل ازیں پروفیسر ایم جے وارثی (صدر شعبہ لسانیات اور سیمینار ڈائرکٹر) نے مہمانوں اور ریسورس پرسنز کا خیر مقدم کیا اور سیمینار کے موضوع کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا ''میڈیا اور زبان کا باہمی تعامل لسانی مطالعہ کا کلیدی حوالہ ہے اور اردو صحافتی زبان اور محاورے میں ارتقا ہوا ہے اور بہت تبدیلیاں آئی ہیں، جو ایک فطری لسانی رجحان ہے۔ انھوں نے اردو صحافت کی ترقی میں سر سید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر اور دیگر کے کارناموں کا ذکر کیا۔ پروفیسر وارثی نے کہا کہ لسانیات کا تعلق زبان و بیان اور تہذیب و تمدن سے بھی ہے۔ لسانی جدت، نحوی اور صرفی قواعد کی پیچیدگیوں کا مطالعہ اخبارات کی زبان کی روشنی میں بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

کلیدی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر احتشام احمد خان (ڈین، اسکول آف ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) نے کہا کہ صحافت اور ماس کمیونیکیشن کے طلبہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں نیوز اور اسکرپٹ رائٹنگ کی تکنیک سیکھ لیتے ہیں، لیکن زبان کو درست یا بہتر بنانے پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے مواد اور اسکرپٹ رائٹنگ کی تربیت کو نصاب کا حصہ بنانا چاہیے۔ پروفیسر سید امتیاز حسنین (شعبہ لسانیات، اے ایم یو) نے کچھ مقبول سیریلز کا لسانی تجزیہ پیش کیا، جو انسانی تعلقات کی پیچیدگیوں اور رشتوں کو ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے سماجی لسانیات کے حوالہ سے سیمینار کے موضوع پر گفتگو کی۔ پروفیسر سید محمد ہاشم (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اے ایم یو) نے کہا کہ بچوں کو صحیح تلفظ اور رسم الخط کے ساتھ اردو پڑھائی جانی چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حالیہ دنوں میں سہل پسندی نے اردو زبان کے تلفظ اور املا کو متاثر کیا ہے، اس کی اصلاح پر توجہ دی جانی چاہیے۔

پروفیسر شبانہ حمید نے این سی پی یو ایل، نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر عقیل احمد کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ سیمینار کے آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر صباح الدین احمد نے مہمانوں، ریسورس پرسنز اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ غور طلب ہے کہ اس دو روزہ سیمینار میں چار اکیڈمک سیشن ہوئے، جس کی نظامت اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شمیم فاطمہ اور ڈاکٹر صبا پروین نے ادا کیے۔ افتتاحی اجلاس میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر کے ایس مصطفیٰ (سابق صدر شعبہ لسانیات، اے ایم یو علی گڑھ) اور پروفیسر محمد کاظم (شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے کی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر صبا پروین (شعبہ لسانیات، اے ایم یو علی گڑھ) نے انجام دیا۔

ڈاکٹر امام اعظم (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کولکاتا) نے 'اردو صحافت: زبان کے بدلتے پس منظر کے حوالے سے' پیش کیا۔ انھوں نے اردو صحافت کی علمی، ادبی، سیاسی، ثقافتی، سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ڈاکٹر شکیل اختر (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے 'ریڈیو کی اردو خبریں: ایک تجزیاتی و لسانی ڈسکورس'، ڈاکٹر یامین انصاری (روزنامہ انقلاب، نئی دہلی) نے 'اردو صحافت ماضی تا حال'، ڈاکٹر احمد علی جوہر نے 'اردو صحافت کی زبان ماضی اور حال کے آئینے میں' پیش کیا۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی (شعبہ فلسفہ، اے ایم یو علی گڑھ) اور پروفیسر غضنفر علی (سابق ڈائرکٹر، اردو اکیڈمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے کی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر شمیم فاطمہ (شعبہ لسانیات، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ) نے انجام دیا۔ ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے 'صحافتی زبان: چند قدیم اور موجودہ اردو اخبارات کے حوالے سے'، ڈاکٹر عبدالحئی 'اردو اخبارات کی زبان: ایک مختصر جائزہ'، ڈاکٹر نعمان طاہر نے 'اردو اخبار کی زبان کا اسلوبیاتی تجزیہ'، پروفیسر محمد کاظم نے 'اردو زبان و ادب پر سوشل میڈیا کے اثرات'، ڈاکٹر زبیر احمد نے 'اردو اخبار میں مستعاریت: ایک لسانی مطالعہ'، محمد حنیف خان نے 'اردو اخبارات میں زبان کا استعمال' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔

چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ (سابق صدر، شعبہ لسانیات، اے ایم یو علی گڑھ) اور پروفیسر اعجاز محمد شیخ (کشمیر یونیورسٹی، کشمیر) نے کی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر صبا پروین نے انجام دیا۔

اس اجلاس میں کل 7 مقالات پڑھے گئے۔ جس میں پروفیسر کے ایس مصطفیٰ نے 'دکن میں اخباری اردو کی چند لسانیاتی خصوصیات'، پروفیسر راحت ابرار نے 'اردو صحافت کے 200 سال'، ڈاکٹر سہیل انجم نے 'ہمعصر اردو صحافت کا جائزہ: زبان و بیان کے حوالے سے'، ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے 'تمل ناڈو کے عربی مدارس کی اردو صحافت: اسلوب و روش'، ڈاکٹر سعد بن ضیا نے 'اردو میں سائنسی صحافت کے لسانی تغیرات: ایک تجزیاتی مطالعہ'، ڈاکٹر قسیم اختر نے 'اردو صحافت پر عالمی زبان کے اثرات'، محمد لطیف نے 'جموں و کشمیر میں صد سالہ اردو صحافت کے تاریخی مدارج' شامل ہیں۔

پانچویں اجلاس کی صدارت پروفیسر آفتاب احمد آفاقی (بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس) اور پروفیسر راحت ابرار (سابق ڈائرکٹر اردو اکیڈمی، اے ایم یو علی گڑھ) نے کی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر شمیم فاطمہ نے انجام دیا۔

اس اجلاس میں کل 7 مقالات پڑھے گئے جس میں پروفیسر غضنفر علی کا 'اردو صحافت کا کردار اور موجودہ صورت حال'، مسعود علی بیگ کا 'صحافتی زبان: سمت و رفتار'، پروفیسر اعجاز محمد شیخ کا 'اردو نیوز میڈیا: ایک لسانیاتی جائزہ'، ڈاکٹر شبیر احمد کا 'اردو صحافت کے فروغ میں انگریزی الفاظ کا کردار'، ڈاکٹر سلمان عبدالصمد کا 'زبان و ترسیل، علاقائی تناظر اور صحافت'، ڈاکٹر پلو وشنو کا 'اردو اخبارات: چیلنجز اور امیدیں' شامل ہیں۔

پریس ریلیز: پروفیسر جہانگیر وارثی، شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 13 مئی 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

میری زندگی پر کتابوں کے اثرات

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی نے عالمی یوم کتاب کے موقعے پر ’میری زندگی پر کتابوں کے اثرات‘ پر ایک سمینار کا اہتمام کیا۔ سمینار کا افتتاح نامور پنجابی مصنفہ اجیت کور نے کیا۔ مختلف شعبوں کے نامور افراد میں سے گریشور مشرا، آسکر پوجول، وویابندو سنگھ، سنیل ترویدی، دیپک کرنجی کر، کویتا دویدی، شوبھا شرما، کے کے سریواستو، بھوما ویراولی اور پردیپ سوربھ نے اپنی اپنی تقاریر پیش کیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی نامور پنجابی مصنفہ اجیت کور نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں ہمیشہ ہمیں اچھا انسان بننے کی ترغیب دیتی ہیں۔ کتابوں نے ہمارا باطنی نظریہ تخلیق کیا ہے۔ عالمی یوم کتاب کی قدیم تاریخ بتاتے ہوئے سروینٹس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور سنسکرت کے اسکالر آسکر پوجول نے کہا کہ اسپین کے دارالحکومت بارسلونا میں اسے بہت پہلے منانے کی مثالیں موجود ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جس چیز نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہندوستانی کتاب بھگوت گیتا تھی جس نے ان کی زندگی بدل دی۔ نامور ادیب وی وردھا نے کہا ہم نہیں جانتے کہ کتابیں کب ہماری زندگی میں شامل ہوجائیں گی، لیکن وہ ہماری زندگی بدلنے والی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں کتابوں کا شکرگزار ہونا چاہیے کیونکہ وہ ہمیں پوری دنیا سے جوڑتی ہیں۔ نامور فوکلورسٹ وویابندو سنگھ نے کہا کہ اچھے دوست اور اچھی کتابیں ہماری زندگی میں سب سے اہم چیز ہیں۔ ہم ان کے درمیان آکر ہی اپنا دکھ بھول جاتے ہیں اور دوسروں کے دکھ کو جانتے اور محسوس کرتے ہیں۔ علم کی روشنی صرف کتابوں سے ملتی ہے۔ معروف اداکار اور مصنف دیپک کرنجیکر نے کہا کہ کتابیں ہمیں ہر موڑ پر سکھاتی ہیں۔ ادب سے محبت کرنے والے اور محترم صدر سنیل ترویدی نے کہا کہ کتابیں نہ صرف زندگی کو دلچسپ اور متنوع بناتی ہیں، بلکہ یہ ہمیں جغرافیائی سیر کرنے پر بھی مجبور کرتی ہیں۔ نامور رقاصہ کویتا دویدی نے کہا کہ کتابیں جمع شدہ علم کو دوسروں کے ساتھ بانٹنے کے رجحان کو بھی متاثر کرتی ہیں اور یہ سفر کی حقیقی ساتھی بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے رقص کے سفر میں اڑیا ادب کی تحریک کا بھی ذکر کیا۔ نامور انگریزی مصنف شوبھا شرما نے کہا کہ نئی نسل کو کتابوں سے کیسے جوڑا جائے اس پر گہری بحث کی ضرورت ہے۔ شاعر اور ادیب کے کے سریواستو نے کہا کہ کتابوں کی ہر سطر کا ان کی ترقی میں بڑا ہاتھ ہے۔ شاعر اور مترجم بھوما ویراولی نے کہا کہ گاندھی جی کی سوانح عمری نے ان کی زندگی میں بہت مدد کی۔ معروف ہندی ناول نگار پردیپ سوربھ نے کہا کہ جب ہم کتابیں دوبارہ پڑھتے ہیں تو ہمیں خیالات کی نئی شکلیں ملتی ہیں۔ انھوں نے کتاب کلچر کو محفوظ رکھنے کے لیے مصنفین، قارئین اور اساتذہ کے ساتھ ورکشاپس منعقد کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سری نواس نے سب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں ہمارے تنوع کی اہم ترجمان ہیں نرل کانتی بھٹاچارجی نے پروگرام کے آخری اجلاس کی صدارت کی۔ پروگرام کی نظامت ساہتیہ اکادمی کے ایڈیٹر (ہندی) انوپم تیواری نے کی۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 25 اپریل 2022

شعبۂ عربی کی جانب سے 33واں ان ہاؤس سمینار

نئی دھلی: ریسرچ اسکالرس فورم، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 33 ویں ان ہاؤس سمینار کا پروفیسر فوزان احمد قائم مقام صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں آن لائن انعقاد کیا گیا، جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر صابر نواز، ڈائرکٹر اکادمی آف ایکسیلینس کیرالہ نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں ریسرچ اسکالرس فورم کی سکریٹری ثمینہ خانم نے مہمان خصوصی، اساتذہ کرام اور ریسرچ اسکالرس کا استقبال کیا۔ اس کے بعد شعبے کے ریسرچ اسکالر بہاء الدین نے ’عربی ادب میں ناول کی ابتدا‘ کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا، مقالے کے آغاز میں انھوں نے کہا کہ عربی ادب اور تاریخ کی کتابوں میں ناقدین اس بات پر بحث کرتے نظر آتے ہیں کہ عربی میں ناول کی ابتدا کب اور کس نے کی، اکثر ناقدین اور ادبا محمد حسین ہیکل کو عربی زبان کا پہلا ناول نگار اور ان کے ناول ’زینب‘ کو عربی کا فنی اعتبار سے مکمل پہلا ناول قرار دیتے ہیں جب کہ کچھ لوگ محمد مویلحی کی کتاب ’حدیث عیسیٰ بن ہشام‘ کو عربی کا پہلا ناول شمار کرتے ہیں، ریسرچ اسکالر بہاء الدین نے اپنے مقالے میں عربی ناول کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی ابتدا پر گفتگو کی نیز اس کے فنی اصول پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد بعض اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کی جانب سے مختلف سوالات کیے گئے جن کے جوابات ریسرچ اسکالر نے دیے۔ اس کے بعد ریسرچ اسکالرس فورم کی سکریٹری ثمینہ خانم نے مہمان خصوصی کا تعارف پیش کیا اور انھیں خطاب کی دعوت دی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر صابر نواز نے فورم کے ذمے داروں کو ان ہاؤس سمینارز کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی اور ریسرچ اسکالر بہاء الدین کو ایک علمی اور تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ آج کے اس پروگرام کا موضوع بہت اہمیت کا حامل ہے، انھوں نے ریسرچ اسکالرس کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ کسی بھی موضوع پر رائے دینے سے قبل ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ اس فن کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے بعد اپنی کوئی رائے ظاہر کی جائے، آپ نے اس سمینار میں دعوت دینے کے لیے صدر شعبۂ عربی پروفیسر عبدالماجد قاضی اور فورم کے ایڈوائزر پروفیسر نسیم اختر ندوی اور دوسرے ذمے داروں کا شکریہ ادا کیا اور ریسرچ اسکالر کو اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 24 اپریل 2022

قرآنی خطاطی اور خطاطی ورکشاپ

نئی دھلی: دہلی اردو اکادمی اور ایران کلچر ہاؤس کے اشتراک سے قرآنی خطاطی اور خطاطی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین حاجی تاج محمد نے ایران کے مشہور قاری ابوالفضل نازدار، ڈیزائنر حمزہ قادری، ایرانی خطاط گودرز پناہی آزاد اور ایران کلچرل ہاؤس کے کاؤنسلر ڈاکٹر علی ربانی کا پھولوں

سے استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی اردو کے فروغ کے لیے سرگرم ہے اور قرآنی خطاطی اور اردو خطاطی میں بہت نزدیکی رشتہ ہے۔ ہم اردو کے فروغ کے لیے جو بھی ہوسکتا ہے وہ کوشش کر رہے ہیں اور ایران کلچر ہاؤس کے اشتراک سے فن پاروں کی جو نمائش لگائی گئی ہے یقیناً یہ قابل داد ہے اور ان کے فن اور ہنر کو سراہا جانا چاہیے۔ مہمان اعزازی ایرانی خطاط گودرز پناہی آزاد نے کہا کہ خطاطی کی تاریخ کو ایران میں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، قبل از اسلام اور بعد از اسلام۔ ایران میں اسلام کے بعد سے اس قوم کی توجہ بنیادی رہی اور انھوں نے خطاطی کو اہم نصب العین قرار دیا۔ قرآن اور اسلامی خطاطی میں جو فعالیت ثقافتی اور تہذیبی ہوسکتی تھی ان کی طرف اور اس کے متون کی طرف خصوصی توجہ رہی۔ اوائل اسلام میں جو خط ہے وہ خط کوفی تھا اور جو خط نسخ ہے اس میں ایران کا اہم رول رہا ہے۔ خط نسخ کے بعد بہت سے دوسرے خط ایجاد ہوئے۔ خط ثلث اس کی اہم مثال ہے جو تاج محل کے در و دیوار پر دیکھا جاسکتا ہے۔ آٹھویں صدی آتے آتے خط نستعلیق پہچانا گیا اور آج سب سے زیادہ مقبول خط نستعلیق ہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو یہاں قرآنی خطاطی نمائش لگائی ہے وہ استاد حمزہ قادری کا کارنامہ ہے، جس کے لیے وہ بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آخر میں انھوں نے اردو اکادمی دہلی اور ایران کلچر ہاؤس کا شکریہ بھی ادا کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر علی ربانی کلچرل کاؤنسلر ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی نے اکادمی میں اپنی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ میں جب بھی یہاں حاضر ہوا ہوں ایک نئے ثقافتی پروگرام کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ آج میں ایران کے تین ہنرمند ساتھ لایا ہوں، جن کے فن پاروں سے آپ یقیناً محظوظ ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن کریم لازوال الٰہی سرمایہ ہے، جو اس کے ہنر کا ایک رخ ہے۔ قرآن کریم کو خطاطی کی وجہ سے بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ یہ ایک ایسا فن ہے جو ہند ایران کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ آج ہمارے ساتھ دو اساتذہ موجود ہیں ہم ان سے ورکشاپ میں بہت کچھ سیکھیں گے۔ انھوں نے اکادمی کا شکریہ ادا کیا اور اس امید کا اظہار کیا کہ دونوں ادارے مزید تعاون بڑھائیں تاکہ ہم زیادہ قریب آسکیں۔ اس موقعے پر اردو اکادمی دہلی کے خطاطی مرکز کے طلبہ و طالبات، صوفیہ ایجوکیشنل سوسائٹی خطاطی مرکز کے طلبہ و طالبات اور سنکلپ ایجوکیشنل سوسائٹی کے خطاطی مرکز کے طلبہ و طالبات نے ورکشاپ میں حصہ لیا اور ایرانی خطاط گودرز پناہی آزاد اور حمزہ قادری سے فن کی باریکیاں سیکھنے کی کوشش کی۔ پروگرام کی نظامت مستحسن احمد نے کی۔ یہ خطاطی ورکشاپ اور نمائش صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک جاری رہی۔ طلبہ و طالبات کے علاوہ دہلی کے معزز افراد نے نمائش میں شرکت کی اور قرآنی خطاطی کے نمونوں کی ستائش کی۔ پروگرام میں دہلی کے معروف خطاط قاری لیٰسین کا خصوصی تعاون حاصل رہا اور مترجم کے فرائض مولانا مہدی باقر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اپریل 2022

خسرو کی دہلی

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے توسیعی خطبات سیریز 'دہلی کی تاریخ اور ثقافت' کے عنوان سے دس خطبات پر مشتمل توسیعی خطبات کی ایک سیریز کا سلسلہ جاری

ہے۔ اس سیریز کے تحت دوسرے خطبے 'خسرو کی دہلی' کا انعقاد اردو اکادمی، دہلی کے قمر رئیس سلور جبلی آڈیٹوریم، کشمیری گیٹ میں عمل میں آیا۔ اس کے ذریعے دہلی کے تاریخی واقعات اور دہلی کی تہذیب و ثقافت کو ظاہر کیے جانے کے حوالے سے خطبات پیش کیے جارہے ہیں تاکہ ملک کے ساتھ ساتھ دارالحکومت دہلی کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکے۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز معزز مہمانوں کو گلدستہ پیش کرکے کیا گیا۔ اردو و فارسی ادب کے ممتاز اسکالر اور دہلوی تہذیب کی نمائندہ شخصیت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے توسیعی خطبے میں کہا کہ امیر خسرو نے دہلی کے حوالے سے کافی کچھ لکھا ہے، کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ دہلی میں پیدا نہیں ہوئے تھے، ان کی پیدائش کے حوالے سے مختلف رائے ہے کسی نے پٹیالی تو نئی تحقیق میں وہ دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن انھوں نے اپنے ملک ہندوستان اور دہلی سے ٹوٹ کر محبت کی۔ پروفیسر شریف حسین نے دہلی کی تاریخی حیثیت کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مغلوں سے قبل 349 سالہ دور حکومت میں 43 بادشاہوں نے یہاں حکومت کی تھی، اس طویل دور میں دہلی کی آبادکاری کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے اور نمایاں کام انجام دیے گئے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد ذاکر نے توسیعی خطبے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ شریف صاحب نے کافی محنت کی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ خسرو کی ذات سے ایسا تو ہونا ہی تھا کیونکہ خسرو کے والد ترک تھے لیکن ماں ہندنژاد تھیں اور خسرو کے والد کا انتقال ان کی کمسنی میں ہوگیا تھا، لہٰذا ان کی تربیت میں زیادہ تر حصہ ان کی والدہ کا رہا اور یہی وجہ ہے کہ بارہا انھوں نے اپنے ہندوستانی ہونے پر ناز کیا ہے۔ قبل ازیں وائس چیئرمین اکادمی حاجی تاج محمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وبا کے بعد حالات بہتر ہوتے ہی اردو اکادمی، دہلی کی تمام سرگرمیوں کا آغاز ہوچکا ہے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض نوازش مہدی نے انجام دیے۔ پروگرام میں سامعین کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 اپریل 2022

پرواسی منچ پروگرام

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام پرواسی منچ پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں یوکے سے آئیں مصنفہ دیو ماتھر نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ ان کی کہانی 2050 کو الکا سنہا نے اپنی آواز میں پیش کیا۔ کہانی کا موضوع امریکہ میں بچے پیدا کرنے کی اجازت اور اس سے جڑے مختلف میکینکل مسائل کی وجہ سے مجروح ہونے والے جذبات تھا۔ اس افسانوی کہانی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آنے والے وقت میں کسی بھی قوم کے یہاں بچہ پیدا کرنے کے لیے میاں بیوی کی صحت پیسہ، گھر اور عقل سب سے اہم ہوگی۔ کہانی کا پیغام یہ تھا کہ آنے والے وقت میں کسی بھی قوم کا ہدف یہ ہوگا کہ اس کے ملک میں کوئی غریب، کوئی بیمار اور کوئی بیکار نہیں رہے گا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی لکھی ہوئی چند مختصر نظمیں اور غزلیں پیش کیں جو کہ عورت کے مزاج پر نہایت حساس انداز میں لکھی گئیں۔ میری خاموشی کے عنوان سے اپنی نظم میں انھوں نے خاموشی کو بچہ دانی سے تشبیہ دی ہے۔ نظم دائرے میں انھوں نے اس جانور میں عورت کی جمود کی زندگی کی تمثیل پیش کی جو مضبوط ہونے کے باوجود ایک مخصوص دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔ حاضرین محفل میں موجود انل جوشی، لکشمی شنکر باجپائی، الکا سنہا، نارائن کمار، وگیان ورات، راما پانڈے، ریکھا تسیٹھی، سادھنا اگروال، نریش شانڈیلیا وغیرہ نے اپنے خیالات کا

اظہار کیا۔ اوم نشل، بی ایل گوڑ، جتیندر سونی، بلرام اگروال وغیرہ کئی نامور ادیب موجود تھے۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سری نواس راؤ نے ساہتیہ اکادمی کی کتابیں پیش کرتے ہوئے دیویا ماتھر کا خیر مقدم کیا۔ پروگرام کی نظامت ساہتیہ اکادمی کے ایڈیٹر (ہندی) انوپم تیواری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اپریل 2022

اترپردیش

مولانا محمد باقر کی حیات وخدمات

مراد آباد: ملک کی آزادی میں صحافت اور صحافیوں کا اہم کردار رہا ہے۔ ان صحافیوں میں مولانا محمد باقر کا نام اہم ہے۔ مولانا محمد باقر دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر اور پہلے شہید صحافی ہیں۔ انگریزوں کی حکومت اور ان کے ظلم و زیادتی کے خلاف مضامین لکھنے کی پاداش میں 16 ستمبر 1857 کو انھیں توپ سے اڑا کر شہید کردیا گیا۔ ان خیالات کا اظہار معروف آرٹس اور شعبہ فائن آرٹ کے صدر پروفیسر نریندر کمار سنگھ نے ایم ایچ ڈگری کالج میں منعقدہ سمینار میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ ایم ایچ ڈگری کالج میں شعبہ اردو و شعبہ فائن آرٹ کے اشتراک سے اردو کے عظیم صحافی مولانا محمد باقر کی صحافتی خدمات کے موضوع پر سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کا افتتاح کالج کے پرنسپل سدھیر کمار اروڑا، پروفیسر نریندر کمار سنگھ، ڈاکٹر رویش کمار اور ڈاکٹر عبدالرب، ڈاکٹر اسماعزیز کے بدست عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک نریندر کمار سنگھ نے مولانا باقر کی حیات وخدمات پر گفتگو کرتے ہوئے موجودہ صحافت کی صورت حال پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ اس موقعے پر راج کمار نے بھی صحافت اور صحافیوں کی ذمہ داریوں سے متعلق گفتگو کی۔ رویش کمار نے کہا کہ مولوی باقر کو سچ بولنے اور حق کی آواز بلند کرنے کی پاداش میں شہید کردیا گیا۔ ایم ڈگری کالج کے طلبہ وطالبات نے بھی مضامین پیش کیے جن میں عالم نجمی، مبینہ رحمٰن وغیرہ شامل تھے۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 اپریل 2022

ماس میڈیا میں عصری مسائل

میرٹھ: چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کیمپس میں واقع تلک اسکول آف جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن میں 'ماس میڈیا میں عصری مسائل' کے موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں مہاتما گاندھی سنٹرل یونیورسٹی سے آئے ڈاکٹر ساکیت رمن نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صحافت میں شفافیت کا اہم کردار ہوتا ہے۔ آن اسکرین اور آف اسکرین صحافت میں تنوع ہے۔ اس لیے آپ کو اپنی امیج بنانے پر کام کرنا چاہیے۔ ایک بار شبیہ خراب ہوجائے تو پھر اسے ٹھیک کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ سنسنی خیز صحافت کریں مگر حقائق کے ساتھ پیش کریں۔ حقائق کے بغیر سنسنی خیز خبروں سے گریز کیا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اپنی امیج بنانا 21 ویں صدی میں اہم نکتہ ہوسکتا ہے۔ ڈیجیٹلائزیشن میں اضافہ ہوگا۔ ڈیجیٹل کا ذریعہ کثیر جہتی ہوسکتا ہے۔ اس کے بہت سے فوائد اور نقصانات بھی ہیں۔ اس کے باوجود اس کا رجحان آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ تلک اسکول آف جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن کے ڈائرکٹر پروفیسر پرشانت کمار نے سب کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر منوج کمار شریواستو نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد شعبے میں کوئز اور ڈیبیٹ مقابلے کا انعقاد کیا گیا، جس میں شعبے کے 40 سے زائد طلبہ نے شرکت کی۔ کوئز مقابلے میں دیوورت پہلے، انشراح دوسرے اور اریت شرما تیسرے نمبر پر رہے، جب کہ مباحثہ مقابلے میں سوریہ پرتاپ پہلے اور بھارت ادھانا دوسرے نمبر پر رہے۔ جیتنے والے طلبہ کو اعزاز سے نوازا گیا، اس دوران اجے متل، لوکمار، امریش پاٹھک، بینم یادو، متیندر کمار گپتا، جیوتی ورما، اپیش ویکشت وغیرہ موجود تھے۔ انوشکا چودھری، ساحل، آیوشی بھڈانا، وارنا اگروال، ویشا تومر، گروکشواہا نے خصوصی تعاون کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 اپریل 2022

مولانا آزاد میموریل اکادمی میں سرسید اور مولانا آزاد کی صحافت پر ویبینار

لکھنؤ: مولانا آزاد میموریل اکادمی کے زیر اہتمام اردو صحافت کی دوصدی تقریبات کے موقعے پر سرسید اور مولانا آزاد کی صحافت کے حوالے سے کل ہند ویبینار کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ صحافت پروفیسر شافع قدوائی نے کی جس میں یونیورسٹی آف کامرس پٹنہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر صفدر امام قادری، رانچی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر جمشید قمر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ڈاکٹر عمیر منظر، اموبا کے جوائنٹ سکریٹری عاطف حنیف نے شرکت کی۔ نظامت اکادمی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی نے کی۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے الہلال کے امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے چند ایسے اہم حوالوں کی روشنی میں گفتگو کی جو اس سے پہلے عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ پروفیسر جمشید قمر نے ویبینار کی مرکزی تھیم کو پیش کرتے ہوئے سرسید اور آزاد کے تعلق سے چند اہم سوالات سامنے رکھے۔ پروفیسر صفدر امام نے کہا کہ دوصدی تقریبات کے سلسلے میں ان دو نابغۂ روزگار صحافیوں کے صحافتی کاموں کا جائزہ لینے اور تفصیلی بحث کرانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہم سمجھ سکیں گے کہ ان میں مماثلت کتنی ہے اور مغائرت کتنی ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شافع قدوائی نے یہ بات واضح کی کہ سرسید اور مولانا آزاد دونوں اصحاب ایسے دانشور ہیں جنھوں نے اپنے عصر کے مزاج کو سمجھا اور ایک ایسی فکر کی بنیاد رکھی جس نے وسیع المشربی کے علاوہ انسان دوستی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی نے شرکا و ناظرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اپریل 2022

بہار

فروغ اردو سمینار

سیتامڑھی: ضلع کے 50 ویں یوم تاسیس پر منعقدہ دیگر تقریبات کے درمیان اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار کے تعاون سے فروغ اردو سمینار اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس کا آغاز باضابطہ طور پر ضلع کی سینئر ڈپٹی کلکٹر رنجنا کماری کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی حلاوت اور اس کی مٹھاس ہمیشہ محسوس کی جاتی ہے۔ گفتگو یا تحریر میں آپ جہاں تلاش کریں اردو اپنی شناخت اور انفرادیت کے ساتھ ملے گی۔ اسے اپنے گھروں، چوک چوراہوں اور عام مقامات سے لے کر عام ماحول میں جہاں بھی ممکن ہوسکے فروغ دیجیے، یہ ہم سب کی ذمے داری ہے، خود بھی سیکھیے اور اپنے بچوں کو بھی سکھایئے۔ اردو ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے، جب تک ہم آپ اس کے فروغ میں اپنا حصہ درج نہیں کرائیں گے تب تک کہنے اور سننے سے نہیں ہوگا۔ ڈی ڈی سی سیتامڑھی نے کہا کہ اردو دنیا کی سب سے میٹھی زبان ہے۔ انھوں نے خود کو کلیم عاجز جیسے دیندار شاعر کے کلام کا دیوانہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ فیض احمد فیض اور مرزا غالب جیسے دیگر عظیم شاعروں کا اردو کے فروغ میں اہم کردار ہے۔ ظفر حبیبی، جمیل اختر شفیق، شمیم قاسمی، شاعرہ صدف، آشا پربھات، محمد پرویز کے علاوہ درجنوں شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس دوران ڈاکٹر ساجد علی خان نے بھی خطاب کیا۔ بطور خاص راشد فہمی، خلیل انصاری، محمد شفیق خان، ڈاکٹر رضی حیدر اجالا، علاء الدین بسمل سمیت درجنوں افراد موجود تھے۔ پروگرام کے انعقاد میں حاجی پھول حسن اور عبدالصمد ملازم اردو زبان سیل پیش پیش تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اپریل 2022

اعزاز و اکرام

اردو اکادمی دہلی کے سالانہ ایوارڈ 2019-20 اور 2021-22 کا اعلان

نئی دھلی: دہلی اردو اکادمی کے چیئرمین منیش سسودیا نے ممبران گورننگ کونسل اور مختلف اردو اداروں کی آرا کی روشنی میں اکادمی کے 2019-20 اور 2021-22 کے سالانہ ایوارڈز مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان ایوارڈز کی اطلاع اکادمی کے وائس چیئرمین حاجی تاج محمد اور سکریٹری اکادمی محمد احسن عابد کے ذریعے جاری کی گئی۔ سال 2019-20 کے لیے 'کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' ممتاز ادیبہ و فکشن نگار جیلانی بانو (حیدرآباد) کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ 'پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ' ممتاز ادیب و ناقد سابق صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی پروفیسر شریف حسین قاسمی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ دونوں ایوارڈ دو لاکھ اکیاون ہزار روپے نقد، سند، شال اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔ علاوہ ازیں (1) ایوارڈ برائے تحقیق تنقید صاحب علم بصیرت اور محقق و نقاد پروفیسر صادق کو (2) ایوارڈ برائے تخلیقی نثر معروف افسانہ نگار محترمہ بلقیس ظفیر الحسن کو (3) ایوارڈ برائے شاعری ممتاز شاعر و ناظم مشاعرہ شکیل جمالی کو (4) ایوارڈ برائے اردو صحافت معروف صحافی وسیم الحق کو (5) ایوارڈ برائے بچوں کا ادب ڈاکٹر عادل حیات کو (6) ایوارڈ برائے فنون لطیفہ معروف قوال غلام صابر غلام وارث کو اور (7) 'کل ہند ایوارڈ برائے فروغ اردو' معروف نغمہ نگار گلزار (ممبئی) کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ایوارڈز ایک لاکھ ایک ہزار روپے فی کس نقد، شال، سند اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔ سال 2021-22 کے لیے 'کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' ممتاز ادیب محقق و نقاد پروفیسر عبدالستار دلوی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ 'پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ' ممتاز ادیب و ناقد سابق صدر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شمس الحق عثمانی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ دونوں ایوارڈ دو لاکھ اکیاون ہزار روپے نقد سند، شال اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ (1) ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید ممتاز ناقد و ادیب پروفیسر خواجہ اکرام الدین کو (2) ایوارڈ برائے تخلیقی نثر معروف افسانہ نگار محترمہ نعیمہ جعفری پاشا کو (3) ایوارڈ برائے شاعری ممتاز شاعر اقبال اشہر کو (4) ایوارڈ برائے اردو صحافت معروف صحافی اسد رضا کو (5) ایوارڈ برائے اردو ڈراما پروفیسر محمد کاظم کو (6) ایوارڈ برائے ترجمہ پروفیسر اسدالدین کو اور (7) 'کل ہند ایوارڈ برائے فروغ اردو' عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈز ایک لاکھ ایک ہزار روپے فی کس نقد، شال، سند اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اپریل 2022

پروفیسر حمید سہروردی

گلبرگہ: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی نے پروفیسر حمید سہروردی کو اردو زبان و ادب کی مجموعی خدمات پر اپنے

باوقار مرزا غالب قومی ایوارڈ سے سرفراز کیے جانے کا اعلان کیا ہے یہ قومی ایوارڈ ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ پروفیسر حمید سہروردی کا شمار ساتویں دہائی کے مقبول ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں چار افسانوی مجموعے خاصان علم و ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ حمید سہروردی کے فکر و فن پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے اور کئی کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔ اردو دنیا میں حمید سہروردی کو قومی ایوارڈ ملنے پر اظہار مسرت کیا جا رہا ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، کرناٹک، 20 اپریل 2022

سید وجاہت شاہ اور عبداللہ عثمانی

دیوبند: سماجی تنظیم 'ایکتا ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر' کے زیراہتمام منعقدہ ایک پروگرام میں سینئر قلمکار اور ٹیچر سید وجاہت شاہ، سینئر استاد اور ادیب عبداللہ عثمانی اور اے آر پی اسلام الرحمٰن کو تعلیمی، صحافتی اور تحریری میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں اعزاز سے نوازا گیا۔ محلہ خواجہ بخش میں واقع اردو ٹیچر اسعد صدیقی کی رہائش گاہ پر منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے سینئر ٹیچر ڈاکٹر شاداب خان نے کہا کہ "سید وجاہت شاہ نے 28 بے مثال سال تدریس، تصنیف اور اساتذہ کی سماجی خدمت کے میدان میں دیے، انھوں نے درجنوں کتابیں اور سیکڑوں مضامین لکھ کر سماج کو نئی راہ دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے، حال میں ان کے ذریعے شائع کیا گیا 'دیوبند ٹوڈے' کا 100 واں شمارہ قابل تعریف ہے۔ اس دوران سید وجاہت شاہ اور عبداللہ عثمانی نے تنظیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے تعلیمی اور قلمی سفر پر روشنی ڈالی۔ نظامت سماجی کارکن انصار مسعودی نے کی اور صدارت سینئر استاد ڈاکٹر شاداب خان نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 اپریل 2022

حکیم اجمل خاں گلوبل ایوارڈز 2021

نئی دھلی: مسیح الملک حکیم اجمل خاں میموریل سوسائٹی (رجسٹرڈ) کی جانب سے آج دلی میں منعقد ایک پریس کانفرنس میں 'حکیم اجمل خاں گلوبل ایوارڈ 2021' کا اعلان کیا گیا۔ اس موقعے پر مختلف شعبوں میں بہترین خدمات انجام دینے والے 25 ممتاز افراد کو ایوارڈ سے نوازے جانے کا اعلان کیا گیا۔ جن میں حکیم محمد طارق اصلاحی (ممبئی)، برائے بہترین یونانی معالج، ڈاکٹر محمد روشن (راجستھان) برائے بہترین یونانی معالج، ڈاکٹر نیاز احمد فاز (کولکاتا) برائے بہترین یونانی معالج، ڈاکٹر واصف ارباب (دہلی) برائے بہترین یونانی معالج، ڈاکٹر مطیع اللہ مجید (اتراکھنڈ) برائے بہترین یونانی معالج، ڈاکٹر افروز فاطمہ (بنگلورو) برائے بہترین معالج یونانی، حکیم محمد حامد اصلاحی (اصلاحی دواخانہ، ممبئی) برائے بہترین یونانی دواساز کمپنی، ڈاکٹر عامر طیبی (طیبی دواخانہ یونانی پرائیویٹ لمیٹڈ، اندور) برائے بہترین یونانی دواساز کمپنی، حکیم کوثر احمد (جعفا دردمند دواخانہ، سنبھل، یوپی) برائے بہترین یونانی کلینک، حکیم فخر عالم (علی گڑھ)، برائے بہترین تنظیمی و سماجی طبی خدمات، ڈاکٹر مصباح الدین اظہر عالم (علی گڑھ) برائے بہترین تنظیمی و سماجی طبی خدمات، ڈاکٹر وندنا سروہا (دہلی) برائے بہترین تنظیمی و سماجی ویدک خدمات، حکیم محمد خبیب بقائی (نئی دہلی) برائے بہترین حجامہ معالج، ڈاکٹر روبینہ اسد (نئی دہلی) برائے بہترین حجامہ معالج، ابھیشار شرما (راسناتھ گوینکا ایوارڈ یافتہ، کی خدمات جلیلہ کا اعتراف) محمد فخر امام (ریزیڈنٹ ایڈیٹر، روزنامہ راشٹریہ سہارا) برائے بہترین اردو صحافت، محمد وسیم اکرم تیاگی برائے بہترین ہندی صحافت، سید محمد اکرم رحمان برائے بہترین الیکٹرونک میڈیا صحافت، ڈاکٹر محمد محسن ولی برائے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ برائے انسانی خدمات، مجیب اختر عثمانی برائے طبی نظام کی بہتری، مبین احمد خان برائے طبی نظام کی بہتری، کاشف نسیم برائے طبی نظام کی بہتری، الحرمین فارما انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، غازی آباد (یوپی) برائے مارکیٹنگ اینڈ پروموشن کمپنی آف یونانی و آیوریدک میڈیسن شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم اپریل 2022

خبر نامہ

اجرا

این آئی آف پرسپشن

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے دہلی پبلک اسکول کی دسویں جماعت کے طالب علم محمد ایان کے شعری مجموعے 'این آئی آف پرسپشن' کا اجرا کیا۔ یہ شعری مجموعہ لاک ڈاؤن کے دوران لکھی گئی نظموں پر مشتمل ہے جو مرحوم ڈاکٹر محمد یوسف انصاری (شعبۂ انگریزی اے ایم یو) کی یاد میں وقف ہے۔ ڈاکٹر انصاری، ایان کی رہنمائی کرتے تھے اور ان کی نظموں پر نظرثانی کرتے تھے۔ رسم اجرا کے موقعے پر ایان کے والد ڈاکٹر ایم فرحان فاضلی (کنوینر، ہیریٹیج سیل، اے ایم یو) ان کی والدہ زیبا شمیم، ڈاکٹر سید محمد نعمان طارق اور فراز فاروق موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 اپریل 2022

سنگھاسن بتیسی

لکھنؤ: اودھ ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام صحافی، ماہر تعلیم، سماجی کارکن، ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کی شاعری کی تصنیف 'سنگھاسن بتیسی' کی رونمائی قومی کتاب میلہ چلڈرن میوزیم لان، چارباغ، لکھنؤ میں ہوئی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر وی. جی. گوسوامی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کی ادبی اور صحافتی خدمات کا اتنے کم وقت میں احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ ایک لفظ میں ان کو اگر علم کا بحر زخار کہوں تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ ان کی ادبی، صحافتی و شعری خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس رسم رونمائی میں مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر محمد مزمل، سابق وائس چانسلر، شری مہیش چندر دویدی، پروفیسر اوشا سنہا، پروفیسر اوم پرکاش پانڈے، اطہر نبی اور سینئر صحافی اور ادیب پی ہریوم شرما وغیرہ خاص طور سے موجود رہے۔ سب سے پہلے اسٹیج پر موجود مہمانوں نے ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کے شعری مجموعے 'سنگھاسن بتیسی' کا اجرا کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کی شخصیت اور ان کے ادبی کاموں پر تفصیلی گفتگو کی۔ پروگرام میں موجود میڈیا اہلکاروں نے ان کی زندگی کے سفر، ادبی کارناموں اور مختلف موضوعات پر کثیر تصانیف سے متعلق بہت سے سوالات کیے جن کے مختصر جوابات ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی نے دیے۔ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی نے اجرا ہونے والے شعری مجموعے 'سنگھاسن بتیسی' سے کچھ کمپوزیشن بھی سنائیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 اپریل 2022

رفتار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سالانہ مجلّہ 'رفتار' (21-2020) کا اپنے دفتر میں اجرا کرتے ہوئے شیخ الجامعہ پروفیسر طارق منصور نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ 'رفتار' کا ہر شمارہ نہ صرف پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے، بلکہ اس کا ہر شمارہ تاریخی اہمیت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے شعبۂ اردو کے اراکین اور خصوصی طور پر مرتبین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس مجلّے میں طلبہ کی کارکردگیوں کو بھی زیادہ سے زیادہ شامل کرنا چاہیے تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے اور بہتر انداز میں ان کی صلاحیتوں کی نمائندگی کر سکے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو، پروفیسر محمد علی جوہر نے اس بات کی وضاحت کی کہ شعبۂ اردو کے طلبہ نے زندگی کے مختلف میدانوں میں جب بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، شعبے سے وابستہ تمام اساتذہ نے ان کی کاوشوں کو سراہا ہے اور شعبے کے سالانہ مجلّے میں ان کی کامیابیوں کو نمایاں طریقے سے پیش بھی کیا ہے۔ پروفیسر جوہر نے شیخ الجامعہ کا خصوصی شکریہ ادا کیا جن کی عنایتوں کے سبب، سخت حالات میں بھی 'رفتار' کی اشاعت، پابندی کے ساتھ جاری رہی۔ اجرا کے موقعے پر شعبۂ اردو کے سینئر اساتذہ میں پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر شہاب الدین ثاقب، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، پروفیسر سراج اجملی اور ڈاکٹر راشد انور راشد بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 8 اپریل 2022

عبدالرحیم نشتر کی شعری خدمات

رتناگری: ڈاکٹر محمد دانش غنی کی تصنیف 'عبدالرحیم نشتر کی شعری خدمات' کی تقریب رونمائی گوگٹے جوگلے کر

کالج کے زیر اہتمام رادھابائی شیٹے سبھاگرہ میں انجام پذیر ہوئی۔ اس پرشکوہ تقریب کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پی پی کلکرنی نے فرمائی اور کتاب کا اجرا رتناگری ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکریٹری جناب ستیش شیوڑے کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مہمانان کی حیثیت سے ڈاکٹر عبداللہ امتیاز (صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر نورالامین (شعبۂ اردو، شاردا کالج، پربھنی) نے شرکت کی۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے جناب ستیش شیوڑے نے کہا کہ میں محمد دانش غنی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے عبدالرحیم نشتر کی شخصیت اور شاعری پر لکھے گئے مضامین، تبصرے اور خطوط کو ترتیب دے کر ایک بڑا کام انجام دیا ہے جو ان کی تحقیقی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت کا بین ثبوت ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ امتیاز نے اپنے خطاب میں کہا کہ عبدالرحیم نشتر جدید اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ ریاست مہاراشٹر کے جن شعرا نے جدید شاعری اور جدید غزل کو شناخت دی ان میں نشتر صاحب پیش پیش رہے ہیں۔ شاعری میں ان کا ایک اور کام بچوں کے لیے کہی نظمیں بھی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری پر ایک کتاب کی بے حد ضرورت تھی۔ ڈاکٹر محمد دانش غنی نے نہ صرف حق فرزندی ادا کیا ہے بلکہ اس کتاب کو مرتب کرکے ادب اور شاعری میں نشتر صاحب کے مقام اور خدمات کا تعارف بھی کرایا ہے۔ ڈاکٹر نورالامین نے اپنی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر محمد دانش غنی ایک پاک طینت معصوم اور پرجوش قلم کار ہیں۔ انھیں تنقید اور ترتیب و تدوین سے یکساں رغبت ہے۔ گوگٹے جوگلے کر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پی پی کلکرنی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد دانش غنی کی ساتویں کتاب 'عبدالرحیم نشتر کی شعری خدمات' کی رونمائی ہو رہی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ علاوہ ازیں گوگٹے جوگلے کر کالج رتناگری کے شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر شاہو مدھالے اور شعبۂ سماجیات کے صدر پروفیسر تلسی داس روکڑے نے بھی ڈاکٹر محمد دانش غنی کی شخصیت کے حوالے سے بات کی۔ اس موقعے پر کالج کے مختلف شعبے کے طلبا و طالبات کے علاوہ سمیر کھوت اور کوکن اور بیرون کوکن سے آئے ہوئے ادب نواز حضرات شریک تھے۔

پریس ریلیز: دانش غنی، کرناٹک، 6 اپریل 2022

خوابوں کے مرثیے

نئی دھلی: دہلی کی ادبی برادری نے عرصے بعد ایسی دلکش اور زندہ ادبی محفل دیکھی ہوگی جب نوجوان شاعر سفیر صدیقی کے شعری مجموعے 'خوابوں کے مرثیے' پر

مذاکرے کے لیے نئے پرانے ادبی ستاروں کی ایک تابناک کہکشاں سجی ہوئی تھی۔ ایک ایسی بزم جس کی صدارت عہد حاضر کے سب سے بڑے غیر افسانوی نثرنگار پروفیسر خالد محمود نے فرمائی۔ پروفیسر شہپر رسول جیسے ممتاز شاعر کے دستِ مبارک سے سفیر صدیقی کے شعری مجموعے کا اجرا عمل میں آیا۔ ممتاز وجودی فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید نے بحیثیت مہمان خصوصی انجمن کی رونق میں اضافہ کیا۔ مزید سونے پر سہاگہ یہ کہ صاحب طرز ادیب ونقاد حقانی القاسمی نے بحیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ اس مذاکرے کی نظامت کے فرائض ادیب وشاعر ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے۔ اس ادبی جلسے کی امتیازی خصوصیت یہ رہی کہ یہاں سفیر صدیقی کے مجموعۂ کلام پر محض رسمی کارروائی کے بجائے ایک زندہ، بامعنی اور ذہانت آمیز ادبی ڈسکورس کی بزم بپا ہوئی، جس میں معین شاداب، ڈاکٹر فیضان شاہد، عبدالباری صدیقی، تفسیر حسین، ذیشان رضا اور جمیل سرور جیسے نئی نسل کے ذہین اور باصلاحیت اسکالروں نے سفیر صدیقی کے تخلیقی امتیازات پر مختلف الجہات اور خیال انگیز مکالمہ قائم کیا۔ سفیر صدیقی کے حوالے سے فیض حمیدی کے دلچسپ خاکے نے محفل کو ایک نئے رنگ سے ہم آہنگ کرنے میں خوبصورت کردار ادا کیا۔ عبدالرحمن عابد، فیض رضوی، وسیم رفیع، داؤد احمد اور آصف بلال نے کلامِ سفیر کے انتخاب اور اس کی بلند خوانی سے مذاکرے کی فضا مزید سازگار کر دی۔

پروفیسر خالد محمود نے سفیر صدیقی کو موت اور زندگی کا ایک پختہ کار شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ سفیر کی شاعری میں زیادہ تر موت اور اس کے لوازم تلاش کیے جاتے ہیں، حالانکہ ان کے کلام میں زندگی کی دوسری جہتیں زیادہ روشن بھی ہیں اور توانا بھی۔ سفیر صدیقی کا اہم اختصاص ان کی بلوغتِ فکر وخیال اور اسلوب کی صلابت ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ سفیر صدیقی صرف ادب کے ہی نہیں بلکہ مسکراہٹوں کے بھی سفیر ہیں۔ وہ ظاہری ڈھونگ یعنی مجنونانہ حلیہ اور بے ترتیب زلف وریش بڑھا کر جھوٹا شاعر بننے پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کی ساری توجہ اپنے داخلی کرب اور تخلیقی وتخیلی استحکام پر مرکوز ہے۔ سفیر صدیقی کے یہاں بصارت کے بصیرت میں بدلنے کا تخلیقی عمل بے حد توانا ہے۔ پروفیسر خالد جاوید نے سفیر کو ایک وجودیاتی شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ خودکشی اور موت کے تشکیلی عناصر اور خواب، سفیر کو عہد حاضر کے تخلیقی منظرنامے میں امتیازی شناخت عطا کرتے ہیں۔ حقانی القاسمی نے سفیر صدیقی کی شاعری کو درون اور بیرونِ ذات تصادمات کے حوالے سے ایک پرقوت تخلیقی اظہاریے سے تعبیر کیا۔ پروگرام کا آغاز عبدالرحمن عابد کی تلاوت اور اختتام فورم فار انٹلکچول ڈسکورس کے جنرل سکریٹری منظر امام کے اظہارِ تشکر پر ہوا۔ اس موقع پر ماہنامہ یوجنا کے مدیر عبدالمنان، ڈاکٹر نعمان قیصر، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر شاہنواز فیاض، ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی، اوکھلا پوسٹ کے بانی زبیر سعیدی، اردو تاک کی نمائندہ زمرین فاروق، انس خان، عفیف سراج، خالد اخلاق اور نوید یوسف کے علاوہ بڑی تعداد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو اور دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 12 اپریل 2022

سیف عثمانی کی دو کتابوں کا اجرا

دیوبند: ہندز رسنگ ہوم دیوبند کی جانب سے شیخ الہند ہال میں دیوبند کے نوجوان ادیب وشاعر عبدالرحمن سیف عثمانی کی دو کتابوں 'چاہتوں کا شہر' اور 'فی الحال' کا اجرا ممتاز علمی شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت رابطہ عالم اسلامی کے رکن مولانا قاری ابوالحسن اعظمی نے کی اور نظامت کے فرائض سید وجاہت شاہ نے ادا کیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر تابش مہدی نے کہا کہ عبدالرحمن کی کتاب چاہتوں کا شہر پڑھنے کے بعد ان کے قلم کی روانی اور اندازِ نگارش سے دل شاداب ہوجاتا ہے، بلاشبہ عبدالرحمن کا یہ سفرنامہ ان کے محبت بھرے دل کا مظہر ہے اور ان کی دوسری کتاب جو شعری مجموعہ ہے اس میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا عکس نمایاں ہے۔ پروفیسر تنویر چشتی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عبدالرحمن سیف عثمانی نظم سے زیادہ نثر میں خود کو مضبوطی کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولانا ندیم الواجدی نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ عبدالرحمن جب کسی منظر یا مقام کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کو اس خوبصورتی سے تحریر کرتے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو اسی سفر میں اسی مقام پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ نوائے قلم کے بانی اور دارالعلوم وقف کے استاد مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کہا کہ موجودہ دور میں عبدالرحمن سیف کی تحریریں صحرا میں کسی چشمے کی مانند نظر آتی ہیں، جامعہ طبیہ دیوبند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر انور سعید نے کہا کہ عبدالرحمن سیف کی تحریریں زبان کی حلاوت بھی عطا کرتی ہیں اور اردو کا سرور بھی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 اپریل 2022

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مہم

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی درحقیقت 1877 ہی میں قائم ہوگئی تھی، جب ایم اے او کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، کیونکہ کالج کا یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہونا اسی تحریک کا حصہ ہے جس کی قیادت سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے کی اور بعد میں اسے علی گڑھ تحریک کے مشعل برداروں نے جاری رکھا۔'' ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور کیا۔ وہ ڈیوڈ لیلیو یلڈ اور گیل مینالٹ کی مشہور تصنیف 'دی کمپین فار اے مسلم یونیورسٹی 1898-1920' کے اردو ترجمے 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مہم 1898-1920' کا اجرا کررہے تھے۔ تقریب کا اہتمام سرسید اکادمی میں کیا گیا تھا۔ کتاب کے مترجم عبدالصبور قدوائی کو مبارکباد دیتے ہوئے پروفیسر منصور نے کہا کہ اس طرح کی کتابوں کا ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں میں بھی ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دوسری ریاستوں کے لوگ علی گڑھ تحریک کی تاریخ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اے ایم یو کے قیام کی جدوجہد کے اہم مراحل کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر منصور نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر متعلق کتابوں، خاص طور سے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب کو شائع کرنے کی تجویز سے اتفاق کیا۔ پروفیسر شافع قدوائی نے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مہم کے اہم

سنگ میل اور نشیب وفراز پر گفتگو کی۔ پروفیسر قدوائی نے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، سر آغا خاں، محمد علی جوہر وغیرہ کی سرگرمیوں کا حوالہ دیتے ہوئے ہندوستان میں مدراس، کلکتہ اور ممبئی میں قائم ہونے والی اولین یونیورسٹیوں کا ذکر کیا۔ قبل ازیں پروفیسر علی محمد نقوی، ڈائرکٹر، سرسید اکادمی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور سرسید اکادمی کی تحقیقی اور اشاعتی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔ سرسید اکادمی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شاہد نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ علی گڑھ تحریک کا مقصد آغاز ہی سے ایک یونیورسٹی کا قیام تھا اور جسٹس سید محمود نے 1873 میں ایم اے او کالج فنڈ کمیٹی کے اجلاس میں واضح طور پر اس کا ذکر کیا تھا۔ سرسید نے بھی اپنے انتقال سے قبل ایک تقریر میں کہا کہ میں آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر یونیورسٹی بنانا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر شاہد نے پروفیسر کے اے نظامی کی تحریر کردہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کو شائع کرنے پر زور دیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 اپریل 2022

اترتی دھوپ کی پرچھائیاں

نئی دهلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی میں پروفیسر اختر الواسع کی نئی مرتبہ کتاب 'انتخاب کلام' پی پی سریواستو رند بعنوان 'اترتی دھوپ کی پرچھائیاں' کی تقریب رونمائی عمل میں آئی جس میں دلی کی مختلف علمی وادبی شخصیات

نے شرکت کی۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر اختر الواسع (سابق چیئرمین، دہلی اردو اکادمی) نے کی جب کہ مہمان خصوصی ساقی نارنگ تھے۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پروفیسر احمد محفوظ (صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور دلی یونیورسٹی سے پروفیسر خالد علوی نے بحیثیت مقرر شرکت کی۔ ابتدائی کلمات انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے ادا کیے۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پی پی سریواستو رند کی شاعری میں جدید اور قدیم کی ایسی آمیزش ہے کہ اسے پڑھ کر اردو شاعری کا قاری حیران رہ جاتا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد علوی نے رند صاحب کا اردو سے جو رشتہ ہے اس کا اظہار کیا۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ رند صاحب کا کلام اپنے بزرگوں سے مستعار نہیں بلکہ ان کی روشنی سے سرشار ہے۔ صدارتی کلمات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو میں پی پی سریواستو جیسی شخصیات اب نا کے برابر ہیں۔ اردو زبان کو فروغ دینے میں ان کا کردار بہت عظیم ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ حکومت ہند کے مختلف شعبوں میں اس اردو زبان کو داخل کرنے کی سعی کی بلکہ اردو کی مشترکہ تہذیب کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ تقریب کے اختتام پر پی پی سریواستو رند نے شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے زور دے کر یہ کہا کہ اردو زبان کے لیے ان کا دل ہمیشہ دھڑکتا رہا ہے، یہی سبب ہے کہ جس زمانے میں سہارا نے مختلف زبانوں میں اخبارات اور رسائل نکالنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے سہارا شری سبرت رائے سے تاکیداً اردو اخبار اور اردو کا رسالہ جاری کروایا اور اس میں بحیثیت سرپرست اپنی خدمات عرصے تک انجام دیں۔ اس تقریب میں شہر کی مختلف معروف شخصیات نے شرکت کی جن میں معین شاداب، ملک زادہ جاوید، رؤف رامش، راجنی شرما اور محمد ساجد کے نام قابل ذکر ہیں۔ تقریب کی نظامت کے فرائض تالیف حیدر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 اپریل 2022

وفیات

سنتور نواز شیو کمار شرما

ممبئی: سنتور نواز پنڈت شیو کمار شرما کا 10 مئی کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 84 برس تھی۔ پنڈت شرما پچھلے چھ ماہ سے ڈائیلاسز پر تھے۔ ڈائیلاسز پر

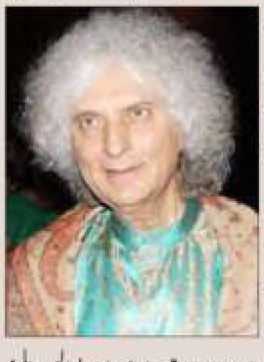

ہونے کے باوجود وہ متحرک تھے۔ پنڈت شرما نے 1956 میں شانتا رام کی فلم جھنک جھنک پائل باجے کے ایک منظر کے لیے پس منظر کی موسیقی ترتیب دی تھی اور 1960 میں اپنا پہلا سولو البم ریلیز کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے پنڈت ہری پرساد چورسیا کے ساتھ مل کر کئی ہندی فلموں جیسے سلسلہ (1981)، لمحے (1991)، چاندنی (1989)، ڈر (19993)، پرمپرا (1993) کے لیے موسیقی تیار کی تھی۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے 10 مئی منگل کے روز سنتور بجانے کے ماہر پنڈت شیو کمار شرما کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ مسٹر مودی نے کہا "پنڈت شیو کمار شرما جی کے انتقال سے ہماری ثقافتی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے سنتور کو عالمی سطح پر مقبول بنایا۔ ان کی موسیقی آنے والی نسلوں کو مسحور کرتی رہے گی۔ مجھے ان کے ساتھ اپنی بات چیت یاد ہے۔ ان کے اہل خانہ اور مداحوں سے تعزیت۔ 'اوم شانتی' پنڈت شرما کے انتقال پر غم کا اظہار کرتے ہوئے لوک سبھا کے اسپیکر اوم برلا نے کہا کہ انھوں نے دنیا کو ہندوستان کی شاندار ثقافت اور شاندار روایت سے روشناس کرایا۔ سنتور کو عالمی سطح پر مقبول بنانے کا سہرا موسیقار پنڈت شرما کے سر جاتا ہے۔ نائب صدر ایم وینکیا نائیڈو نے نامور سنتور نواز پنڈت شیو کمار شرما کے انتقال پر گہرے غم کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 11 مئی 2022

ڈاکٹر نادر علی خاں

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ریٹائرڈ استاد، اردو کے نامور ادیب، نقاد، مضمون نگار اور اسلامی

اسکالر ڈاکٹر نادر علی خان کا انتقال 24 اپریل کو ہوگیا۔ وہ تقریباً بانوے سال کے تھے اور کچھ دنوں سے بیمار چل رہے تھے۔ ان کی تدفین یونیورسٹی کے قبرستان میں ہوئی اور نماز جنازہ میں ملک بھر سے بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر نادر علی خان اصل میں ضلع باغپت کے تھانہ کھیکڑا کے گاؤں رٹول کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنی تعلیم اے ایم یو سے حاصل کی۔ وہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق استاد تھے۔ اردو صحافت پر غیر معمولی تحقیقی کام کیا، جو نصاب میں بھی شامل ہے۔ وہ تبلیغی جماعت کے سرگرم کارکن تھے۔ ان کے جنازے میں علی گڑھ کے علاوہ ملک کے کئی حصوں سے لوگوں نے شرکت کی۔

اے ایم یو کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر نادر علی خان ایک مخلص استاد تھے، جو اپنے طلبا کے ساتھ علم بانٹنا پسند کرتے تھے۔ ان کی وفات یونیورسٹی کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد علی جوہر نے کہا کہ ڈاکٹر نادر نے ثابت قدمی کے ساتھ طلبا، ریسرچ اسکالرز اور نوجوان ساتھیوں کی رہنمائی کی۔ قابل ذکر ہے

کہ ڈاکٹر نادر ایک مشہور ادیب تھے۔ اردو صحافت کی تاریخ پر ان کی کتابیں قابل تعریف ہیں۔ اردو لسانیات کا المیہ بھی ان کی غیر معمولی کتاب ہے۔ ان کی تحریروں کو مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

بحوالہ: قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 25 اپریل 2022

ممتاز راشد

ممبئی: عروس البلاد میں دور جدید میں ایک امتیازی شناخت کے حامل اردو کے مقبول شاعر (78 سالہ) ممتاز راشد 23 اپریل کو انتقال کر گئے۔

ممتاز راشد 1944 میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق اجمیر راجستھان سے تھا۔ وہ 1967 میں ممبئی آئے اور وہیں بھنڈی بازار میں قیام رہا۔ چند برس پہلے جب غزل گائیکی کا زریں دور شروع ہوا جب پنکج ادھاس، جگجیت سنگھ، راج کمار رضوی جیسے گلوکاروں کو خوب شہرت ملی، اسی دور میں ممتاز راشد کی غزلیں بھی انھی غزل گائیکوں کے ذریعے عام ہوئیں۔ ممتاز راشد کا یہ شعر تو

کوئی تحریر مٹائیں تو دھواں اٹھتا ہے
دل وہ بھیگا ہوا کاغذ ہے کہ جلتا ہی نہیں

بہت دور تک سفر کرتا ہوا پہنچا۔ ممتاز راشد کے اولین شعری مجموعے کا نام 'بھیگا ہوا کاغذ' اسی شعر سے ماخوذ ہے جو 1978 میں طبع ہوا تھا۔ کوئی دو دہے بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ 'خدا باقی رہے' شائع ہوا۔ ممتاز راشد کا یہ شعر بھی لوگوں کی یادداشت میں ہے۔

میں وہ مٹی ہوں جو ہے چاک کی گردش میں اسیر
تو اگر ہاتھ لگا دے تو سنور جاؤں گا

ممتاز راشد کے یہاں شعری غنا اپنے پورے حسن کے ساتھ متوجہ کرتا ہے۔

ممتاز راشد کو بزرگان دین سے بڑی عقیدت تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ ان کا اس دیار سے تعلق تھا جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے نسبت رکھتا ہے۔ وہ ماہم میں حضرت مخدوم ماہمی کی درگاہ کے احاطے میں ایک طویل مدت تک مقیم رہے پھر وہ یہاں سے اٹھا مغربی مضافات ممبئی کے متمول علاقے لوکھنڈ والا اندھیری چلے گئے اور وہیں سے ان کا جسد خاکی 4 بنگلہ قبرستان لے جایا گیا۔ ندیم صدیقی (ممبئی) کی تحریر سے ماخوذ

رحمت اللہ فاروقی

دھلی: روزنامہ 'قومی آواز' کے سابق سب ایڈیٹر مولانا رحمت اللہ فاروقی کا 12 مئی کی رات کو اچانک حرکت

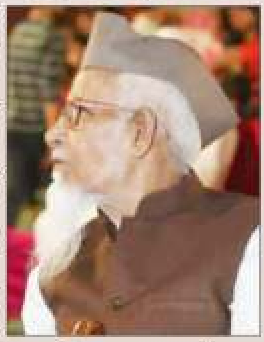

قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 71 سال تھی۔ دو ماہ قبل ان کی اہلیہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملی تھیں۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور تین بیٹیوں کے علاوہ سیکڑوں شاگرد ہیں جنھیں انھوں نے اردو، عربی اور فارسی کی مفت تعلیم سے آراستہ کیا۔ ان کی پیدائش 23 اپریل 1953 کو بہار کے سمستی پور ضلع میں ہوئی تھی۔ لیکن ان کی تعلیم و تربیت اتر پردیش کے مختلف درس گاہوں میں ہوئی۔ 1968 میں دہلی آکر انھوں نے مدرسہ عالیہ فتح پوری میں داخلہ لیا۔ 1970 میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم، اور ادیب فاضل کے علاوہ فارسی کے اعلی ترین امتحان، منشی فاضل میں کامیاب ہوئے اور کئی دیگر طلبا کو بھی اردو اور فارسی کے امتحانات میں کامیابی دلائی۔ دہلی کے مدرسہ امینیہ سے فراغت کے بعد 1978 میں وہ روزنامہ 'الجمعیۃ' کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے جہاں انھیں ممتاز صحافی ناز انصاری کی سرپرستی میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ ناز انصاری مرحوم کہا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں مولانا فاروقی جیسا شریف النفس اور باریک بیں انسان نہیں دیکھا۔ انھوں نے 1982 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور انگریزی سے بہترین اردو ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ 1987 میں انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور قاضی سجاد حسین کے معاون رہے۔ اسی سال انھوں نے روزنامہ 'قومی آواز' میں بطور سینئر سب ایڈیٹر کام شروع کیا اور 2008 میں قومی آواز بند ہونے تک اس کے دیانت دار کارکنوں میں شامل رہے۔ مولانا فاروقی نے 2010 میں معصوم مرادآبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ 'جدید خبر' میں شمولیت اختیار کی اور کئی برس نیوز ایڈیٹر کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ دونوں وسیع تھا۔ ان کی زندگی حصول تعلیم اور درس و تدریس سے عبارت تھی۔

بشکریہ معصوم مرادآبادی، 13 مئی 2022

عبدالصمد

ارریا: معروف ادیب، صحافی اور نقاد حقانی القاسمی کے والد محترم عبدالصمد کا 2 مئی 2022 کو دوپہر کے وقت

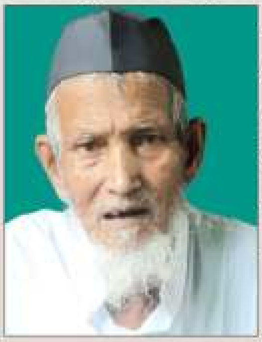

انتقال ہوگیا۔ وہ وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھنے جارہے تھے کہ ان کی روح پرواز کر گئی۔ ان کی عمر تقریباً 91 تھی۔ وہ 4 اکتوبر 1931 کو بگڈہرا اسٹیٹ، جو کی ہاٹ ارریا سابق ضلع پورنیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم محمد خلیل الرحمن اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے۔ انھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ مختلف تدریسی ملازمتوں کے بعد وہ پوسٹل سروسز سے وابستہ ہوئے اور یہیں سے بحیثیت میل اوورسیئر سبکدوش ہوئے۔ وہ نہایت شریف النفس، خلیق اور ملنسار تھے۔ انھوں نے اپنے گاؤں میں غیر سودی بینک، لائبریری کے علاوہ ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کی پوری زندگی تعلیم کے فروغ سے عبارت تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت اردو کتابوں اور اخبارات کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ انھوں نے ارریا میں 'الکتاب' کے نام سے ایک دوکان بھی کھولی تھی جو ادیبوں کے لیے ایک بہترین اڈہ ثابت ہوئی۔ ارریا کے ادبا، شعرا اور صحافی کا وہ مرکز بن گئی تھی۔ عبدالصمد صاحب جماعت اسلامی کے ہمدرد تھے اور جماعت اسلامی سے شائع ہونے والے کتابوں اور رسائل خاص طور پر 'دعوت' کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

ان کے پسماندگان میں چھ بیٹے (حقانی القاسمی، عبدالاحد، ڈاکٹر عبدالرب فلاحی، عبدالرحمن فلاحی، عبدالرحیم نازش فلاحی، عبداللہ مالکی مجروح کے علاوہ دو بیٹیاں (بی بی کلثوم اور مریم فلاحی) ہیں۔ مرحوم کی تدفین بروز عید 3 مئی کو بعد نماز ظہر صالحات نگر گگڑوا بستی ارریا میں واقع قبرستان میں ہوئی۔ جنازے میں عمائدین شہر کے علاوہ مختلف گاؤں کے افراد کی کافی بھیڑ تھی۔ ان کی یاد میں 7 مئی کو جماعت اسلامی ہند شاخ ارریا کے زیر اہتمام کلیۃ الصالحات میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مرحوم عبدالصمد کی خدمات کو عمائدین شہر نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ماسٹر محمد محسن، محمد مقصود عالم (امیر مقامی جماعت اسلامی ہند ارریا)، ڈاکٹر ضیاء الرحمن مدنی (کیرالہ)، پروفیسر ممتاز عالم (جامعہ ملیہ اسلامیہ)،

طارق بن ثاقب، سید شمیم انور، ماسٹر قمرالدین، شکیب ارسلان، مولوی افروز عالم، ارشد انور الف، ڈاکٹر ہمایوں اختر، شبلی ارسلان، ماسٹر حبیب، مولانا مبین الحق، مولانا انعام الحق، ماسٹر منظر، ماسٹر محمد غالب (بگڈ ہرا/ارریا)، محمد اقبال کے علاوہ ان کے بیٹوں میں ڈاکٹر عبدالرب فلاحی، حقانی القاسمی، عبدالرحمٰن فلاحی، عبدالرحیم نازش نے نم آنکھوں سے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'دینک بھاسکر'، 'انقلاب' اور دیگر ذرائع سے 4 مئی 2022

ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی

مبارکپور، اعظم گڑھ: جامعہ اشرفیہ مبارکپور مجلس شوریٰ کے معزز رکن، معروف ادیب و نقاد، شاعر و مصنف، محقق اور ماہنامہ ماہ نور دہلی کے سابق مشیر اعلیٰ، ماہنامہ کنز الایمان کی مجلس مشاورت کے علمی رکن پروفیسر علامہ الحاج ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی 30 اپریل کی شب میں اپنے مالک حقیقی سے

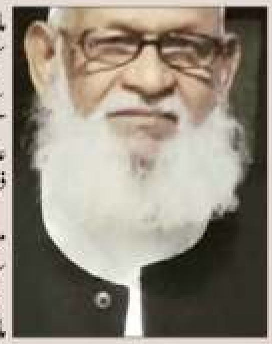

جاملے۔ ان کے انتقال سے ادبی حلقے کی فضا سوگوار ہوگئی۔ انھوں نے دہلی کے فورٹ اسکارٹ ہسپتال میں آخری سانس لی۔ وہاں وہ تقریباً ایک ہفتے سے زیر علاج تھے۔ علامہ شرر مصباحی معروف علمی قصبہ مبارکپور کے محلہ کٹرہ سے وطنی تعلق رکھتے تھے۔ اور طبی و علمی خدمات کے لیے وہ زیادہ تر دہلی میں ہی قیام پذیر ہوتے تھے۔ ادھر کئی ماہ سے وہ مبارکپور میں رہ کر اپنی متعدد مطبوعہ تصانیف کو آخری شکل دینے میں مصروف تھے۔ مرحوم کے اسلوب نقد، علم وفن، اصول و قواعد اور زبان و ادب پر عبور کا ایک زمانہ قائل ہے، وہ ایک عظیم ناقد و فنکار و تذکرہ نگار ہونے کے ساتھ زبردست تخلیقی قوت کے مالک شاعر بھی تھے، ان کی شاعری میں استادانہ رنگ ہے۔ انھوں نے متعدد نہایت شاہکار غزلیں، نعتیں اور حمد و منقبت وغیرہ کہی ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کی بنیاد سے ان کا تعلق تھا اور 1972 میں اشرفیہ کی جو پہلی 11 رکنی دستوری کمیٹی بنائی گئی تھی، اس کے وہ خاص رکن ہونے کے ساتھ ہی بانی جامعہ حافظ ملت کے مشیر خاص بھی تھے۔ زندگی کی آخری سانس تک مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ وہ دینی وعصری تعلیم کا سنگم تھے۔ جہاں ایک جید اسلامی اسکالر اور نقاد تھے، تو میڈیکل شعبے میں اپنی خدمات سے نہ صرف شہرت حاصل کی بلکہ حکومت ہند کے منظور نظر بن گئے۔ انھوں نے سرکاری ملازمت حکومت اتر پردیش سے شروع کی تھی، لیکن ان کی مہارت دیکھ کر مرکزی حکومت نے انھیں طلب کرلیا۔ سابق مرکزی وزیر رام ولاس پاسوان اور دہلی کی سابق وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کے ذریعے انھیں ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جاچکا ہے۔ طبیہ کالج سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی طب یونانی اور آیورویدکے فروغ کے لیے حکومت ہند مسلسل ان سے خدمات لیتی رہی۔ فی الحال وہ دہلی میں دین دیال اپادھیائے ہسپتال اور رام منوہر لوہیا میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان محلہ کٹرہ میں ہوئی۔ پسماندگان میں دو بیٹیوں سمیت چار بیٹے ہیں۔ اس موقعے پر متعدد شخصیات نے تعزیت پیش کرکے اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2022

خراج عقیدت

ہارون رشید غافل

اردیا: شان ارریا اور عوامی شاعر ہارون رشید غافل کے یوم پیدائش پر ان کے آبائی گاؤں گیاری میں ادارہ فیض

ادب کے تحت ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت ستیندر ناتھ شرن نے کی اور نظامت کے فرائض معروف صحافی قمر معصوم نے انجام دیے۔ تقریب میں مہمان کے طور پر ادیب و ناقد حقانی القاسمی، ممتاز صحافی پرویز عالم، سماجی کاموں سے جڑے دیپک داس، ضلع پتر کار سنگھ کے سکریٹری امت امن، نوجوان لیڈر محتشم اختر اور ارشد انور الف موجود تھے۔ اس موقعے پر بگڈ ہرا کے رہنے والے اور دہلی میں مقیم حقانی القاسمی نے کہا کہ غافل صاحب سے میرا بہت گہرا لگاؤ تھا۔ غافل صاحب نے ہی میرا رشتہ ارریا سے جوڑا۔ میں نے 'رینو کے شہر میں' نامی ایک کتاب لکھی جو غافل صاحب کو بہت پسند تھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہارون رشید غافل صرف سیمانچل میں ہی مشہور نہیں تھے بلکہ وہ قومی سطح پر جانے جاتے تھے۔ وہ ایک اچھے صحافی، وکیل اور بہترین اسٹیج اناؤنسر تھے اور انھیں بہت سارے ایوارڈز بھی ملے تھے۔ حقانی القاسمی نے کلہیا زبان میں کی گئی ان کی شاعری پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ علاقائی کلہیا زبان میں کی گئی ان کی شاعری میں نغمگی اور موسیقیت کے ساتھ مقصدیت بھی تھی۔ ضلع پتر کار سنگھ کے سکریٹری امت کمار امن نے کہا کہ غافل صاحب کے بارے میں کیا کہوں، انھوں نے ادب کو نئی پہچان دی۔ انھوں نے اناؤنسر کے روپ میں شاندار ریکارڈ بنایا۔ ستیندر ناتھ شرن نے کہا کہ ایسا لگ رہا ہے کہ آج بھی غافل ہمارے بیچ ہیں۔ بچپن سے دیکھا تھا، ان سے ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ غافل صاحب کی یادیں ہم سب میں زندہ ہیں۔ ان کی کمی کو کوئی پورا نہیں کرسکتا۔ ممتاز صحافی پرویز عالم نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہارون رشید غافل نے اپنی شاعری کے ذریعے کلہیا زبان کو ایک الگ پہچان دی تھی۔ آج بھی ان کی شاعری کی دھوم ہے۔ ان کے صاحب زادے مامون رشید نے اس موقعے پر تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور اپنے والد کے تعلق سے اپنے احساسات و جذبات بیان کیے۔ اس موقعے پر مقررین نے ضلع انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ ہارون رشید غافل کے نام پر 'غافل میموریل ایوارڈ' شروع کیا جانا چاہیے کیونکہ رینو کے بعد وہ ارریہ کی پہچان تھے۔ اس تقریب میں ارشد انور الف، مولانا مصور چترویدی، محتشم اختر، سرفراز عالم، وثیق الرحمٰن، شافع الہدیٰ راہی، محمد مکرم اور ڈاکٹر عبدالرب فلاحی وغیرہ نے بھی ہارون رشید غافل کو خراج تحسین پیش کیا اور ان کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'دینک بھاسکر'، مئی 2022، عبدالغنی 'انقلاب' اور دیگر ذرائع سے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

خسرو شناسی

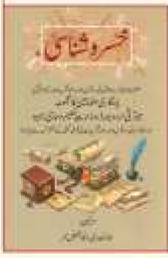

مرتبین: ظ انصاری، ابوالفیض سحر

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 347

قیمت 180 روپے

قطب مشتری

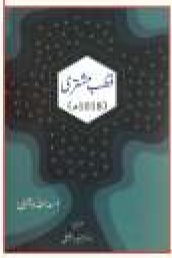

مرتبہ: ڈاکٹر حمیرا جلیلی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 247

قیمت: 130 روپے

صارفیت اور صارفین کو قانونی تحفظ مع نظائر عدالت

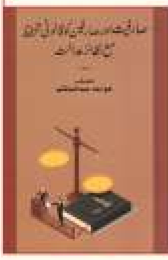

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 138

قیمت: 90 روپے

کشف الاعداد

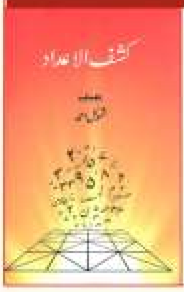

مصنف: شموئل احمد

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 190

قیمت: 110 روپے

علم البیان: اقسام نثر و نظم

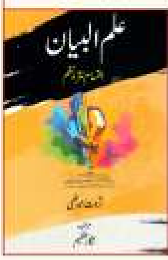

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

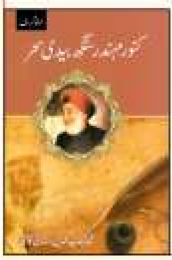

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

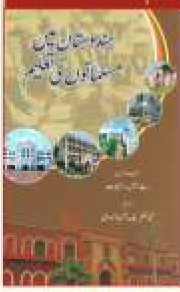

ترتیب وتدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जून-२०२२,वर्ष:२४, अंक:६
URDU DUNIYA Monthly, June-2022, Vol.24, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2022
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6